قومی سوال نمبر

7/8

پاکستان میں قومی مسئلہ کے اقتصادی و سماجی پہلو

کنفیڈریشن کیوں - ایک تجزیہ

قومی سوال پر محنت کشوں کا موقف

فلسفہ

سیاسی معاشیات

تاریخ

سوشیالوجی

نفسیات

ادب

قومی سوال نمبر

مجموعہ نمبر ۸-۷

ریسرچ فورم پبلی کیشنز

پوسٹ آفس بکس ۲۵۱۱

کراچی نمبر ۵

ناشر :- ریسرچ فورم پبلی کیشنز

کراچی

تقسیم کار :- مکتبۂ دانیال

وکٹوریہ چیمبرز-۲ عبداللہ ہارون روڈ

کراچی

مطبع :- احمد برادرز پریس کراچی

طبع اوّل :- دسمبر ۱۹۸۸ء

قیمت :- ۲۰ روپے

فہرست

پاکستان میں قومی مسئلہ کے اقتصادی و سماجی پہلو

گ۔ ترِوتینکو

اگست ۱۹۴۷ء میں معرضِ وجود میں آنے کے بعد سے اب تک قومی سوال کا حل نہ ہونا اور اس کے نتیجے میں فروغ پانے والی قومی تحریکیں پاکستان کی اندرونی سیاسی صورتحال پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔

ایک کثیر القومی ریاست کی حیثیت سے پاکستان کے مختلف حصوں اور ان کی آبادی کی معاشی و سماجی ترقی اور سیاسی ارتقاء ایک دوسرے سے کافی مختلف تھے اور مختلف لسانی گروہوں سے تعلق رکھنے والے استحصالی طبقوں کے مابین مخصوص حد تک اختلافات اور تضادات موجود تھے۔

قیامِ پاکستان کے وقت سے ملک میں عنانِ اقتدار مسلم لیگی قیادت کے ہاتھوں میں آئی جو پنجاب کے جاگیرداروں، بڑے سرمایہ داروں اور ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے چند امیر مسلم گھرانوں کی نمائندگی کرتی تھی۔

پاکستان کے حکمران حلقوں کی کوشش تھی کہ انکو اقتدار دلانے والی سماجی قوتوں کو ملک کی معاشی اور سیاسی زندگی کے تمام شعبوں میں غلبہ ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے امیر طبقوں کی سرمایہ کاری کے گڑھ کراچی اور پنجاب کی ترقی کے لئے انتہائی کوششیں کیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے دوسرے صوبوں کے سیاسی ارتقاء کو مصنوعی طریقے سے روک دیا جن میں سندھ (کراچی کے علاوہ) صوبہ سرحد اور

بلوچستان شامل ہیں۔ انہیں عملی طور پر پنجاب اور کراچی کو خام مال فراہم کرنے والی
نیم نو آبادیوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا ۔

چھوٹے صوبوں سے سوتیلے پن کا یہ سلوک آزادی کے بعد کے تمام سالوں میں
جاری رہا۔ ان صوبوں کے عوام اور قومی بورژوازی کے حقوق و مفادات پر ڈاکے کی
پالیسی کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پنجابیوں، بھارت سے آئے ہوئے مہاجروں اور سندھیوں
پشتونوں اور بلوچوں کے درمیان نفرت کو فروغ ملا اور ملک میں مختلف قسم کے رجحانات
مثلاً پنجابی شاونزم، اُن کے اتحادیوں یعنی مہاجروں کے لئے مخصوص جگہ کا مسئلہ وغیرہ
ابھرے ۔ اس کے ردعمل کے طور پر سندھیوں، پشتونوں اور بلوچوں میں شدید قسم
کی قوم پرستی اُبھری، ان لسانی گروہوں کے بالائی اور درمیانی طبقوں نے ملک میں
معاشی و سماجی اور سیاسی طاقت کی از سر نو تقسیم کے مطالبے بلند کرنے شروع کر دیئے۔

پنجاب کے جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور بڑی مہاجر بورژوازی کے غلبے کو مضبوط
کرنے کی حکومتی پالیسی پاکستان میں قومی سوال پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والا
عنصر تھا۔ جس کے نتیجہ میں آزادی کے وقت ملک کے مختلف حصوں کے درمیان موجود
سماجی و معاشی خلیج میں کمی کی بجائے مزید اضافہ ہوا۔

مثلاً اگر ۱۹۵۹ء میں صوبہ سرحد اور بلوچستان میں فی کس آمدنی پاکستان
کی اوسط فی کس آمدنی کا بالترتیب ۵۲ اور ۸۲ فیصد تھی اور پنجاب اور سندھ میں ۱۰۲
اور ۱۴۱ فیصد تھی تو ۷۰۔ ۱۹۶۹ء صوبہ سرحد اور بلوچستان میں یہ شرح گھٹ کر بالترتیب
۴۹ اور ۶۹ فیصد رہ گئی اور پنجاب اور سندھ میں ۹۹ اور ۱۴۸ فیصد تک چلی گئی۔ اگرچہ
آئندہ پانچ سات سالوں کے دوران ۷۷۔ ۱۹۷۱ء میں بھٹو کی سول حکومت کی معاشی
و سماجی پالیسی اور ملک کے وفاقی ڈھانچے کی بحالی کی بدولت ملک کے مختلف حصوں
میں فرق کچھ کم ہوا پھر بھی یہ فرق خاصا گہرا ہے ۔

پاکستان کے حکمرانوں نے پسماندہ علاقوں کو ترقی دینے اور ان کو ملک کے ترقی یافتہ حصوں کے برابر لانے کی کبھی بھی کوشش نہیں کی۔ اسکا واضح ثبوت انکا بجٹ سسٹم معاشی وسماجی ترقی کے منصوبے، بنک کریڈیٹ اور سرمایہ کاری کی پالیسیاں ہیں۔

پاکستان میں معاشی وسماجی ترقی کو کنٹرول کرنے کا سب سے بڑا آلہ ملک کا بجٹ سسٹم ہے جس میں معاشی عمل کے بنیادی جزو ٹیکس اور اخراجات کی تقسیم شامل ہیں۔ پاکستان میں رائج بجٹ سسٹم کی خصوصیت آمدنی کی ضرورت سے زیادہ مرکزیت اور وفاقی اکائیوں کا مرکز کے مصارفات پر انحصار ہے۔ پاکستان کے حکمرانوں نے، اپنے طبقات اور ان کے علاقوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے بجٹ سسٹم کو ہر طرح سے استعمال کیا۔ مگر یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ ملک کے بجٹ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے ٹیکسوں اور اخراجات کی منصفانہ تقسیم کے چھوٹے صوبوں کے عوام کی سیاسی جدوجہد کے نتیجے میں اس میں کچھ تبدیلیاں بھی ہوئیں۔ مثلاً مرکز اور صوبوں کے درمیان انکم ٹیکس، کپاس کی فروخت اور برآمدات پر ٹیکس کی تقسیم کے نظام میں کافی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ کئی ٹیکسوں سے حاصل شدہ آمدنی میں صوبوں کا حصہ ۱۹۵۱ء میں ۵۰ فیصد سے بڑھکر ۱۹۷۱ء میں ۸۰ فیصد تک جا پہنچا اور ۱۹۷۵ء میں ٹیکسوں کی آمدنی کو صوبوں کی آبادی کے لحاظ سے تقسیم کرنیکا نظام رائج کیا گیا۔ بظاہر یہ نظام منصفانہ نظر آتا ہے مگر اس سے پسماندہ صوبوں کی نسبت پنجاب کو زیادہ فائدہ ہو رہا ہے جس کو آمدنی کا ۶۰ فیصد حصہ مل رہا ہے۔ جبکہ دوسرے تمام صوبوں کو ۴۰ فیصد سے بھی کم حصہ مل رہا ہے۔

ذرائع آمدنی کی تقسیم کے مذکورہ نظام سے صورتحال کی صحیح تصویر سامنے نہیں آتی۔ کیونکہ اس نظام کے تحت آمدنی کا صرف نصف حصہ آتا ہے جبکہ کسٹم ڈیوٹی اور ایکسائز ٹیکس کے ذریعے مرکز کو ٹیکسوں کی کل آمدنی کا نصف سے زیادہ حصہ حاصل ہوتا تھا۔ مذکورہ تمام آمدنی پر مرکز کا قبضہ ہوتا تھا اور یہ صوبوں میں تقسیم سے مستثنیٰ تھی۔

مرکز کے مقابلے میں صوبوں کو ٹیکس کی آمدنی خاصی کم تھی اور ترقی کے لئے صوبوں کے اپنے وسائل ناکافی تھے۔ صوبوں کے بجٹ اور معاشی و سماجی ترقی کے پروگرام کا انحصار کلی طور پر مرکز کے مصارفات پر تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صوباتی حکومتوں کے بجٹ کا انحصار مرکز کی مختص کردہ رقوم پر بڑھتا گیا اور صوبوں کی مالی خودمختاری کم ہوتی چلی گئی۔

مثلاً اگر ۵۰-۱۹۴۹ء میں صوبائی بجٹوں میں مرکز کی مختص کردہ رقم اور صوبوں کی آمدنی کا تناسب ۴۰ر فیصد تھا تو ۷۰-۱۹۶۹ء میں یہ تناسب ۵۰،۴ فیصد اور ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۵۴،۱۲ فیصد تک چلا گیا تھا۔ صوبوں کی مالی خودمختاری کی کمزوری میں اضافے کے باوجود مرکز اور صوبوں میں آمدنی کی تقسیم کے نظام میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

مختلف صوبوں کی ترقی کے متعلق حکمرانوں کی جانبدارانہ پالیسی کا اظہار ترقی کے لئے مختص کردہ رقوم کے علاوہ سالانہ ترقیاتی پروگراموں کے لئے مختلف صوبوں کو دی گئی رقوم سے بھی ہوتا رہا ہے۔ ۱۹۷۹ء میں شروع ہونے والے یہ پروگرام سماجی و معاشی ترقی کے تمام شعبوں، صنعت، زراعت، مواصلات، رسل و رسائل، بجلی پیدا کرنے کے آبی وسائل، صحت، تعلیم اور رہائشی تعمیر پر محیط تھے۔

اگر ہم ۸۴-۱۹۷۲ء کے سالوں میں پاکستان اور اس کے صوبوں کی سماجی و معاشی ترقی پر ہونے والے اخراجات کا تجزیہ کریں تو بڑی متضاد تصویر سامنے آتی ہے۔ صوبوں کی سماجی و معاشی ترقی پر ہونے والے اخراجات کی شرح کچھ اس طرح تھی۔ پنجاب ۵۲،۶۰ فیصد، سندھ ۲۱،۷ فیصد، صوبہ سرحد ۱۶،۱ فیصد اور بلوچستان ۸،۶ فیصد ان اعداد و شمار سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پسماندہ صوبوں کو منصفانہ طریقے سے ان کی آبادی کے لحاظ سے حصہ ملا ہے اور بلوچستان کو اس کی آبادی سے دوگنا حصہ ملا ہے۔

مگر ٹیکسوں سے حاصل شدہ آمدنی کی طرح اس سے بھی تصویر کا صحیح رُخ سامنے نہیں آتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صوبوں کی سماجی و معاشی ترقی کے لئے ریاست کے مختص کردہ اخراجات کا کم حصہ یعنی ۲۲٫۹ فیصد رکھا گیا جبکہ زیادہ حصہ یعنی ۷۷٫۱ فیصد مرکز نے اپنے کنٹرول کے تحت رکھا۔ اس لیے صوبوں کی مساوی اور تیز سماجی و معاشی ترقی کا سلسلہ کافی حد تک متنازع صورت اختیار کر گیا۔ کیونکہ حکومت کی پالیسی میں ہمیشہ پنجاب اور کراچی کو ترجیح دی گئی ہے۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کے سالانہ ترقیاتی پروگراموں کا بڑا حصہ بھی مرکز کی طرف سے فراہم ہوتا ہے کیونکہ یہ صوبے مستقلاً وسائل کی کمی کا شکار رہے ہیں ملک کے مختلف صوبوں کے درمیان نابرابری اور ان کے ساتھ ترجیحی سلوک کا اطلاق ملکی معیشت کے بنیادی شعبوں مثلاً صنعت، زراعت وغیرہ پر بھی ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل گوشوارہ ملاحظہ فرمائیں۔

ملک کی معاشی قوت میں صوبوں کی شراکت (۱۹۷۲ء)

ملک کی معاشی قوت کی صوبوں میں تقسیم (۱۹۷۲ء)

	کل پاکستان	بلوچستان	صوبہ سرحد	سندھ بمع کراچی	پنجاب
آبادی ملین میں	64.7	2.4	10.8	14.0	37.5
کل آبادی کی شرح	100.0%	3.7%	16.7%	21.6%	58.0%
اندرونی GNP (اربوں میں)	489 ارب روپے	1.3	6.2	11.2	29.9
فی کس آمدنی (روپے)	756	541	602	788	797
اناج کی پیداوار ملین میں	11.6	0.2	1.2	2.4	7.8
شرح (فیصد میں)	100.0%	1.7%	10.3%	20.7%	67.2%
صنعتی پیداوار کی مالیت (ارب روپے)	5.8	0.2	0.3	1.5	3.8
شرح (فیصد میں)	100.0%	3.4%	5.2%	25.9%	65.5%

صنعتی پیداوار کی ترقی کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ صنعتوں کی تقسیم اور اُن میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد پاکستان کے مختلف صوبوں میں مختلف تھی۔ پاکستان کی صنعتی پیداوار میں ساتویں دہائی کے دوران مختلف صوبوں کا حصہ مندرجہ ذیل تھا: پنجاب ۴۹ء۶ فیصد، سندھ (بشمول کراچی) — ۴۰ء۴ فیصد، صوبہ سرحد — ۹ء۳ فیصد، بلوچستان — ۰ء۷ فیصد۔ جہاں تک ان صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور صنعتی پیداوار کی مالیت کا تعلق ہے تو صوبوں کے درمیان انکی تقسیم کچھ اس طرح تھی۔ پنجاب میں مزدور ۶ء۵۱ فیصد اور صنعتی پیداوار ۵ء۴۷ فیصد، سندھ میں ۹ء۴۱ فیصد اور ۲ء۴۴ فیصد، صوبہ سرحد میں ۴ء۷ فیصد اور ۸ء۰ فیصد اور بلوچستان میں ۰ء۵ فیصد اور ۳ء۰ فیصد تھی۔

علاقائی لحاظ سے پاکستان کی غیر مساویانہ ترقی کی وجہ سے جدید صنعتوں کا ارتکاز بنیادی طور پر پنجاب (۲ء۵۷ فیصد) اور سندھ (۶ء۳۹ فیصد) میں ہوا۔ ان دو صوبوں میں ملکی صنعت کا ۹۷ فیصد حصہ لگا ہوا تھا۔ جبکہ دوسرے صوبوں میں جنکا رقبہ پاکستان کے آدھے رقبے کے برابر تھا اور آبادی کل ملکی آبادی کا پانچواں حصہ تھی، کل صنعتی یونٹوں کا صرف ۳ فیصد قائم تھا۔

۱۹۵۲ء میں پاکستان انڈسٹریل ڈیویلپمنٹ کارپوریشن کا قیام سرمایہ داروں کو بہت زیادہ سرمایہ کی کھپت والی، قومی اہمیت کی حامل صنعتوں کے قیام کی طرف مائل کرنے کے لئے عمل میں آیا تھا۔ جن میں وہ کم دلچسپی رکھتے تھے۔ مگر اپنے قیام کے بعد کے ۲۰ سالوں میں مذکورہ کارپوریشن نے ملک کے مختلف صوبوں میں سرمایہ کی تقسیم کچھ اس طرح سے کی:۔ پنجاب - ۵۹ فیصد، سندھ (بشمول کراچی) - ۲۵ء۲۷ فیصد، صوبہ سرحد - ۶ء۱ فیصد، بلوچستان - ۶۵ء۷ فیصد۔

شعبہ کریڈٹ اور نجی شعبوں کو قرضوں کے معاملے میں بھی تقریباً یہی صورتحال

تھی۔ انڈسٹریل ڈویلپمنٹ بینک کی ۱۴ سالہ کارروائی کو ہی دیکھ لیجئے جو ۱۹۶۱ء میں
پرائیویٹ سیکٹر کو نئی فیکٹریوں کی تعمیر اور پرانی فیکٹریوں کو جدید بنانے میں مدد دینے کے
لئے قائم کیا گیا تھا۔ بینک نے مختلف صوبوں میں اپنے قرضوں کی تقسیم کچھ اس طرح سے کی
پنجاب ۔ ۸۳، ۴۲ فیصد، سندھ (بشمول کراچی) ۔ ۵۰، ۴۷ فیصد، صوبہ سرحد ۔ ۱۱، ۹
فیصد، بلوچستان ۔ ۵۶، ۰ فیصد۔ اسطرح دو صوبوں پنجاب اور سندھ (صرف کراچی
کی حد تک) کو مجموعی طور پر قرضوں کا ۹۰ فیصد ملا، صوبہ سرحد اور بلوچستان کو جو کہ پسماندہ
تھے، قرضوں کا صرف ۱۰ فیصد ملا۔

بینکوں کے قرضوں کی غیر مساوی تقسیم کی توجیح کے طور پر سرکاری حکام نے یہ عذر
پیش کیا کہ بنک کسی صنعتی یونٹ کے قیام میں مدد کے لئے قرضہ دیتے وقت سب سے پہلے
یہ دیکھتا ہے کہ معاشی طور پر یہ کس حد تک قابلِ عمل ہے اور اس کے بعد پسماندہ علاقوں
کی ترقی کے متعلق سوچا جاتا ہے،

پاکستان کے صوبوں کی سماجی و معاشی ترقی کے مسائل کے تجزیے میں سندھ کی صورتحال
خاصی دلچسپ ہے، جس کے جنوبی حصے یعنی کراچی کی بدولت سندھ میں فی کس آمدنی
بھی تمام صوبوں سے زیادہ ہے اور یہاں کارخانوں کی تعداد اور صنعتی پیداوار کی مالیت
بھی بہت زیادہ ہے۔ یہاں پر سرکاری اور نجی سرمایہ کاری بھی ملک مین سب سے زیادہ
ہوتی ہے۔

پاکستان بننے کے بعد سندھ میں صنعتیں بنیادی طور پر اُسکے جنوبی حصے یعنی کراچی
میں لگیں۔ ساتویں دھائی کے شروع میں اس شہر میں صوبہ سندھ کے ۸، ۷۶ فیصد
صنعتی ادارے، ۰۰، ۷۹ فیصد صنعتی مزدور اور ۰۰، ۷۳ فیصد صنعتی پیداوار مرکوز تھی۔
جبکہ کراچی میں سندھ کی صرف ۲۵ فیصد آبادی رہتی تھی۔ اور اگر کراچی کو سندھ سے
علیحدہ شمار کیا جائے جہاں فی کس آمدنی کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں چار گنا

زیادہ ہے، تو سندھ کا شمار بھی ملک کے پسماندہ ترین علاقوں میں ہوگا۔ اسطرح نہ صرف فی کس آمدنی بلکہ صنعتی ترقی کے اعتبار سے بھی سندھ انتہائی پسماندہ صوبوں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔

اسطرح پاکستان کی صنعتی ترقی کا صرف سطحی جائزہ بھی اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ پاکستان میں صنعتوں کا قیام صرف سندھ کے جنوبی حصے کراچی اور کسی حد تک پنجاب میں ہوا اور جہاں تک صوبہ سرحد اور بلوچستان اور کراچی کے علاوہ باقی صوبہ سندھ کا تعلق ہے تو یہ علاقے آزادی سے قبل کے دور کی طرح صنعتی لحاظ سے پسماندہ ہی ہیں۔ اگر یہاں صنعتیں لگائی بھی گئیں تو اس میں مہاجر اور پنجابی سرمایہ داروں کا اوّلین مقصد مقامی خام مال اور سستی محنت کو استعمال کر کے زیادہ سے زیادہ منافع کمانا تھا۔ اس طرح صنعت کاری کا پھل مقامی آبادی کی بجائے پنجاب یا کراچی کو ملا۔ اس کی واضح مثال بلوچستان میں سوئی کے مقام پر قدرتی گیس کی دریافت ہے۔

پاکستان کے معیشت دان تینوں صوبوں کی صنعتی پسماندگی کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ پنجاب اور کراچی کے برعکس ان علاقوں میں انفراسٹریکچر کمزور تھا اور یہاں پیشہ وارانہ تیکنیکی مہارت کے حامل افراد کی کمی تھی۔ اس میں کسی حد تک صداقت بھی ہے مگر انفراسٹریکچر کی کمزوری اور ماہرین کی عدم موجودگی سماجی و معاشی پسماندگی کی بدولت نہیں بلکہ صنعتی پسماندگی کا نتیجہ تھی، یعنی ان عناصر کی عدم موجودگی سے صنعتی پسماندگی بند نہیں ہوئی تھی بلکہ صنعتی پسماندگی ہی ان دو عناصر کے پیدا ہونے کا سبب بنی۔

پاکستان کے مختلف وفاقی یونٹوں کے درمیان معاشی ترقی کا فرق صرف صنعتی شعبے تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ زرعی شعبے میں ایسی ہی حالت تھی۔ اس امر کی اہمیت مزید اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ زراعت پاکستان کی معیشت میں کلیدی کردار

ادا کرتی ہے ۔ ملک کی سرگرم آبادی کا ۶۰ فیصد حصّہ زراعت میں کھپا ہوا ہے اور ابھی ملک کی مجموعی قومی پیداوار (GNP) کا ۳۰ فیصد زرعی شعبے سے حاصل ہوتا ہے ۔

صنعتی شعبے کی مانند زراعت میں بھی مختلف صوبوں کے درمیان ترقی کی سطح کا فرق دن بدن کم ہونے کی بجائے بڑھتا چلا گیا ۔ اگر ہم ۷۰ ۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں زراعت کی فی کس آمدنی کا تجزیہ کریں تو اس دوران پنجاب میں ۱۰۶،۲ پوائنٹ سے بڑھ کر ۱۰۹،۲ پوائنٹ ، سرحد میں ۸۰،۲۲ سے گھٹ کر ۶۷،۳۴ پوائنٹ ، بلوچستان میں ۶۲،۱۳ سے ۵۶،۹۴ پوائنٹ رہ گیا ہے ۔ صرف سندھ میں صورتحال بہتر رہی ۔ جہاں ۱۹۶۰ء میں ۹۷،۴۶ پوائنٹ کے مقابلے میں ۱۹۷۰ء میں ۱۰۱،۰۰ پوائنٹ تک جا پہنچی اور اس کی سطح پاکستان کے اوسط معیار تک پہنچ گئی ۔ اس کی وجہ سندھ کی زرخیز زمینوں پر پنجابیوں اور مہاجروں کی آبادکاری تھی ۔ اس لئے بنیادی طور پر سندھ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ۔

اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ پنجاب اور کسی حد تک سندھ میں زیر کاشت رقبہ خاصا زیادہ تھا ۔ مثلاً پنجاب میں پاکستان کے کل قابلِ کاشت رقبے کا ۵۸،۷ فیصد سندھ میں ۲۸،۴ فیصد ، صوبہ سرحد میں ۶،۶ فیصد اور بلوچستان میں ۶،۳ فیصد حصّہ واقع تھا ۔ اس کے علاوہ پنجاب میں زیر آبپاشی زمینوں کے کل رقبے کا ۷۲ فیصد سندھ میں ۵۷ فیصد ، صوبہ سرحد میں ۳۸ فیصد اور بلوچستان میں ۲۱ فیصد واقع تھا ۔ اس کے ساتھ ہی پنجاب اور سندھ میں جدید زرعی تکنیک اور منفعت بخش فصلوں کی کاشت کی جاتی تھی اور پنجاب اور سندھ کی زراعت میں سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کی ترقی کے زیادہ مواقع تھے جبکہ سرحد اور بلوچستان میں جاگیرداری اور قبائلی باقیات کی وجہ سے ایسے مواقع خاصے محدود تھے ۔

پاکستان کے چاروں صوبوں میں زراعت کی ترقی اور اس کے امکانات کو اعداد

وشمار کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان اعداد وشمار کے مطابق تین صوبوں سندھ، سرحد اور بلوچستان کا رقبہ پاکستان کے کل رقبہ کا ۷۵ فیصد ہے اور آبادی کل آبادی کا ۴۰ فیصد سے زائد ہے۔ مگر ان صوبوں کو پاکستان میں استعمال شدہ کیمیاوی کھادوں کا ۲۲ فیصد حصہ اور ان میں ٹریکٹروں کی کل تعداد کا صرف ۱۷ فیصد اور ٹیوب ویلوں کا ۱۹ فیصد حصہ موجود تھا۔ حالانکہ آب وہوا، قدرتی حالات اور ارضیاتی تشکیل کے لحاظ سے ان صوبوں کی زمین کو ان چیزوں کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

زرعی تیکنیک کی پسماندگی اور زمینی ملکیت کی دقیانوسی شکلوں کے باعث مذکورہ تینوں صوبوں میں پاکستان کی کل زرعی پیداوار کا ۳۴ فیصد سے بھی کم حصہ پیدا ہوتا تھا۔ جس میں سے سندھ کا ۲۲،۹ فیصد، سرحد کا ۸،۸ فیصد اور بلوچستان کا ۱ فیصد حصہ تھا۔ اسی وجہ سے زرعی اجناس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے۔ ان صوبوں کو (خصوصاً سرحد اور بلوچستان کو) پنجاب پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

زرعی تیکنیک کی پسماندگی کے علاوہ پاکستان کے چھوٹے صوبوں کی زرعی ترقی میں دریائے سندھ اور اس کے معاونین کے پانیوں کی تقسیم بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ جو کہ حکومت کے بنائے ہوئے نظام آبپاشی کے تحت زمینوں کو سیراب کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اعداد وشمار کے مطابق آزادی سے قبل کے سالوں کی طرح ۲۰ سال بعد بھی آبپاشی نہروں کے ذریعے سیراب ہونے والی زمینوں کا تناسب پنجاب میں ۲۰، سندھ میں ۱۵ اور سرحد میں ۱ تھا۔ یعنی (۲۰:۱۰:۱) یہ صورتحال سندھ کے لئے بھی موافق نہیں تھی سرحد اور بلوچستان کا تو ذکر ہی کیا۔ بلوچستان کا تو اعداد وشمار میں ذکر تک نہیں تھا، اس امر کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ اس صوبے میں زمینی پانی کی خاصی بڑی مقدار میں نمک کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس لئے اس

کے پانی کو ٹیوب ویل سسٹم کے ذریعے زرعی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا
دریائے سندھ کے پانی کو نہری نظام کے ذریعے زرعی ترقی کے لیے استعمال کرنے
سے متعلق ایک اور امر قابل ذکر ہے یعنی پانچویں اور چھٹی دہائیوں میں ایوب خان کی زرعی
زمینوں کی تقسیم کی پالیسی۔ اس پالیسی کے تحت سندھی کسانوں کی بہت بڑی تعداد کو
گدو، سکھر، کوٹری کے آبپاشی نظاموں کے تحت آنے والی زمینوں سے بیدخل کر دیا
گیا اور ان زمینوں کو ریٹائرڈ فوجی اور سول افسروں کی ملکیت میں دے دیا گیا
جن کی اکثریت پنجابی یا مہاجر تھی۔ بلوچستان میں بھی یہی پالیسی اپنائی گئی۔ خصوصاً
پٹ فیڈر نہر کے تحت آنے والے علاقے میں
پاکستان کے چاروں صوبوں کے درمیان نا انصافی صرف معاشی میدان تک ہی
محدود نہیں رہی بلکہ سماجی زندگی کی مختلف شعبوں مثلاً ثقافت، تعلیم، صحت، روزگار
سرکاری ملازمتیں، صوبائی اور مرکزی اقتدار کے اداروں میں شرکت وغیرہ میں بھی
اسکا اظہار ہوتا تھا۔

ثقافت اور تعلیم کے بارے میں تحریر کرنے سے پیشتر پاکستانی حکمرانوں کی قومی زبان
اور علاقائی زبانوں کے بارے میں پالیسی کو بیان کرنا ضروری ہے۔ اس پالیسی کا لب لباب
یہ ہے کہ قیام پاکستان سے لیکر اب تک حکمرانوں نے اردو زبان کو زبردستی ٹھونسنے کی پالیسی
پر عمل کیا جو کہ پاکستان کے صرف ۸ فیصد لوگوں (مہاجروں) کی مادری زبان ہے۔ علاقائی
یعنی قومی زبانوں جو کہ ملک میں عوام کی اکثریت کی مادری زبانیں ہیں، کے کردار کو
کم سے کم تر کرنے اور انہیں دبانے کی کوشش کی گئی۔ اس پالیسی کے تحت سندھیوں،
پشتونوں اور بلوچوں کو تعلیمی اور سرکاری اداروں میں اپنی مادری زبانوں کا
استعمال کرنے سے روک دیا گیا۔

پاکستان کی سب سے بڑی قومیت کی زبان پنجابی کے بارے میں خصوصی طور پر

کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان کی کسی بھی دوسری زبان کی نسبت پنجابی زبان کی اردو زبان سے قربت کی وجہ سے اردو زبان کے وسیع پیمانے پر استعمال سے پنجابیوں میں کوئی شدید ردعمل نہیں ہوا کیونکہ وہ اس کے بغیر بھی ہر لحاظ سے ایک غالب قومیت تھی۔

مگر پاکستان کی دوسری قومیتوں خصوصاً سندھیوں کے بارے میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ پاکستان بننے سے قبل اور بعد کے کچھ سالوں میں سندھی زبان تعلیمی اور سرکاری اداروں میں وسیع پیمانے پر استعمال ہوتی رہی ہے اور اس زبان میں اعلیٰ تعلیم دی جاتی رہی ہے۔ یہ بات باور کرنا بھی ضروری ہے کہ سندھی زبان دوسری زبانوں کے مقابلے میں کافی ترقی یافتہ بھی ہے اور اسی لئے سرکاری کاموں اور تعلیم کی ضروریات کو اچھی طرح سے پوری کر سکتی تھی۔ پاکستان کے قیام سے کافی قبل سندھی زبان میں خاصا کثیر مواد تشکیل پا چکا تھا اور سندھی میں خواندہ لوگوں کی تعداد پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں حتیٰ کہ پنجابی میں خواندہ لوگوں سے بھی زیادہ تھی۔

پاکستان کے ارباب اقتدار کی طرف سے اردو زبان کو ٹھونسنے کی پالیسی نے چھوٹے صوبوں کی زبانوں کے لئے سماجی و سیاسی زندگی میں آگے بڑھنے کے راستے مسدود کر دیئے۔ اس وجہ سے پسماندگی کو ختم کرنے اور بلوچوں، پشتونوں اور سندھیوں کو سیاسی زندگی میں منصفانہ مقام حاصل کرنے میں انتہائی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

پاکستان کی مقامی آبادی پر اردو کو لازمی زبان کے طور پر ٹھونسنے کی پالیسی حکمرانوں کی آئیڈیالوجی کی آئینہ دار تھی، جس کے تحت وہ پاکستان میں مختلف قومیتوں کے وجود سے منکر تھے اور ملک کی کل آبادی کو ایک پاکستانی قوم تصور کرتے تھے۔ ان پالیسیوں کا مقصد تمام چھوٹی قومیتوں کے ارباب و زبان کو ملانا اور ثقافت کو یکجا کرنا تھا۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے حکمرانوں نے انتظامی تقسیم کی پالیسی کو اپنایا جو مختلف

قومی علاقوں کی وحدت کو مدنظر رکھے بغیر، بلکہ اس کے برعکس بنائی گئی۔

حکمران طبقات کی قومی زبان اور علاقائی زبانوں سے متعلق مذکورہ پالیسیوں کا اثر تعلیم اور ثقافت کے شعبوں پر بھی پڑا، جس کی گواہی مختلف صوبوں میں خواندگی کے متعلق اعداد و شمار بھی دیتے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں پاکستان میں خواندگی کی شرح مندرجہ ذیل تھی:- پنجاب - ۱۷،۸ فیصد، سندھ (بشمول کراچی) - ۱۶،۶ فیصد، سرحد - ۹،۸ فیصد، بلوچستان - ۱۰،۳ فیصد۔ (ان اعداد و شمار میں تمام عمروں کے افراد کی گنتی کی گئی)

۱۹۸۱ء میں خواندگی کی شرح مندرجہ ذیل تھی:- پنجاب - ۲۴،۵ فیصد، سندھ (بشمول کراچی) - ۲۸،۲ فیصد، سرحد - ۱۴،۳ فیصد، بلوچستان - ۸،۲ فیصد۔ (ان اعداد و شمار میں ۱۰ رسال سے زائد عمر کے افراد کی گنتی کی گئی)

پاکستان کے مختلف صوبوں میں خواندگی کی شرح میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں ہر جگہ ذریعہ تعلیم یا تو انگریزی یا اردو تھا۔ جو سندھیوں، پشتونوں اور بلوچوں کے لئے یکساں طور پر اجنبی تھیں۔ اس کی ایک اور وجہ پرائمری اسکولوں سے لیکر یونیورسٹی تک تعلیمی اداروں کی غیر منصفانہ تقسیم بھی ہے۔ اس سلسلے میں پاکستانی پریس میں یہ اُبھر یاور کیا گیا ہے کہ دیہی علاقوں اور پسماندہ ضلعوں میں تعلیم نسواں کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔

مذکورہ بالا وجوہات کے علاوہ مختلف صوبوں میں خواندگی کی شرح پر معاشی وسماجی، ثقافتی وجوہات کی بناء پر ۵۰ سے ۵۵ فیصد تک بچّے اسکول چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بنیادی وجہ معاشی مسائل ہیں۔ مثلاً دیہاتی علاقوں میں جہاں ملک کی ۷۳ر فیصد آبادی رہتی ہے، ماں باپ اپنے بچّوں کو تعلیم دلانے کے معاملے میں زیادہ پرجوش نہیں ہوتے بلکہ وہ انہیں پیشہ وارانہ تربیت دلانے پر

زیادہ زور دیتے ہیں۔

چھوٹے صوبوں کی مقامی آبادی کے لیے تعلیم کے حصول کے محدود مواقع کا ذکر کرتے ہوئے سندھ کا ذکر خصوصاً ضروری ہے جہاں تعلیمی اداروں کی تقسیم بہت غیر مساوی ہے اور اس سلسلے میں کراچی کا پلڑا بہت زیادہ بھاری ہے۔ اندرون سندھ کے علاقوں اور کراچی کے درمیان تعلیمی اداروں کی غیر مساوی تقسیم کا لازمی نتیجہ شرح خواندگی میں بہت زیادہ فرق کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ساتویں دہائی کے ابتدائی سالوں میں کراچی میں خواندگی کی شرح ۲، ۲۲ فیصد اور اندرون سندھ کے علاقوں میں ۵، ۱۱ فیصد تھی (تمام عمروں کے افراد کو شمار کیا گیا)

سماجی و معاشی ترقی کی غیر ہموار سطح صوبوں سے (مقررہ وقفے سے) شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی تعداد اور مختلف زبانوں میں شائع ہونے والے پریس سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ پاکستان کے کل اخبارات و رسائل (۱۴۵۷) کا پنجاب سے ۶۴ فیصد حصہ (۹۳۱) شائع ہوتا تھا۔ جن میں نوائے وقت، امروز، مشرق، پاکستان ٹائمز، مسلم جنگ وغیرہ شامل ہیں۔ سندھ سے ۳۱ فیصد (۴۵۵) ان میں اکثریت کا تعلق کراچی سے تھا جن میں مندرجہ ذیل بڑے اخبار و رسائل شامل ہیں۔ مثلاً جنگ، اخبار جہاں، ڈان، مارننگ نیوز، امن ——————

بزنس ریکارڈر وغیرہ۔ دوسرے دو صوبوں سرحد اور بلوچستان میں پاکستان کے کل اخبارات و رسائل کا بالترتیب ۳ فیصد (۴۶) اور ۶، ۱ فیصد (۲۵) حصہ شائع ہوتا تھا اور ان کی تعداد اشاعت بھی بہت کم تھی۔

جہاں تک معیار کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں غور طلب بات یہ ہے کہ ایک طرف تو اردو میں چھپنے والے اخبارات و رسائل کی تعداد بہت کثیر ہے۔ یعنی تقریباً ۸۰۱ (۰۳، ۵۵ فیصد) اور اسی طرح سے انگریزی میں ۲۴۲ یعنی ۰۰، ۱۷ فیصد، جبکہ علاقائی

زبانوں میں چھپنے والے تمام اخبارات و رسائل کی تعداد اشاعت کا صرف ۰.۷ فیصد ہیں۔ ان میں سے بلوچی زبان میں ایک، پشتو میں چار، پنجابی میں پانچ اور سندھی میں ۸۷ رسائل و اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ علاقائی زبانوں میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل کی شرح کس حد تک کم ہے۔

ایسی ہی صورتحال ذرائع ابلاغ کے دوسرے شعبوں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تھی۔ ۱۹۷۴ء میں ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں علاقائی زبانوں کو صرف ۵ گھنٹے ماہانہ وقت دیا جاتا تھا اور اسی سال جون میں اسکو ۱۵ گھنٹے تک بڑھا دینے کا منصوبہ تھا۔ اگر اس امر کو مدنظر رکھا جائے کہ کراچی، لاہور، راولپنڈی اور پشاور جیسے شہروں میں روزانہ کی ٹی وی نشریات ۵ سے ۷ گھنٹے تک ہیں تو اس لحاظ سے یہ وقت انتہائی کم ہے۔

ریڈیو پروگراموں میں صورتحال قدرے بہتر تھی، مگر یہاں بھی علاقائی زبانوں کو مناسب کوٹہ نہیں دیا گیا۔ مثلاً آٹھویں دہائی کے شروع میں پاکستان بھر میں اردو نشریات کو ۵۸ فیصد وقت دیا گیا جبکہ سولہ علاقائی زبانوں کو ۴۲ فیصد وقت ملا۔ جہاں تک سندھ کا تعلق ہے تو ۱۹۷۴ء میں حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن نے پروگراموں کا ۶۰ فیصد سندھی کے لئے وقف کیا جبکہ کراچی ریڈیو نے اپنے پہلے چینل پر سندھی زبان میں پروگرام کے لئے صرف ۱۰ فیصد وقت مقرر کیا۔

ایک اور شعبہ جس میں علاقائی زبانوں کو منصفانہ نمائندگی نہیں دی گئی، وہ فلم انڈسٹری ہے۔ اس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل اعداد و شمار پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۴۹ء کے دوران پاکستان میں بننے والی ۹۸ فلموں میں سے ۴۱ اردو زبان میں ۴۹ پنجابی زبان میں، ۵ پشتو زبان میں اور ۳ سندھی زبان میں تھیں اور بلوچی زبان میں کوئی بھی فلم نہیں بنائی گئی۔ کچھ معمولی تبدیلیوں کے ساتھ یہ صورتحال ابھی تک قائم ہے۔

صحت کے شعبے میں بھی صوبوں کے درمیان صورتحال غیر متوازن رہی ہے مثلاً آٹھویں دہائی کے اوائل میں پنجاب میں ہسپتال کا ایک بستر ۹۹۹ مریضوں کے لیے تھا، جبکہ یہی شرح سندھ میں ۱۶۱۷۰، سرحد میں ۱۴۸۵۷، بلوچستان میں ۱۱۵۴۹ تھی۔ کراچی میں ایک ہزار لوگوں پر ایک ڈاکٹر تھا، جبکہ اندرون سندھ کے علاقوں میں ہر ۴ ہزار افراد پر ایک ڈاکٹر تھا،

چھوٹے صوبوں کے عوام، سرکاری اداروں کی بیوروکریٹ مشینری اور سرکاری و پرائیویٹ کارخانوں میں بھرتی کے وقت بلوچوں، پشتونوں اور سندھیوں کے ساتھ روا متعصبانہ سلوک سے بھی نالاں تھے اور اس کے خلاف احتجاج کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے اولین سالوں میں ہی مختلف قومیتوں کی ریاستی اداروں میں نمائندگی کا مسئلہ خاصا شدید تھا اور ۱۹۵۶ء میں منظور شدہ ملک کے پہلے آئین میں اسکو قانونی حیثیت دی گئی تھی۔ مثلاً اس آئین کی شق نمبر ۱۷ کے مطابق ۱۵ سال کے عرصے میں سرکاری ملازمتوں میں ہر طبقے اور ہر علاقے کے رہنے والوں کو متناسب نمائندگی دی جائے گی۔ متناسب نمائندگی کی ضمانت کا فارمولہ پاکستان کے آئندہ آئینوں میں (۱۹۶۲ء کے آئین میں پندرہ سالہ مدت اور ۱۹۷۳ء کے آئین میں دس سالہ مدت کے ساتھ) بھی شامل کیا گیا

ساتویں دہائی کے شروع میں پاکستان کے مختلف علاقوں کے لیے سرکاری ملازمتوں کے لئے کوٹہ مندرجہ ذیل تھے۔ بذریعہ مقابلہ ـ ۲۰ فیصد، پنجاب ـ ۴۶ فیصد، کراچی ۴ فیصد، پاکستان کے باقی علاقے (سندھ، سرحد، بلوچستان، آزاد کشمیر اور مرکز کے تحت حلقے) سب ملا کر ۳۰ فیصد، مزید براں اگر اس امر کو مدنظر رکھا جائے کہ سرکاری ملازمت کے لئے انگریزی اور اردو کا جاننا لازمی شرط تھا تو مقابلے کے امتحانوں میں بھی تعلیمی اور ثقافتی معیار میں فرق کی وجہ سے اکثر اسامیاں پنجاب اور کراچی کو ہی ملتی تھیں۔ یہ نظام ون یونٹ کے دور میں لاگو تھا اور اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ۱۹۵۶ء

اور ۱۹۶۲ء کے دستاویز کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، جن میں متناسب نمائندگی کی ضمانت دی گئی تھی، پنجاب اور کراچی کے ساتھ ترجیحی سلوک برتا گیا اور دوسرے صوبوں کی حق تلفی کی گئی۔

بھٹو کی سول حکومت کے عہد میں مذکورہ نظام کے اندر چھوٹے صوبوں کے حق میں کچھ ردّو بدل ہوا اور ملازمتوں میں کوٹوں کے نئے نظام کے مطابق۔ انتخاب بذریعہ مقابلہ ــ ۱۰ فیصد، پنجاب (بشمول اسلام آباد) ــ ۵۰ فیصد، سندھ ــ ۱۹ فیصد سرحد ــ ۵ر۱۱ فیصد، بلوچستان ــ ۵ر۳ فیصد، شمالی علاقے اور قبائلی پٹی ــ ۴ فیصد آزاد کشمیر ــ ۲ فیصد مقرر کئے گئے۔ اگر اس بات کو مدنظر رکھا جائے کہ مقابلہ کے ۱۰ فیصد کے علاوہ پنجاب کو ۵۰ فیصد حصہ کوٹے میں سے ملا تھا تو پنجاب اور ملک کے دوسرے علاقوں کے درمیان نمائندگی کا تناسب ۶۰ : ۴۰ تھا۔

بھٹو حکومت کے دور میں رائج کوٹہ سسٹم میں سندھ کے متعلق ایک خوبی یہ تھی کہ سندھ کے کوٹے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ شہری علاقوں کا کوٹہ اور دیہی علاقوں کا کوٹہ۔ شہری علاقوں میں کراچی، حیدرآباد، سکھر شامل تھے، اس کے علاوہ دوسرے علاقے دیہی علاقوں میں شمار ہوتے تھے۔ شہری اور دیہی کوٹے کی نسبت ۶۰ : ۴۰ مقرر کی گئی۔ (جبکہ کل پاکستان کی سطح پر کوٹے کی شرح شہروں کے لئے ۶ر۸۷ فیصد اور دیہی علاقوں کے لئے ۴ر۱۱ فیصد تھی)۔ خصوصاً سندھ کے لئے یہ نظام لاگو کرنے کی وجہ اس میں مضمر تھی کہ دوسرے علاقوں کی نسبت سندھ کے شہروں (کراچی، حیدرآباد، سکھر) میں غیر سندھی آبادی خاصی زیادہ تھی اور دیہی علاقوں میں سندھی آبادی کی اکثریت تھی۔

بھٹو حکومت کے کوٹہ سسٹم کی معقولیت پسندی اپنی جگہ مسلم ہے کیونکہ اس میں پہلے کوٹہ سسٹموں کے برعکس پاکستان کے کچھ علاقوں کے مفادات کا تحفظ کیا گیا۔ مگر اس کے باوجود پنجاب اور کراچی کے ترقی یافتہ علاقوں کی غالب حیثیت برقرار رہی۔ اس

کی شہادت زبانی اداروں میں موجود حقیقی صورتحال سے آشکارا ہوتی ہے۔ بلوچستان
سے قومی اسمبلی کے ممبر عبدالحئی بلوچ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے وفاقی وزیر تعلیم عبدالحفیظ
پیرزادہ نے ۱۹۷۲ء میں قومی اسمبلی میں بتایا کہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۷۲ء تک سفارتی
ملازمتوں پر بلوچستان سے ۳ فیصد، سرحد سے ۱۱ فیصد، سندھ سے ۱۵ فیصد اور پنجاب
سے ۷۹ فیصد افراد لیے گئے۔ ریلوے کے اعلیٰ افسران کے متعلق اعداد و شمار سے بھی ظاہر
ہوتا ہے کہ اس محکمے میں بھی پاکستان کے چاروں صوبوں کو متناسب نمائندگی حاصل
نہیں رہی۔ مثلاً ۱۹۷۵ء کے شروع میں ۱۷ گریڈ سے ۲۲ گریڈ تک کی ریلوے اسامیوں
پر پنجاب سے ۲۵۵ (۷۶ فیصد)، سندھ سے ۲۸ (۷.۵ فیصد)، سرحد سے ۲۴ (۶ فیصد)
اور بلوچستان سے ۹ (۲ فیصد) افراد لیے گئے۔ جبکہ ۲۱ اور ۲۲ گریڈ کی تمام آسامیاں
پنجابیوں کے پاس تھیں۔ — [illegible]

چھوٹی قومیتوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کا دائرہ صرف سول سروسز تک ہی
محدود نہیں تھا بلکہ یہی صورتحال مسلح افواج میں بھی موجود تھی۔ پاکستانی پریس میں
شائع ہونے والے نیم سرکاری بیانات، ریاستی اور سیاسی لیڈروں کے اعلانات کے مطابق
پاکستانی افواج بنیادی طور پر پنجابیوں (۸۵-۸۰ فیصد) پشتونوں (۲۰-۱۵ فیصد)
اور بہت تھوڑی تعداد میں بلوچوں سے بھرتی کی جاتی تھی۔ جہاں تک سندھیوں کا تعلق
ہے تو ۲۵ سالہ دور میں ان کی مسلح افواج میں نمائندگی صرف ۱.۰ فیصد تھی۔

چھوٹے صوبوں کی غیر مساوی نمائندگی پیداواری اور سروس کے شعبوں میں بھی
موجود تھی۔ سندھیوں، پشتونوں، بلوچوں کو کارخانوں اور سروس کے مختلف شعبوں
میں ملازمت کے سلسلے میں بھی نظر انداز کیا جاتا تھا۔ قومی احساسات کے علاوہ اس
کی سیاسی و معاشی وجوہات بھی تھیں۔

۱۰۔ ایشیا و زر کے تعلقات کی کمزوری، زرعی پیداوار کی کمزور تیکنیکی بنیادوں کی وجہ

سے کھیتی باڑی کے طریقوں کی شکلیں خاصی دقیانوسی تھیں، اس کے علاوہ آبادی میں
اضافہ کی شرح بھی کافی زیادہ تھی، جسکی وجہ سے فالتو آبادی میں اضافہ ہوا۔ پاکستان
کی صورتحال میں ایسے پسماندہ علاقوں سے لوگوں کی روزگار کے زیادہ مواقع والے
علاقوں میں ہجرت سے کچھ زیادہ مثبت نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ مختلف صوبوں کے
درمیان غیر مساوی ترقی کی وجہ سے پسماندہ صوبوں سرحد اور بلوچستان سے زیادہ ترقی
یافتہ پنجاب اور جنوبی سندھ یعنی کراچی کی طرف مستقل ہجرت یا کئی سالوں کے لئے قیام
کا رجحان پیدا ہوا۔ اسطرح بلوچستان اور خطہ سے پنجاب اور سندھ کے جنوبی حصے،
یعنی کراچی میں سرمائے کی منتقلی اور محنت کشوں کی نقل مکانی جاری ہے۔ اس کے
نتیجے میں بلوچستان اور سرحد کی بقیہ آبادی میں عمر اور جنس کے لحاظ سے غیر متوازن صورتحال
پیدا ہونے لگی ہے اور یہ صورتحال مقامی سرمایہ کاروں کے لئے بھی پُرکشش نہیں ہے۔ اس
کے علاوہ اس حقیقت کو بھی مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ پنجاب اور سندھ میں نقل
مکانی کی بدولت نسلیاتی اور علاقائی طور پر مستحکم قومیتوں کی بنیادیں کمزور پڑ رہی
ہیں۔ پسماندہ علاقوں سے پنجاب اور کراچی کی جانب عموماً غیر ہنرمند مزدور ہی نقل
مکانی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں کارخانوں میں غیر ہنرمند کاموں اور ملازمتوں
میں استعمال کیا جاتا ہے۔

مہارت کی کمی اور زبان کی اجنبیت کی وجہ سے پنجاب اور کراچی کے آجر دوسرے
موافق حالات کی موجودگی کے باوجود نقل مکانی کر کے آنے والوں کی بجائے مقامی لوگوں
کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس قسم کا ترجیحی سلوک پسماندہ صوبوں میں بھی کیا جاتا رہا ہے۔
ان علاقوں کے آجر معروضی و غیر معروضی وجوہات کی بناء پر مقامی لوگوں کی بجائے پنجابیوں
اور مہاجروں کو کام دیتے تھے۔

۱۹۷۲ء میں سندھ صوبائی اسمبلی کے بجٹ اجلاس میں سندھ کے وزیر صحت کٹپر نے

اس حقیقت کی نشاندہی کی تھی کہ انڈسٹریل ڈیویلپمنٹ کارپوریشن اور کراچی پاور سپلائی کارپوریشن میں سندھیوں کو متناسب نمائندگی نہیں دی جارہی ہے۔ یہی صورتحال دوسرے اداروں میں بھی تھی۔ سندھ صوبائی اسمبلی میں حکمران پیپلز پارٹی کے رکن سومرو نے اعلان کیا کہ سندھیوں کو صنعتی اداروں میں ملازمتوں سے انکار کیا جارہا ہے۔

سندھیوں کو ملازمت دینے سے انکار کا دائرہ صرف کراچی تک ہی محدود نہیں ہے، جہاں مہاجر، پنجابی، پشتون اور بلوچ اکثریت میں ہیں بلکہ سندھ کے اندرونی علاقوں میں جہاں سندھی واضح اکثریت میں ہیں یہی صورتحال ہے۔ سندھ کی بجٹ اسمبلی کے اجلاس میں سندھ کے وزیر محنت گبول نے کہا تھا کہ حبیب آباد اور گھارو کے صنعتی اداروں میں ۶۱۸۵ مزدوروں میں سے ۱۶۷۰ (۲۷ فیصد) سندھی تھے اور ۴۵۱۵ (۷۳ فیصد) غیر سندھی تھے۔ تقریباً ایسی ہی صورتحال قومی اسمبلی کے ممبر زرداری کے بیان سے سامنے آتی ہے کہ سندھ میں موجود صنعتی اداروں میں سندھیوں کی تعداد صرف ۱۰ فیصد ہے۔

غیر مساوی سلوک کی وجہ سے نہ صرف سندھیوں کی مالی حالت خراب تر ہوگئی، بلکہ ایک طرف اس سے سندھیوں میں احساس محرومی پیدا ہوا، دوسری طرف پنجابیوں اور مہاجروں میں اپنے اعلیٰ مرتبہ ہونے کے احساسات ابھرے۔ اس وجہ سے عوام کے وسیع حلقوں میں تعصب اور قومی نفرت کی بنیادیں استوار ہوئیں۔

اس طرح سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ قومی مسئلہ کی معروضی و غیر معروضی بنیادیں سماجی و معاشی عناصر میں ہیں۔ انہیں عناصر کا مجموعہ پاکستان میں قومی اور سیاسی مسائل کی راہیں متعین کرتا ہے۔ اس صورتحال کا سب سے اہم نکتہ پاکستان کے بڑے لسانی گروہوں کے درمیان نہ ختم ہونے والی چپقلش ہے، یہ چپقلش لسانی گروہوں کے استحصالی طبقوں کے درمیان ہے، جن میں ایک طرف اپنے غلبہ کو قائم رکھنے کے لئے کوشاں پنجابی اور

مہاجر ہیں اور دوسری طرف پنجابیوں اور مہاجروں سے سماجی و معاشی اور سیاسی اقتدار اعلیٰ میں اپنے قانونی حق کے طلبگار سندھ، سرحد اور بلوچستان کے استحصالی طبقے ہیں۔

تمام چھوٹے صوبوں کی جدوجہد میں مشترکہ نکتہ پنجاب کے غلبے کے خلاف ان کی جدوجہد ہے۔ مگر پاکستان کی تاریخ کے مختلف ادوار میں یہ جدوجہد مختلف صوبوں میں عوام کے مختلف سیاسی شعور اور غیر مساوی سماجی و معاشی ارتقا کی بدولت مختلف صورتیں اختیار کرتی رہی ہے۔ اس لئے پاکستان کے مختلف صوبوں میں قومی تحریکیں مختلف وقتوں میں ابھرتی رہی ہیں اور ان کے درمیان رابطے کا فقدان رہا ہے۔ اسی لئے حکمران انہیں کامیابی سے دبانے میں کامیاب رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی پاکستان کی چھوٹی قومیتوں کی جدوجہد رائیگاں نہیں گئی۔ اس جدوجہد نے نہ صرف عوام کے قومی شعور کو بلند کیا بلکہ پنجابی اور مہاجر سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے بلاک سے وقتاً فوقتاً رعایتیں بھی حاصل کی ہیں۔ پاکستان کی قومیتوں کی قومی تحریکوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں مختلف سماجی گروہ (جاگیردار، مذہبی حلقے، بورژوازی کے مختلف حصّے، تعلیم یافتہ طبقہ، کسان اور پرولتاری) شامل رہے ہیں، جو کہ ان میں اپنے اپنے طبقاتی مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کی قومیتوں کی جدوجہد میں کچھ مشترکہ رجحانات بھی ملتے ہیں۔

پاکستان میں قومی تحریکوں کا اہم نکتہ آئینی اور حقیقی طور پہ سماجی و معاشی اور سیاسی خود مختاری کے لئے جدوجہد ہے۔ جو کہ ان علاقوں کی بورژوازی خود کو پنجاب اور کراچی کے بڑے سرمایہ داروں کے ساتھ مہلک مقابلے سے بچانے کے لئے ضروری سمجھتی ہے۔ قومی جدوجہد کا ایک

اور پہلو صوبوں کے درمیان موجودہ سرحدوں کی لسانی و نسلی بنیادوں پر
از سرِ نو حد بندی ہے تاکہ پہلے ہی پنجابیوں سے چھوٹے لسانی گروہوں کی مزید
تقسیم کو روکا جا سکے۔ اس کے ساتھ ہی چھوٹی قومیتوں کی قومی ثقافت اور زبان
کو ترقی دینے اور ان کی زبانوں کو قومی درجہ دینے کی جدوجہد بھی شامل ہے۔
مجموعی طور پر پاکستان کے چھوٹے صوبوں کی جدوجہد مختلف وقتوں میں،
مختلف صوبوں میں، مختلف مطالبات کے ساتھ سرگرم رہی ہے۔ جن میں
ثقافت اور زبان کے لحاظ سے خود مختاری سے لیکر پاکستان سے علیحدگی تک
کے مطالبات شامل رہے ہیں۔

ترجمہ: ڈاکٹر شاہد لطیف
ڈاکٹر صادق محمود

سوشلسٹ راہ پر گامزن ریاستیں اور قومی سوال

یودی یوربین

ایشیاء اور افریقہ کے نوآزاد ممالک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی اولین شرط یہ ہے کہ انکے ہاں قومی مسئلے کا کوئی مستقل جمہوری حل ڈھونڈا جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہاں قومی جبر اور قومی عدم مساوات کی تمام اشکال کو ختم کیا جائے اور اُن وجوہات کا بھی سدّباب کیا جائے جو مختلف قومیتوں اور قبائل کے مابین رنجش، مخاصمت اور شک و شبے کو جنم دیتی ہیں۔

اپنے مخصوص تاریخی پس منظر اور نشو ونما کی وجہ سے ان نوآزاد ریاستوں میں قومی سوال اپنی جداگانہ خصوصیات رکھتا ہے۔ یورپی ریاستوں کے برعکس جہاں قومی تحریکات نے قومی ریاستوں کو جنم دیا۔ ایشیاء اور افریقہ کی بیشتر نوآزاد ریاستیں اس صورتحال میں وجود میں آئیں جہاں قومی بنیادیں ابھی پوری طرح صورت پذیر نہیں ہوئیں تھیں۔

ان میں بہت سی ریاستیں ایسی ہیں جنکی آبادی درجنوں ایسے نسلی گروہوں پر مشتمل ہیں جو قومی اتحاد کے مختلف مراحل سے گزر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر کانگو کی ریاست ،، قبائل پر مشتمل ہے اور ٹانگانیکا (جو تنزانیہ کا حصّہ ہے) میں ۱۲۰ قبائل ہیں۔ برما جہاں کی برمی انسل لوگ آبادی کا دو تہائی ہیں۔ وہاں دوسری بڑی قومیتیں بھی آباد ہیں

جن میں کیریبی، چینی اور سٹان قابلِ ذکر ہیں۔ اس حقیقت کا اظہار سوشلسٹ رخ اختیار کرنے والی ریاستوں (Socialist oriented countries) کے دساتیر سے بھی ہوتا ہے مثلاً برما کے ۱۹۷۴ء کے آئین کی دفعہ ۲ کے تحت "برما کی سوشلسٹ جمہوریہ ایک ایسی ریاست ہوگی جہاں تمام قومیتیں اکٹھی رہ سکیں"۔ اسی طرح عوامی جمہوریہ بینن کے آئین کی دفعہ ۳ کے تحت "بینن کو ایک کثیر القومی اتحادی ریاست کا نام دیا گیا"۔

نو آزاد ریاستوں کا کثیر النسل ہونا ان کے نو آبادی ماضی کا ایک ورثہ ہے۔ اوّل تو یہ ریاستیں سامراجی قوتوں کے نو آبادیاتی مقبوضات کی سرحدوں کے اندر بنیں جو کہ نو آبادیاتی طاقتوں نے تاریخی، معاشی اور نسلی عوامل کو نظر انداز رکھتے ہوئے اپنی مرضی سے قائم کئے تھے۔ نتیجتاً ایک نو آبادی کے اندر ہمیں بہت سے نسلی گروہ ملیں گے اور بعض صورتوں میں ایک ہی نسلی گروہ کے لوگ کئی نو آبادیات میں بٹے ہوئے ملیں گے اور اس پر ستم یہ کہ یہ نو آبادیاں مختلف نو آبادیاتی طاقتوں کے زیر تسلّط تھیں۔ ایسا ہی کچھ حال بجوانگو اور ایو نسل کے لوگوں کا تھا۔ بجوانگو تو پرتگالی نو آبادی انگولا، بلجیمی کانگو اور فرانسیسی کانگو میں بٹے ہوئے تھے۔ یہ وہ علاقے ہیں جہاں بعد میں عوامی جمہوریہ انگولا، زائیر اور عوامی جمہوریہ کانگو کی ریاستوں نے جنم لیا اور ایو لوگ فرانسیسی کانگو اور برطانوی گولڈ کوسٹ میں بسے ہوئے تھے جو بعد میں جمہوریہ کانگو گھانا اور جمہوریہ ٹوگو کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ دوسرے یہ کہ نو آبادیاتی حکومتوں کے قیام اور پالیسیوں کی وجہ سے ان علاقوں میں قوم سازی کا عمل سست پڑ گیا۔ کوئی بھی قوم صحیح طور پر انسانی ارتقاء کے ایک خاص مرحلے پر مکمل طور پر تشکیل پذیر ہوتی ہے انسانی ارتقا کے عمل میں وہ دور سرمایہ داری کا ہے جب سامراجی قوتوں نے نو آبادیاتی توسیع پسندی کا آغاز کیا تو اس وقت ایشیا، افریقہ اور بحرالکاہل (نیوزی لینڈ

اور آسٹریلیا) کے عوام نے سرمایہ داری کی راہ اختیار نہیں کی تھی اور اس لئے مختلف قوموں کے طور پر وہ اُبھر کر سامنے نہیں آئے تھے ۔ ابھی تک انہیں وہی خصوصیات پائی جاتی تھیں جو کہ قبیلے یا کسی قومیت میں پائی جاتی ہیں ۔ اس کے برعکس قوم لوگوں کا ایک ایسا اجتماع ہوتا ہے جو کہ مشترک علاقے ، معاشی زندگی زبان اور ثقافت کے حوالے سے ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں ۔

نو آبادیاتی طاقتوں نے غلام عوام کے معاشی ، سیاسی اور ثقافتی ارتقاء کو ایک لمبے عرصہ کے لئے روک کر قبائل کے قومیتوں میں ضم ہونے اور قومیتوں کے ایک قوم میں ضم ہونے کے قدرتی عمل کو روکے رکھا ۔ کئی ایک ممالک خصوصاً وسطی افریقہ میں قومی اتحاد کا یہ عمل ابھی بالکل نامکمل ہے جبکہ دوسرے ممالک یہ ابھی شروع ہوا ہے ۔ گنی کے صدر سیکو طورے نے ایک دفعہ کہا تھا ۔ " اصولاً ریاست قوم سے پہلے بنتی ہے " دوسرے لفظوں میں ریاست ایک علاقے میں بسنے والے مختلف نسلی گروہوں کے ایک قوم (یا کئی ایک قوموں) میں متحد ہونے سے پہلے وجود میں آجاتی ہے ۔

نو آبادیاتی طاقتوں نے اس کثیر النسلی کا فائدہ اٹھایا اور اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ ابھی ان علاقوں میں قومی یکجہتی اور اتحاد کا عمل پورا نہیں ہوا تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کے لئے موافق فضا دیکھی ۔ یہ پالیسی اس لئے اختیار کی گئی تھی تاکہ مختلف نسلی گروہوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکایا جائے ۔ قومی آزادی کی تحریکوں کے اندر پھوٹ ڈالنے کے لئے نو آبادیاتی حکام نے قبائلی برادری اور ذات کی بنیاد پر سیاسی جماعتوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی ۔ انہوں نے جاگیردارانہ اور قبائلی اشرافیہ کی علیحدگی پسندی کی ان تحریکوں کی امداد کی جو native state کو قائم رکھنا چاہتی تھیں ۔ (جیسا کہ برما میں جاگیردارانہ علاقے اور جنوبی یمن کی سلطنتیں) انہوں نے اسی طرح بعض ریاستوں کو آزاد بھی کر دیا ۔ اس پالیسی کی وجہ سے نسلی گروہوں

اور مختلف فرقوں کے مابین عدم اعتماد اور دوری کی فضا پیدا ہوئی جس نے مخصوص حالات میں دشمنی اور تصادم کو جنم دیا جو بالآخر ہزاروں انسانوں کی ہلاکت کا باعث بنے اس تصادم کی سب سے بڑی وجہ مختلف گروہوں کے مابین معاشی، سیاسی اور ثقافتی سطح پر عدم توازن تھا جس کو نوآبادیاتی نظام حکومت نے پروان چڑھایا تھا۔

سیاسی آزادی کے بعد سوشلسٹ رُخ اختیار کرنے والی ریاستوں کو قومیتوں کے حوالے سے اپنی اپنی پالیسی وضع کرنا پڑی۔ قدرتی طور پر ان پالیسیوں کو وضع کرنے میں ہر ملک اپنے مخصوص حالات کو مدِّنظر رکھتا ہے کیونکہ ہر ملک یکجہتی اور استحکام کے عمل میں مختلف انداز سے گزرتا ہے۔ کیونکہ اسے اس عمل سے گزرتے ہوئے قبائلی نظام، تنظیموں، قبائلی اور جاگیردارانہ گروہ بندیوں، قومی زبان کی عدم موجودگی، قبائلی علیحدگی پسندی کے مختلف انداز اور کم ترقی یافتہ لوگوں کی زیادہ ترقی یافتہ لوگوں کی طرف سے امداد کی صورت میں واسطہ پڑتا ہے۔ کئی ممالک میں ریاستی ڈھانچے کی مختلف اشکال کو ترجیح دیجاتی ہے، جس میں انتظامی علاقائی تقسیم اور مختلف نسلی گروہ کی ریاستی مشینری فوج اور دوسرے محکموں کی نمائندگی شامل ہے۔

ایک کثیر النسلی ملک کے مخصوص حالات خواہ کچھ بھی ہوں تمام نوآزاد ممالک کے لئے سماجی تبدیلی کے عمل سے گزرتے ہوئے قومی سوال ایک اہم ترین مسئلہ ہے جو سماجی تبدیلی کی رفتار اور نوعیت کو متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس مسئلے کے حل میں ناکامی یا اسکو غیر اہم سمجھنے کے نتائج انتہائی خراب بھی ہوسکتے ہیں۔

اس قسم کے اتحاد کا نظریہ آبادی کی ہیت ترکیبی کو نظر انداز کر کے اوپر سے ٹھونسا جاتا ہے۔ اس قسم کی صورتحال میں جہاں قوم پوری طرح صورت پذیر نہیں ہوئی ریاست کو قوم کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ کئی ایک ممالک میں قومی سوال کو صرف ایک قبائلی مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور اُسے قبائلوں کے مابین چپقلش تک محدود کردیا جاتا ہے اس کے ساتھ ساتھ

نسلی مسئلہ کو اس معاشرے میں ہونے والی سماجی، اقتصادی اور سیاسی تبدیلیوں کے عمل کے ساتھ جوڑ کر نہیں دیکھا جاتا۔ ان باتوں کے باوجود قبائل کے مابین چپقلش کے معروضی اسباب، قومی عدم مساوات، سماجی اقتصادی اور ثقافتی نشوونما میں عدم توازن اپنی جگہ موجود ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محض قبائلی منافرت کو وقتی طور پر رد کر دینے سے یہ کلی طور پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے مکمل خاتمے کے لئے اس کی سیاسی سماجی اور اقتصادی بنیادیں ختم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

جن ممالک نے اپنی تعمیر نو کے لئے سوشلسٹ راہ اپنائی ہے ان ممالک میں قومی سوال جمہوری تبدیلیاں لانے والے ایک بڑے پروگرام کا حصہ ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ ہی اخذ نہیں کر لینا چاہئے کہ قومی سوال اپنے تئیں انفرادی طور پر بغیر کسی سیاق و سباق کے ایک اہم مسئلہ ہے یہ اُس جدوجہد کے مقابلے میں جو محنت کش ایک نئے سماج کو جنم دینے کے لئے کر رہے ہوتے ثانوی حیثیت کا حامل ہے کیونکہ وہ ایک ایسے غیر طبقاتی سماج کے لئے جدوجہد کر رہے ہوتے ہیں جہاں ایک انسان دوسرے انسان کا استحصال نہیں کر سکتا۔ آخری تجزیہ کے طور پر یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ قومی تعلقات کا تعین بالآخر طبقاتی تعلقات سے ہی ہوتا ہے۔

ایک بورژوا معاشرے میں ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت ہی نہ صرف سماجی بلکہ قومی نابرابری اور جبر و تشدد کے لئے بنیادیں فراہم کرتی ہے۔

نجی ملکیت عوام کے اتحاد کو پارہ پارہ کرتی ہے اور طبقاتی اور قومی مخاصمتوں کو جنم دیتی ہے۔ قومی جبر، نابرابری اور قومی عداوت کا خاتمہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ذرائع پیداوار میں سے نجی ملکیت کا خاتمہ کر دیا جائے جو صرف سوشلزم کی فتح کی صورت میں ممکن ہے۔

کمیونسٹ مینی فیسٹو میں لکھا ہے جیسے ہی ایک فرد کا دوسرے فرد کے ہاتھوں

استحصال کا خاتمہ ہوجاتا ہے اُسی طرح ایک قوم کا دوسرے قوم کے ہاتھوں استحصال کا خاتمہ ہوجاتا ہے ۔ جیسا کہ ایک قوم کے اندر دو طبقات کے درمیان مخاصمت ختم ہوجائیگی اُسی طرح ایک قوم کی دوسری قوم کے ساتھ عداوت کا خاتمہ ہوجائیگا ۔

قومی سوال کے حل کی پہلی سیاسی شرط یہ ہے کہ محنت کشوں کی حکومت قائم کی جائے اور اقتصادی سطح پر یہ ضروری ہے کہ ذرائع پیداوار جو کہ مختلف قوموں اور قومیتوں کو ایک خاندان کے طور پر متحد کرتے ہیں کو عوامی ملکیت میں لے لیا جائے مارکسی لینی نظریہ نے قومیتی پالیسی کے بنیادی اصول وضع کرتے ہوئے اور انہیں آگے بڑھاتے ہوئے اُس کا ایک جمہوری حل پیش کیا ہے جو درج ذیل نکات پر مشتمل ہے ۔

۱ ۔ حقوق کے حوالے سے مساوات اور قوموں اور قومیتوں کے ایک ریاست میں رہتے ہوئے تمام معاشی اور ثقافتی میدانِ عمل میں برابری ۔

۲ ۔ قوموں کی حق خود ارادیت اور آزاد ریاستوں کے قیام کے لیے حق علیحدگی ۔

۳ ۔ پرولتاری بین الاقوامیت

قومی مسئلے کو حل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ سماجی اور ریاستی نظام کو جمہوری عمل سے گزارا جائے ۔ لینن نے اس بات کی طرف ایک سے زیادہ موقعوں پر اشارہ کیا ہے "سرمایہ دارانہ نظام کے تحت قومی یا سیاسی جبر کو ختم کرنا ناممکن ہے کیونکہ یہ صرف طبقات کو ختم کرنے ہی سے ممکن ہوسکتا ہے اور ایسا صرف سوشلسٹ نظام کے تحت ہوسکتا ہے گو سوشلزم کی بنیادیں اقتصادیات پر مبنی ہیں لیکن سوشلزم کے نظریئے کو صرف اقتصادیات تک محدود نہیں کیا جاسکتا ہے ۔ قومی جبر کے خاتمہ کیلئے سوشلسٹ طریقہ پیداوار کا رائج کرنا ضروری ہے لیکن اس کے ساتھ ایک جمہوری طریقہ کار کے تحت ایک منظم ریاست کا قیام اور فوج کا جمہوری ہونا بھی ضروری ہے ۔

ایک کثیر القومی ریاست کے جمہوری ادارے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہاں قومی برابری اور قوموں کے حق ارادیت کے اصول کو مسلسل مد نظر رکھا جائے اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ علاقائی اور انتظامی ڈھانچوں کا تعین کرتے وقت قومی سوال کو مد نظر رکھا جائے بلکہ قومی علاقوں کو اُوپر سے طاری کئے ہوئے نوکر شاہانہ کنٹرول سے بھی آزاد کیا جائے ۔ قومی ریاست کا اس قسم کا وفاقی ڈھانچہ اور قومی خود مختار علاقے ریاستی اور قانونی سطح پر قومی سوال کو حل کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں (ظاہر ہے یہ بات انہی ریاستوں کے لئے موزوں ہیں جہاں اس کے لئے مخصوص حالات موجود ہوں)

سوویت یونین وہ پہلی ریاست تھی جہاں قومی سوال کو مارکسی لینی بنیادوں پر حل کیا گیا ۔ سوویت کثیر القومی ریاست کے تجربے نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ قومی سوال کا مستقل حل صرف سوشلسٹ بنیاد پر معاشرے کی تشکیل نو سے وابستہ ہے اور صرف سوشلسٹ جمہوریت ہی عوام کے مساویانہ حقوق اور مواقع کی ضمانت دے سکتی ہے اور قومی سوال کے حل کے لئے ایسے حالات پیدا کر سکتی ہے جہاں مختلف اقوام اور قومیتوں کے محنت کشوں کے حقوق کی طرف پوری توجہ دی جا سکے ۔ اس تجربے نے مارکسی ، لینی کلاسیکی نظریئے کی یہ بات ثابت کردی ہے کہ قومی سوال کو حل کرنے کا بورژوا اور اصلاحی طریقہ کار رجعت پرستانہ ہے اور یہ قوموں کے درمیان نفاق پیدا کرتا ہے اور ایک قوم کی دوسری اقوام پر برتری کی راہ دکھاتا ہے اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بائیں بازو کے نظریہ والوں کے حوالے سے قوم اور قومی خود مختاری کے تعلقات کو متروک قرار دینے میں کیا خدشات پنہاں ہیں ۔

سوویت سوشلسٹ ری پبلک کی ساٹھویں سالگرہ پر کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی قرار داد میں کہا گیا ہے "سوویت سوشلسٹ ری پبلک کا قیام اور اُس کی کامیاب نشوونما ایک مستقل بین الاقوامی اہمیت کی حامل ہے اور صدیوں پرانی ترقی پسند قوتوں

کی جدو جہد میں ایک اہم سنگ میل ہے جو انہوں نے دنیا کی انقلابی تجدید نو اور لوگوں کے درمیان برابری اور دوستی کے لئے کی ہیں۔ اس تجربے نے کثیر القومی سوشلسٹ رخ اختیار کرنے والی ریاستوں میں قومی مسائل کے حل اور نشوونما کے لئے انتہائی اثرانگیز کام کیا ہے جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے عوام کے مسائل حل کرنے کے لئے ان ممالک میں انتہائی اہم سماجی، اقتصادی اور سیاسی اصلاحات متعارف کرائی جا رہی ہیں جیسا کہ نجی پیداواری ذرائع کی نجی ملکیت کی حد بندی ایک انسان کا دوسرے انسان کا استحصال اور معاشی و اقتصادی زندگی میں جمہوریت کا احیاء اور نظریاتی و تعلیمی کام، ریاست اور حکمراں پارٹیوں کی طرف سے ہو رہا ہے۔ ان اقدامات کی وجہ سے قومی یکجہتی کو تقویت ملتی ہے اور بہت سے نسلی گروہ آپس میں مربوط ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سوشلسٹ رخ اختیار کرنے والی ریاستوں کا تجربہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ قومی مسئلے کا حل انتہائی پیچیدہ اور طویل المیعاد عمل ہے کیونکہ اس میں انتہائی وسیع نوعیت کے مختلف مسائل سے واسطہ پڑتا ہے جن میں قانونی اور حقیقی برابری کا سوال ایک قومی زبان کا مسئلہ کارکنوں کی تربیت ریاستی ڈھانچے کی ترتیب نو، علیحدگی پسند خیالات کی بیخ کنی اور مختلف نسلی گروہوں کے درمیان دوستی اور تعاون کے مسائل بھی شامل ہیں۔

ایک قوم (یا قوموں) کی تشکیل کا عمل اب بھی سوشلسٹ رخ اختیار کرنے والی بہت سی ریاستوں میں عمل پذیر ہے۔ اس سے اور بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جس کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ قوموں کے درمیان یکجہتی اور ارتباط کے لئے ریاستی اور قانونی حوالے سے نئے اقدامات کئے جائیں۔ قبائلی اور جاگیرداری گروہ بندیاں اور ٹکڑیاں جو کہ نوآبادیاتی نظام سے ورثہ میں ملی ہوتی ہیں اس مسئلے کو حل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اولاً تو یہ مختلف نسلی گروہوں کے درمیان وسیع اقتصادی روابط قائم کرنے

اور ایک قومی ملکی منڈی کو قائم کرنے میں مانع ہوتی ہیں یعنی اقتصادی استحکام میں یہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ دوسرے یہ ان علاقوں کے اتحاد میں رکاوٹ بنتے ہیں جو قبائلی اور جاگیردارانہ حوالے سے ایک ریاست کے اندر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹے ہوتے ہیں یعنی یہ سیاسی استحکام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے تیسرے یہ اُس قومی شعور کی راہ میں رکاوٹ ہے جو قبائلی ذہنیت کو ختم کرنے میں مدد دیتا ہے اور آخر میں یہ قومی زبان اور ثقافت کی تشکیل نو میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

سوشلسٹ راہ پر گامزن ریاستوں میں ان اداروں کا پوری طرح قلع قمع کیا جا چکا ہے جنہیں نوآبادیاتی طاقتوں نے مصنوعی طور پر آبادی کو متحد ہونے سے روکے رکھا۔ جیسا کہ گنی، کانگو اور بینن میں گاؤں کے نمبردار کا ادارہ، تنزانیہ میں مقامی حکام، برما میں جاگیردارانہ علاقائی ادارے اور عوامی جمہوریہ یمن میں سلطنتیں۔ اب وہاں نئے سیاسی اور علاقائی ڈھانچے قائم کئے گئے ہیں جنہوں نے پرانے قبائلی اور جاگیردارانہ حدبندیوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اب وہاں نئے سیاسی و علاقائی انتظامی یونٹ بنائے گئے ہیں (صوبے، ریجن اور ڈسٹرکٹ) جن میں اقتصادی ضرورت کو مدنظر رکھا گیا ہے تاکہ ریاستی اداروں اور عوام کے درمیان مضبوط رشتے استوار ہوں۔

قبائلیت کے خاتمے نے اس حوالے سے انتہائی اہم کام سرانجام دیا ہے بہت سی جمہوری انقلابی جماعتوں کے پروگراموں میں ایک اہم کام قبائلیت کا خاتمہ ہے جیسا کہ فری لیمو FRELIMO کے پروگرام سے ظاہر ہے وہ پارٹی قومی نظریاتی اور طبقاتی اتحاد کے استحکام کے لئے جدوجہد کریگی تاکہ ان طاقتوں کا محاسبہ کیا جا سکے جو عوام کو متحد کرنے کی راہ میں رکاوٹ ہے خصوصاً جاگیرداریت، علاقائیت اور نسل پرستی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کانگو کی لیبر پارٹی کے پروگرام

میں بھی منظم طریقے سے قبائلیت اور علاقائیت کا خاتمہ کرنا شامل ہے۔

قبائلیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینے کے لئے یہی ضروری نہیں ہے کہ پرانے اور فرسودہ سماجی اداروں اور قبائلی اور جاگیردارانہ انتشار کو ختم کیا جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ساتھ ساتھ ایسی پالیسی بھی وضع کی جائے جس میں قومی سطح پر تربیت یافتہ عملہ موجود ہو اور اس کے عملی اطلاق کے لئے قانونی تحفظ بھی حاصل ہو (جیسا کہ بعض ملکوں میں قبائلی شناخت کے مختلف نشانات چہرے پر بنانا ممنوع قرار دیا گیا ہے)

سماجی اور اقتصادی تبدیلیاں (خصوصاً زرعی اصلاحات) تعلیمی نظام کی ترقی اور ثقافتی نشوونما سب ملکر قبائلی شناخت کو ختم کرنے اور قومی تشکیل نو میں مدد دیتی ہیں۔ قومیں جیسا کہ ہم جانتے ہیں سرمایہ داروں کے دور میں جنم لیتی ہیں لیکن سوویت یونین کا تجربہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ سرمایہ داری کے عمل سے گزرے بغیر سوشلسٹ نظام کے تحت لوگ قوموں میں متحد ہو گئے ہیں۔ یہ تجربہ ان ملکوں کے لئے انتہائی اہم ہے جہاں ابھی قومیں تشکیل پذیر نہیں ہوئیں۔ سوشلسٹ نظریہ قوموں کی تشکیل کے لئے ان معروضی اور موضوعی عوامل کو جنم دیتا ہے جہاں عوام غیر سرمایہ داری بنیادوں پر قوم میں ڈھل جاتے ہیں جو بعد ازاں سوشلسٹ قوموں کی شکل میں صورت پذیر ہوتی ہیں۔ یہ راہ بہت سی انقلابی جمہوری پارٹی نے اپنائی ہے جس میں گنی کی ریاستی پارٹی بھی شامل ہے جس کے ۱۹۶۹ء کے قوانین یہ کہتے ہیں کہ اس کا ایک مقصد ریاست کے شہریوں کو ایک واحد طاقتور سوشلسٹ قوم میں متحد کرنا ہے۔

سوشلسٹ راہ اختیار کرنے والے اکثر ملکوں کے ہاں قوموں کی تشکیل کے مسئلہ کا عملی حل ابھی ابتدائی مراحل سے گزر رہا ہے لیکن ابھی تک جو تجربہ انہوں نے حاصل کیا ہے وہ اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ قومی مسئلے کو حل کرنے کے لئے مارکسی لینی نظریہ کے طریقہ ہائے کار ایک عالمگیر سچائی کے طور پر سامنے آئے ہیں اور یہ اس بات کا بھی

ثبوت ہے کہ سوویت یونین اور سوشلسٹ رُخ اختیار کرنے والے ملکوں نے جس طرح اس مسئلے کا حل کیا ہے وہ نوآزاد ریاستوں کی قومیتی پالیسی کے سلسلے میں مددگار ثابت ہو رہا ہے۔

قومی برابری کا اصول

نوآبادیاتی نظام سے نوآزاد ممالک کو قومی مخاصمت اور قبائلی چپقلش ورثے میں ملے ہیں جنکی حوصلہ افزائی نہ صرف تقسیم کرو اور حکومت کرو کی پالیسی کی بنا پر ہوئی بلکہ مختلف قوموں، قومیتوں اور قبائل کی غیر متوازن اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی نشوونما سے ہوئی۔ قومی تعلقات کے حوالے سے سوشلسٹ خیال ریاستوں کے سامنے ایک بڑا مسئلہ قومی نابرابری کو ختم کر کے اولاً قانونی سطح پر بعد ازاں اقتصادی اور ثقافتی نشوونما کے حوالے سے زندگی کے تمام شعبوں میں مساوات کو قائم کرنا تھا۔

ایسی کثیر القومی ریاستوں میں جہاں قومیں تشکیل پا چکی ہیں یا تشکیل پذیری کے عمل سے گزر رہی ہیں (مثال کے طور پر برما) اس مسئلے کا حل قوموں کی آزادانہ تشکیل پذیری اور ان کے مابین دوستانہ تعلقات کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ ایسے ملک جہاں ابھی قومیں تشکیل پذیر نہیں ہوئیں (مثلاً انگولا، بینن، گنی اور استوائی افریقہ کے کچھ اور ممالک) یہ ضروری ہے کہ نسلی گروہوں اور مختلف فرقوں کے مابین مساوات قائم کرنے کے لئے اس اصول کو مستقل بنیادوں پر لاگو کیا جائے تاکہ قومی یکجہتی اور استحکام کا عمل تیز ہو اور ان تضادات کو حل کیا جائے جو کہ اس عمل کے دوران پیدا ہوئے۔

سوشلسٹ خیال ملکوں کی انقلابی، جمہوری پارٹیاں اپنی قومیتی پالیسی کیلئے قومی مساوات کے اس عمل کو ایک بنیادی جمہوری اصول کے طور پر مانتی ہیں تنزانیہ کے صدر جولیس نائریرے نے ۱۹۶۵ء میں ۱۹۶۵ء کے آئین کو مرتب کرنے والے

ایک کمیشن کے سامنے یہ کہا تھا "نسلی اور قبائلی بنیادوں پر کسی کو کسی پر کوئی ترجیح نہیں دی جائیگی "

" گروہی نفرتوں کی تشہیر نہیں کی جائیگی اور نہ ہی ایسی پالیسی کی تشہیر کی جائے گی جن سے کسی نسل، قبیلے، جنس یا مذہب کی تحقیر ہو"

یہ نقطہ نظر ان تمام سوشلسٹ خیال ریاستوں کے قوانین سے ظاہر ہوتا ہے جنہوں نے نوآبادیاتی قوانین کو کالعدم قرار دیدیا اور مقامی آبادی اور کچھ نسلی گروہوں کی ترجیحات ختم کرنے کے عمل کو مستحکم کیا قومیت، نسل، قبیلے کو پس پشت ڈال کر شہریوں کے مساویانہ حقوق کے اعلان کی ذمہ داری کو قبول کیا (انگولا کے دستور کا آرٹیکل ۱۸ بینن کے Constitution کا آرٹیکل ۱۳ اور جمہوری ریپبلک افغانستان کے آرٹیکل ۷ اس بات کی گواہی دیتا ہے) انگولا کے دستور کا آرٹیکل ۱۸ یہ کہتا ہے کہ "قانون کی نظر میں سب شہری برابر ہوں گے اور مساوی حقوق کے حقدار ہوں گے ۔ رنگ، نسل، نسلی گروہ، جنس، مذہب، جائے پیدائش، تعلیمی قابلیت یا معاشی اور سماجی رشتے سے ماورا یکساں فرائض کے حامل ہوں گے "۔

" مندرجہ بالا عوامل کی بنیاد پر اگر کسی شہری نے سماجی ہم آہنگی کو ختم کرنے یا ترجیحی یا امتیازی اور مراعاتی فضا قائم کرنے کی کوشش کی تو قانون کے مطابق اُسے سخت سزا دیجائے گی "۔

گنی کا ۱۹۸۲ء کا دستور واضح طور پر اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ نسلی امتیاز پر کوئی بھی پہلو قابل سزا ہے (آرٹیکل ۱۳) گنی کی ۱۹۶۵ء کی تعزیرات میں اس قسم کے جرائم کے لئے مخصوص شقیں رکھی گئی ہیں مثال کے طور پر شق نمبر ۱۰۹ کے تحت نسلی حوالے سے اس کا دائرہ کار عوامی جگہوں پر ان تمام اجلاس پر ہوتا ہے جس میں کسی نسل یا قبیلے کی ترجیحی بنیادوں پر تشہیر کی جائے یا تحریری طور پر اس قسم کی بات کی جائے ۔ کسی قسم

کی نسلی تشہیر کے لئے سزا ایک سال سے دس سال تک ہے ایسا شخص نہ تو انتخاب میں حصہ لے سکتا ہے، نہ کسی انتظامی عہدہ پر فائز ہو سکتا ہے۔ نہ سرپرست کے فرائض انجام دے سکتا ہے نہ ہی گواہی دے سکتا ہے اور نہ ہی ایک ماہر کے طور پر کسی جگہ پر فرائض انجام دے سکتا ہے (آرٹیکل ۱۱۱ اور ۱۱۲)

قومی برابری کا سب سے اہم عنصر تمام قوموں اور قومیتوں کی زبانوں کی قانونی اور حقیقی برابری ہے جو کہ کسی ایک کثیر القومی ریاست میں بولی جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کوئی سرکاری زبان نہیں ہے دوسرے یہ کہ تعلیمی اداروں میں آپ تعلیم مقامی زبانوں میں حاصل کر سکتے ہیں انہیں یہ مراعات بھی حاصل ہے کہ ابلاغ عامہ کے تمام ذرائع مثلاً کتابیں، رسالے، اخبارات، ریڈیو اور ٹیلیویژن حتیٰ کہ دفتری امور کو سرانجام دینے کے لئے وہ قومی زبان کو اظہار کا ذریعہ بنا سکتے ہیں۔

نوآزاد ریاستوں میں قومی سوال کے لئے زبان کا مسئلہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے اور یہ خاصا پیچیدہ ہے۔

کئی ایک ممالک میں کوئی قومی زبان موجود نہیں ہے بلکہ کئی قبائلی زبانیں اور بولیاں ہیں جنکا کوئی تحریری نظام نہیں ہے۔ استوائی افریقہ کے بہت سے ممالک میں یہ صورتحال اکثر دیکھنے میں آتی ہے کیونکہ وہاں نوآبادیاتی حکام نے قومی زبانوں کی قدرتی نشوونما کو روک دیا تھا۔ نوآبادیاتی طاقتوں نے ایسی زبان کو سرکاری زبان کے طور پر مسلط کر دیا اور قومی زبانوں کی ترقی کو ہر طرح سے روک دیا مثال کے طور پر مغربی اور استوائی افریقہ کی فرانسیسی نوآبادیوں میں افریقی زبانوں کا استعمال اسکولوں میں قانوناً ممنوع قرار دیدیا گیا۔ پرتگالی نوآبادیوں میں صرف ان افریقیوں کو مہذب شہری کا درجہ دیا جاتا تھا جو پرتگالی زبان بولتے تھے۔ گو برطانوی نوآبادیوں میں کئی ایک مقامی زبان کو رومن طرز پر لکھنے کے طریقے کو اپنایا گیا لیکن اس سے بھی قومی زبانوں کی تشکیل

کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں حقیقت تو یہ ہے کہ برطانوی حکام اور مشنریوں نے قبائلی بولیوں کو صحیح لکھنے کا فن رائج کیا جس سے وہاں زبانوں کی بنیاد پر انتشار پیدا ہوا۔

اس پالیسی کے نتیجے میں جب استوائی افریقہ کے ممالک کو آزادی ملی تو وہاں کوئی قومی زبان نہیں تھی جسکی وجہ سے اکثر ممالک نے نوآبادکاروں کی زبان کو قومی زبان کے طور پر اپنا لیا صرف چند ایک ممالک نے قومی زبانوں کو سرکاری زبان کا درجہ دیا (مثال کے طور پر الجزائر، مڈغاسکر اور تنزانیہ)

زبان کا یکساں ہونا قوم کی اہم خصوصیات میں سے ایک ہے۔ لینن نے کہا تھا کہ "زبان بنی نوع انسان کے درمیان رابطے کا ایک اہم وسیلہ ہے، ملکی منڈی پر قبضہ کرنے اور معاشی رابطے کی آزادی کے لئے زبان ایک اہم شرط ہے۔"

افریقی ممالک میں زبان کے مسئلے کی وجہ سے کئی ایک مباحث نے جنم لیا ہے کچھ سیاست داں اور قومی دانشور نوآبادیاتی دور کی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دینے پہ مُصر ہیں بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ اسے قومی زبان کا درجہ دے دیا جائے۔ نوآبادیاتی نظام کے نظریہ داں اس نظریہ کے داعی ہیں کیونکہ اس سے سامراجیوں کو نوآزاد ریاستوں میں اپنے نظریاتی اثرات کو مستحکم کرنے میں مدد ملے گی۔

لیکن دوسری طرف افریقی سیاسی رہنماؤں اور ترقی پسند دانشوروں کی اکثریت اس بات کی حمایت کرتی ہے کہ لوگوں کو اپنی ثقافت و زبان کی ترویج و ترقی کا پورا پورا حق ہے اس لئے کہ وہ قومی زبان کی حمایت کا دم بھرتے ہیں۔ دوسری طرف اس بارے میں بھی شک ہے کہ بیک وقت اُن سب زبانوں کی جو ایک علاقے میں بولی جاتی ہیں کی ترویج و ترقی ممکن ہے خواہ وہ کتنے چھوٹے قبیلے کی زبان کیوں نہ ہو۔ کیا اُن کا کوئی رسم الخط بنانا ممکن ہے؟ یا پھر وہ ذریعۂ تعلیم بن سکتی ھیں۔؟

قومی زبان کی تشکیل کا مسئلہ ایک طویل المدّت عمل ہے جس کے دوران ایک

جیسی قبائلی زبانیں مختلف معاشی وسماجی وجوہات کی بناء پر دوسری زبان کو پیچھے دھکیل دیتی ہیں اور اس طرح اُن کا دائرہ کار وسیع ہوجاتا ہے۔ ایک ریاست اس عمل میں مہمیز کا کام کرسکتی ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ جو زبان زیادہ وسیع پیمانے پر بولی جارہی ہے اُسکی حوصلہ افزائی کرے۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے ملک میں ہونے والی تبدیلیوں کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے جیسا کہ اُس ملک کی سرحدوں کے اندر ایک قوم کئی قومیں یا کئی ایک قومیتیں تشکیل پذیر ہورہی ہیں یا نہیں۔

ایک کثیر القومی ملک میں کسی ایک زبان کو زبردستی سرکاری زبان کا درجہ دینا ایک مراعات یافتہ نظام قائم کرنے کے مترادف ہے۔ جس سے قومی عدم مساوات جنم لیتی ہے۔ اصولاً اس سے قومی منافرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ لینن کے کہنے کے مطابق جبری طور پر لاگو کی گئی سرکاری زبان کے لیے تشدد اور ڈنڈے کا استعمال ضروری ہے اور لازمی طور پر اسکا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے آپس میں مخاصمت شدید ہوجاتی ہے، لاکھوں قسم کی کدورتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں اور باہمی ناراضگی جنم لیتی ہے۔

ایک سرکاری زبان کو اس طرح لاگو کرنے سے نہ ہی اُسکا دائرہ کار وسیع ہوگا اور نہ ہی یہ مختلف قومیتوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنے گی۔ لیکن اگر رضاکارانہ طور پر ایک زبان قومی زبان کے طور پر اپنائی جائے تو اُس سے قبائلی قومیتیں اور مخاصمتیں پیدا نہیں ہوں گی۔

یہ سمجھتے ہوئے کہ یورپی زبانیں عرصہ دراز تک مختلف نسلی گروہوں کے مابین رابطے کا ذریعہ رہیں گی اور یہ کہ قومی زبان کی تشکیل پذیری میں ایک مدت درکار ہوتی ہے، بہت سے ترقی پسند اہلکار اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ نو آزاد ریاستوں میں بیک وقت لسانی کثرت کی پالیسی کو اپنا لینا چاہیئے۔

سوویت یونین جہاں کہ سو سے زیادہ قومیتیں آباد ہیں کسی زبان کو بھی سرکاری

زبان کا درجہ حاصل نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کوئی ایسی زبان نہیں ہے جسے اسکولوں، ریاستی امور، اقتصادی اور دوسرے اداروں میں لازمی طور پر سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہو۔ اپنے قیام کے فوراً بعد سوویت ریاست نے تمام زبانوں کی برابری کے حق کو تسلیم کرلیا اور وہاں کسی بھی ریاست کے شہریوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی بھی جبر کے بغیر اپنے بچّے کو اپنی خواہش کے مطابق کسی بھی زبان میں تعلیم دلوائیں اور اس مد کو روسی آئین کا حصّہ بنا لیا گیا ہے جیسے کہ ۱۹۱۸ء میں اپنا لیا گیا تھا۔ بعدازاں اس کو ۱۹۷۷ء میں سوویت آئین کی شق ۳۶ اور ۴۵ کی رُو سے مزید تقویت دی گئی۔ چالیس سے زیادہ قومیتیں جن کا اکتوبر سوشلسٹ انقلاب سے پہلے کوئی رسم الخط نہ تھا اب اُن کا سائنسی بنیادوں پر قائم شدہ تحریری نظام موجود ہے اور ان زبانوں میں اب ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ نتیجۃً وہ قومیتیں اب اپنی زبان میں لکھ پڑھ سکتی ہیں اور اس بنیاد پر اپنی ثقافت کو آگے بڑھا سکتی ہیں۔

زبانوں کی برابری کے اس ماحول میں روسی زبان رابطے کی ایک زبان کے طور پر اُبھر کر سامنے آئی۔ اس زبان نے قوموں کے درمیان رشتوں کو اور مضبوط کیا۔ آج سوویت یونین کے اندر ۸۲٪ آبادی روسی زبان روانی سے بولتی ہے۔

تجربے سے یہ پتہ چلا ہے کہ ایسی سوشلسٹ خیال ملک جن کی حکومتیں مقامی زبانوں کے مطالعہ اور ترویج کے لئے خاصا کام کر رہی ہیں انہوں نے سوویت یونین کے تجربے سے فائدہ اٹھایا ہے بہت سی زبانیں ضبط تحریر میں لائی جا رہی ہیں جنہیں اسکولوں میں ذریعہ تعلیم بنا کر بالغ آبادی میں خواندگی کو متعارف کرایا جا رہا ہے۔ مثلاً گنی میں آٹھ بنیادی زبانوں کے لئے تحریری نظام وضع کیا گیا ہے۔ ان زبانوں میں نصابی کتابوں کے ایڈیشن اور مطالعہ سے متعلق دوسری ہدایات شائع ہوئی ہیں اور انہیں عدالتی زبان کے طور پر بھی اپنا لیا گیا ہے۔ تنزانیہ میں تعلیم

سواحلی زبان میں دی جاتی ہے۔ کتابیں و اخبارات بھی اسی زبان میں شائع ہوتے ہیں حتیٰ کہ ملکی قوانین بھی اسی زبان میں مرتب کیے جاتے ہیں۔ انگولا میں قومی اور غیر ملکی زبانوں کا ادارہ قائم کیا گیا ہے اور اسی طرح ایتھوپیا میں نسلی مطالعے کا ادارہ قائم کیا گیا ہے۔

زبانوں کی برابری کے اصول کو کئی ایک انقلابی جمہوری پارٹیوں نے اپنے پروگرام کا حصّہ بنا لیا ہے۔ ۱۲ فروری ۱۹۶۲ء کو برما کی انقلابی کونسل کے ایک بیان کے مطابق ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قومی زبان، قومی ادب اور قومی ثقافت کے مسائل خود حل کرے۔ اس اصول کو آئینی تحفظ حاصل ہے۔ برما کے آئین کے آرٹیکل ۲۱ کے مطابق تمام قومیتوں کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنی زبان، ادب اور ثقافت کی ترویج کریں۔ بینن کے آئین کی دفعہ ۳ کے مطابق تمام قومیتوں کو بولی اور لکھی جانے والی زبانیں استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔

کئی ایک نو آزاد ریاستوں میں مذہب قومی روابط کی ترقی میں رکاوٹ بنا ہے۔ کیونکہ نو آبادیاتی حکام مذہبی فرقہ واریت کو ہوا دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے مذہبی و نسلی فسادات شروع ہو جاتے۔ قومی روابط پر مذہب کے اثرات کم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مذہبی عبادت کی آزادی ہو اور مذہبی بنیاد پر ہر قسم کے فرق کو غیر قانونی قرار دے دیا جائے۔ کیونکہ جب کوئی ریاست کسی ایک مذہب کو زیادہ مراعات دیتی ہے تو اُس مذہب کو ماننے والے افراد اُس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس لئے ذہنی آزادی کے لئے یہ ضروری ہے کہ عبادت گاہوں اور ریاست کو علیحدہ علیحدہ کر دیا جائے۔

کثیر النسلی سوشلسٹ خیال ریاستوں میں چرچ اور ریاست جُدا جُدا ہیں۔ ریاست کے سیکولر نظام کے لئے واضح آئینی دفعات ہیں (جیسا کہ بینن کے آئین

کی دفعہ I اور کانگو کے آئین کی دفعہ I) کچھ بنیادی قوانین ریاست اور چرچ کو علیحدہ کرتے ہیں (جیسا کہ انگولا اور ساؤتومی اور پرنسیپی کے آئینی قوانین)

یہ بنیادی قوانین شہریوں کو ذہنی و مذہبی آزادی عطا کرتے ہیں اور مذہب کی بنیاد پر کسی تفریق کی ممانعت کرتے ہیں۔ (گنی کے آئین کی دفعہ ۸، موزمبیق کے آئین کی دفعہ ۳۳، بینن کے آئین کی دفعہ ۱۲ اور ۱۲۱) بینن کے آئین کی دفعہ ۱۲ خصوصی اہمیت کی حامل ہے، " بینن عوامی ری پبلک کسی مذہب کا پیرو کار ہونا یا کسی مذہب کی پابندی یا آزادی، ہر شخص کا ذاتی مسئلہ ہے، جس کی طرف بینن انقلاب کا رویہ غیر جانبدارانہ ہے، تاوقتیکہ یہ مذہبی جذبات ری پبلک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں"۔

مذہبی اثرات کو قومی تعلقات کے حوالے سے کم کرنے کے لیے آئین میں ایسی دفعات رکھی گئی ہیں جس میں مذہب اور چرچ کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کی ممانعت ہے اور مذہبی بنیاد پر سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کے قیام کی اجازت نہیں ہے۔ برما کے آئین کی دفعہ ۱۵۶ کے مطابق مذہب اور مذہبی ادارے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیے جا سکتے۔ افغانستان کے عبوری آئین کی دفعہ ۵ میں بھی اسی قسم کی شق رکھی گئی ہے۔

قانون کی نظر میں تمام شہریوں کا ایک ہونا قبائلی، قومی یا نسلی بنیاد پر فرق کی ممانعت، زبانوں کی برابری اور ذہنی آزادی قومی سوال کو حل کرنے کے لیے ضروری عوامل میں سے ہیں لیکن مسئلے کا اصل حل یہ ہے کہ ایک کثیر القومی ریاست میں تمام عوام کو معاشی، سماجی، سیاسی، ثقافتی برابری حاصل ہو۔ نوآبادیاتی دور کے نتیجے میں نوآزاد ریاستوں میں نسلی گروہوں اور فرقوں میں عدم مساوات دیکھنے میں آتی ہے اس کی بڑی وجہ نوآبادیاتی ممالک میں غیر مساویانہ سماجی و اقتصادی

ترقی ہے۔

سامراجیوں نے استحصال کے لئے واضح طور پر ملک کو دو حصوں میں بانٹا ہوا تھا، ایک مرکزی علاقہ اور دوسرے دور دراز علاقے، اجارہ داروں نے اُن علاقوں کی ترقی پر زیادہ توجہ دی جہاں کی مٹی زیادہ زرخیز تھی معدنی ذخائر زیادہ تھے اور آبی ذخائر کی بھی کمی نہ تھی۔ وہاں پر انہوں نے کانیں کھودیں، سڑکیں بنائیں اور کاشتکاری کے لئے وسیع علاقے تیار کئے ان مرکزی علاقوں میں گو یہ عمل دراست تھا مگر پھر بھی محنت بس سرمایہ دارانہ تعلقات قائم ہوئے اور محنت کش بورژوا طبقے نے جنم لیا۔ باقی ماندہ ملک کے ذخائر کو محفوظ کر لیا گیا تاکہ بعد ازاں اُن سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ دور دراز علاقوں کو مرکزی علاقوں سے دور رکھا گیا اور اس علیحدگی کو نو آبادیاتی انتظامی نظام کی بناء پر قائم رکھا گیا (مثال کے طور پر برما کو دو حصوں میں یعنی اصل برما اور سرحدی علاقے جن میں زیادہ تر غیر برمی لوگ آباد تھے) اس نظام کے تحت روائتی جاگیردارانہ اور قبائلی اداروں اور قبل از سرمایہ داری کے متروک معاشی نظام کو دور دراز علاقوں میں برقرار رہنے دیا گیا۔

سماجی، معاشی اور ثقافتی ترقی کا مرکزی اور دور دراز علاقوں میں تفاوت عدم مساوات کا اصل ذمہ دار تھا۔ کچھ سرمایہ دار خیال ریاستوں میں آزادی کے بعد بھی زیادہ ترقی یافتہ نسلی گروہ سیاست اور معیشت پر قابض ہو گئے (جیسا کہ کینیا میں کے کوبیو اور رلؤ، گیون میں فانگ نسل کے لوگ)۔

نو آبادیاتی ورثہ کا اثر بعض سوشلسٹ خیال کثیر انسل ممالک میں بھی قائم رہا۔ گو وہاں پر ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ اقوام کو قانونی برابری حاصل ہے۔ لیکن پھر بھی انہیں حقیقی برابری حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ اُن میں سے بعض نے تو وہاں ہونے والی سماجی و معاشی اور سیاسی اصلاحات سے بھرپور فائدہ

اٹھایا ہے ۔ جبکہ دوسروں کے لیے مواقع محدود تھے (مثلاً ریاست کے انتظامی، پیداواری وثقافتی معاملات کے لیے تعلیم یافتہ افراد کی ضرورت ہوتی ہے ۔ قانون کی نظر میں ہر شہری کو خواہ وہ کسی قومیت سے تعلق رکھتا ہو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی بھی حکومتی عہدے پہ فائز ہوسکے ۔ (مڈغاسکر کے آئین کی دفعہ ۲۶) لیکن حقیقت میں وہ نسلی گروہ زیادہ مراعات حاصل کرتا ہے جس کی خواندگی کی شرح زیادہ ہے اور ان کے ہاں تربیت یافتہ افراد کی کمی نہیں ہے ۔

سوشلسٹ خیال ریاستیں نوآبادیاتی ورثہ میں ملی ہوئی اس نابرابری کو ختم کرنے کے لیے اقدامات اٹھا رہی ہیں تاکہ ایک کثیر القومی ریاست میں ریاست کی تشکیل نو کے لیے تمام اقوام کے لوگ برابر حصہ لے سکیں ۔ سرمایہ دار ممالک کی پارٹیوں کے برعکس انقلابی جمہوری پارٹیاں اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ قومی مسئلے کا حل صرف قانونی برابری تک محدود نہیں ہے بلکہ حقیقی برابری قائم کرنے کے لیے پسماندہ اقوام کے سماجی معاشی وثقافتی سطح کو زیادہ ترقی یافتہ اقوام کی مدد سے برابری کی سطح پہ لانا ہوگا برما کے سوشلسٹ پروگرام میں اس پر خصوصی توجہ دی گئی ہے ۔ سوشلسٹ پروگرام پارٹی کے چیئرمین نیون نے ۱۹۶۴ء میں کہا تھا کہ اُسوقت معاشی وسماجی سطح پہ برما میں بسنے والے عوام کے درمیان بہت تفاوت تھا ۔ اس کو دور کرنا اسوقت کی اہم ضرورت ہے ۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس سلسلے میں زیادہ ترقی یافتہ لوگوں کو کم ترقی یافتہ لوگوں کی مدد کرنے کے لیے چند مراعات سے محروم ہونا پڑے گا ۔

کچھ سوشلسٹ خیال ریاستوں کے پروگرام میں اسکو تحفظ دیا گیا ہے مثلاً بینن کے آئین کی دفعہ ۳ کے مطابق کم ترقی یافتہ علاقوں میں رہنے والی قومیتوں کو قومی معاشی وثقافتی سطح پہ لانے کے لیے حکومت فعال کردار ادا کرے گی ۔ افغانستان کا عبوری آئین کہتا ہے کہ ریاست تمام عوام اور قبائل خواہ وہ چھوٹے بڑے ہوں کے

مابین دوستی اور برابری قائم کرے گی اور ان کی ترقی پہ یکساں نظر رکھے گی۔
ریاست کا مقصد یہ بھی ہے کہ معاشی سماجی وثقافتی سطح پہ ملک کے تمام علاقوں کے مابین نابرابری کو ختم کیا جائے۔ دوردراز علاقوں میں جہاں پہلے کچھ نہیں تھا سڑکیں بنائی جارہی ہیں اور صنعتیں لگائی جارہی ہیں۔ وہاں ہسپتالوں میں توسیع کی جارہی ہے اور ثقافتی ادارے متعارف کروائے جارہے ہیں۔ گنی کی حکومت نے جنگل کے علاقے میں اس قسم کی پالیسی اپنائی ہے جہاں زیادہ تر گریز، کسی، کرانکو اور دوسری نسل کے لوگ آباد ہیں۔ بینن میں یہی کام موسی گروتی نسل کے لوگوں کے لئے ہوا۔ بینن کے پہلے تین سالہ منصوبے (۱۹۷۰ - ۱۹۸۰ء) میں شمالی علاقہ جات کی پسماندگی دور کرنے کے لئے جامع پروگرام رکھا گیا اسی طرح کانگو کے سماجی ومعاشی ترقیاتی منصوبوں میں تمام ملک کو ایک سطح پہ لانے کے لئے اور خصوصاً شمالی پسماندہ علاقوں کے لئے خصوصی پروگرام بنایا گیا۔ الجزائری حکومت نے ملک کی پسماندہ اور ترقی یافتہ علاقوں میں تقسیم ختم کرنے کے لئے کئی ایک اقدامات اٹھائے تاکہ امیر الجزائر اور غریب الجزائر کا تفاوت ختم ہو۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں قبائلی علاقوں جہاں بربر آباد تھے کی ترقی کے لئے خاص منصوبے بنائے گئے اور صنعت وزراعت وصحت اور تعلیم کی مد میں زیادہ سے زیادہ رقومات دی گئیں۔ برما میں تومینتوں کے لئے ایک اکادمی کھولی گئی تاکہ زراعت وملکی نظم ونسق اور تعلیم کے لئے انہیں تربیت دی جاسکے۔ سوشلسٹ خیال کثیر النسل ریاستوں میں قانونی وحقیقی برابری کو قائم کرنے کے لئے ملک کے تمام علاقوں کی متناسب ترقی کے لئے دفعات رکھی گئیں (بینن کے آئین کی دفعہ ۱۷ الجیریا کے آئین کی دفعہ ۲۲۔ مڈغاسکر کے آئین کی دفعہ ۷)
یہ تمام اقدامات نسلی گروہوں کے درمیان عدم مساوات ختم کرنے کے لئے ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں اور ایسی صورتحال پیدا کرتے ہیں جہاں ان کے درمیان دوستانہ تعلقات

قائم ہوں اور عدم اعتماد اور شک و شبہ کی فضا ختم ہو۔

قومی سوال کو حل کرنے کا بنیادی طریقہ کار یہ ہے کہ قومی برابری کے اصول کو مستقلاً عمل پذیر کیا جائے لیکن کچھ ممالک میں جہاں آبادی میں نسلی تناسب بہت پیچیدہ ہے اور تنازعات بہت شدید ہیں اور جہاں اسکی وجہ سے ریاست کے وجود کو خطرہ ہے وہاں حالات کو معمول پہ لانے کے لئے اور قومی تعلقات کو بحال کرنے کیلئے دوسرے طریقہ ہائے کار متعارف کرانے پڑے ہیں۔ ان حالات میں ایسے ریاستی اور قانونی اقدامات اٹھانے پڑتے ہیں جنکی وجہ سے وفاقی نظام یا قومی و علاقائی خود مختاری قائم کرنا پڑتی ہے۔

فیڈریشن اور قومی، علاقائی خود مختاری

مستقل بنیادوں پر قومی برابری کے اصول کا عملی نفاذ ہی قومی سوال کے حل کا بنیادی طریقہ کار ہے۔ لیکن کچھ ممالک میں آبادی کے پیچیدہ نسلی تناسب ethnic patterns کی موجودگی میں جہاں قومی تضادات شدت اختیار کر لیتے ہیں اور ریاست کی بقا اور سالمیت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے، وہاں قوموں کے درمیان تعلقات کو معمول پر لانے کے لئے "فیڈریشن اور قومی علاقائی خود مختاری" کا طریقہ کار ایک اہم کردار انجام دیتا ہے۔

سوشلسٹ راہ اختیار کرنے والے بیشتر ممالک میں وحدانی نظام unitary system حکومت رائج ہے۔ ان ممالک کے بعض سیاستدان اور سربراہان مملکت مرکزی واحدانیت centralized unitariaium کے حق میں اس لئے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرز کے ریاستی ڈھانچے ہی میں قبائلیت اور جاگیردارانہ باقیات کا مکمل خاتمہ ممکن ہے اور مختلف قبائل اور قومیتوں کے اتحاد کے ذریعے ہی ایک مضبوط قوم وجود میں آسکتی ہے۔

بہر کیف جیساکہ اُوپر بیان کیا جا چکا ہے، قومی سوال کا مستقل جمہوری حل اس بات میں پنہاں ہے کہ ہر قوم اور قومیت کے آزادانہ حق خودارادیت کو تسلیم کرلیا جائے۔ بالفاظ دیگر ہر قوم یا قومیت کو اس بات کا حق دیا جائے کہ وہ اپنے قومی مفادات کی خاطر دیگر قوموں کے ساتھ متحدہ طور پر ایک ریاست میں رہیں یا رضاکارانہ الحاق کی بنیاد پر وفاقی طرز کی ریاست تشکیل دیں یا خودمختاری کے اصول کو اپنائیں یا پھر مکمل علیحدگی اختیار کرتے ہوئے آزاد قومی ریاست تشکیل دیں۔ ایشیاء اور افریقہ کی بعض کثیرالاقوامی ریاستوں کے تجربات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قوموں کے حق خودارادیت کو تسلیم نہ کرتے ہوئے جب فیڈریشن اور خودمختاری کے نظام کو قومی سوال کے حل کے طور پر رائج کیا جائے تو بعض اوقات قومی تضادات مزید پیچیدہ ہو کر علیحدگی پسندی اور علاقایت پرستی کی تحریکوں کو جنم دیتے ہیں۔

یہ مسئلہ کہ حق خودارادیت کا عملی نفاذ کس طرح ہو، کسی بھی کثیرالاقومی ریاست کے تاریخی پس منظر اور موجودہ حالات یعنی قوموں کے درمیان تعلقات کی نوعیت سیاسی اور اقتصادی صورتحال اور دیگر محرکات پر منحصر ہے۔ مثلاً حق علیحدگی کے اصول کو تسلیم کرنے کا یہ مطلب قطعی نہ لیا جائے کہ ہر قوم یا قومیت ہر حال میں علیحدگی اختیار کرے۔ بلکہ ہر مخصوص صورت حال میں قومی سوال ہمیشہ سماجی ترقی کے لئے جدوجہد کے ساتھ وابستہ رہنا چاہیئے۔

قومی سوال کے جمہوری حل اور حق خودارادیت (بشمول حق علیحدگی) کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے ہمارے ذہن میں یہ بات واضح طور پر موجود رہنی چاہیئے کہ رجعتی قوتیں اس سوال کے ناجائز استعمال سے سماجی ترقی کے راستے میں رکاوٹ بھی پیدا کر سکتی ہیں۔ اس بات کا واضح ثبوت سامراج کی ایماء پر چلنے والی رجعتی علیحدگی پسند تحریکیں ہیں جو سوشلسٹ راہ اختیار کرنے والے ممالک (برما، ایتھوپیا، انگولا)

اور سرمایہ دارانہ راستے پر گامزن ممالک (ہندوستان، نائیجریا) میں چلیں۔

آج ایتھوپیا کے مختلف علاقوں Eriteria, Ogaden میں رجعتی علیحدگی پسند تحریکیں سرگرمی سے موجود ہیں جن کی پشت پناہی سامراجی قوتیں اور افریقہ کی رجعتی حکومتیں کر رہی ہیں۔ جس کا واحد مقصد ایتھوپیا کی تقسیم کے ذریعے قومی جمہوری انقلاب کے حاصلات کو تباہ کرنا ہے تاکہ پانچ یا چھ چھوٹی چھوٹی ایسی آزاد ریاستیں وجود میں آئیں جو مکمل طور پر سامراج کی دست نگر ہوں۔

سوشلسٹ راہ پر گامزن ریاست میں فیڈریشن اور خود مختاری قومی سوال کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں اگر اس کی بنیاد نئے تنظیمی اور سیاسی اصولوں پر مبنی ہو۔ سب سے پہلے تو یہ کہ کثیر الاقوامی ریاست میں وفاق کی تشکیل قومی بنیادوں پر ہو جس کے معنی یہ ہوئے کہ قومی ریاستوں کو فیڈریشن کا ممبر سمجھا جائے۔ پہلی بار یہ اصول سوویت یونین میں ۱۹۲۲ء میں نافذ العمل ہوا۔ سوویت یونین کی پندرہ ریاستیں یوکرینی، بیلوروسی، ازبک اور دیگر قومی ریاستیں ہیں جن کا نام ان کی اکثریتی آبادی والی قوموں ہی کے نام سے منسوب ہے۔

دوسرا اہم اصول یہ ہے کہ قومیں، قومیتیں رضاکارانہ طور پر فیڈریشن میں شامل ہوں۔ فیڈریشن میں شمولیت کے بعد ممبر ریاست اپنے کچھ حقوق سے رضاکارانہ طور پر دست بردار ہوجاتی ہے۔ مثلاً بیرونی تجارت، نظام زر، قرضے کا نظام اور دفاع وغیرہ۔ مندرجہ بالا حقوق کا فیصلہ رضاکارانہ طریقہ کار کے علاوہ بعض اوقات مرکزی طور پر وفاقی ڈھانچہ بھی کرتا ہے جس طرح کہ کچھ سرمایہ دار وفاقی ریاستوں میں ہوا ہے لیکن اس کے برعکس سوشلسٹ فیڈریشن میں رضاکارانہ اصول ہی قابل قبول ہے۔ دنیا کی پہلی سوشلسٹ فیڈریشن سوویت یونین ۱۹۲۲ء میں ایک معاہدے کے تحت قائم ہوئی۔ معاہدے کی بنیاد رضاکارانہ اصول پر مبنی تھی جس کی آئینی ضمانت

آج بھی موجود ہے ۔ سوویت یونین ۱۹۷۷ء کے آئین کی شق نمبر ۷۰ کے مطابق سوویت یونین ایک واحد وفاقی کثیر الاقوامی ریاست ہے جو آزاد قومی حق خود ارادیت اور مساوی سوویت سوشلسٹ ری پبلکس کے رضاکارانہ الحاق کے نتیجے میں وجود میں آئی ۔ رضاکارانہ الحاق اس بات کی ضمانت ہے کہ فیڈریشن سے علیحدگی کا حق تسلیم کر لیا گیا ہے ۔ یہ بات واضح ہونی چاہیئے کہ علیحدگی کے حق کو تسلیم کرنا اور علیحدگی پسندی دو مختلف باتیں ہیں ۔ مثال کے طور پر برما کے ۱۹۴۷ء کے آئین نے دو قومی ریاستوں (Shan, Kai) کو حق علیحدگی کے استعمال کا موقع فراہم کیا لیکن رجعتی جاگیرداروں نے جو سامراج کے ساتھ ملے ہوئے تھے اس ترقی پسندانہ اصول کو اپنے ذاتی مفادات کے لئے استعمال کیا ۔ اور قومی اقلیتوں کے حقوق و مفادات کے برخلاف اپنی مراعات کو وسعت اور تحفظ دینے کی کوشش کی جس سے دونوں آزاد خود مختار ریاستوں کے قومی مفادات اور سماجی ترقی کو شدید نقصان پہنچا ۔

تیسری اہم بات جو اس نئی طرز کی فیڈریشن کے لئے انتہائی ضروری ہے وہ ہے فیڈریشن میں شامل ممبر ریاستوں کے مساوی حقوق کا اصول ۔ علاقائی حدود کی وسعت ، آبادی اور سماجی اقتصادی ترقی کی سطح سے قطع نظر فیڈریشن میں شامل ممبر ریاست کے حقوق مساوی بنیادوں پر استوار ہوں ۔ مساوات کے اصول کے عملی نفاذ کو مختلف قانونی ذرائع سے ممکن بنایا جا سکتا ہے ۔ مثلاً ایسے اداروں کا قیام جس میں یکساں شرکت کے مواقع فراہم ہوں ۔ یعنی وفاقی ڈھانچے کا قیام اور سرگرمیاں ، ریاستی انتظامیہ ، عدلیہ کا نظام ، قومیتوں کی مجلس house of nationalities اور دیگر حکومتی امور میں برابری کی بنیادوں پر شرکت لازمی ہو ۔ سوویت یونین میں ریاستوں کے اختیارات مساوی طور پر تقسیم ہیں ، ہر ریاست اپنے عوام کو شہریت دینے کا اختیار خود رکھتی ہے اور کسی بھی ریاست کی سرحدوں میں تبدیلی اُس کی مرضی کے بغیر ممکن

نہیں۔ سوویت یونین کی سپریم سوویت میں قومیتوں کی سوویت کے لئے نمائندوں کا چناؤ اور اُن کی تعداد تمام ریاستوں کے لئے یکساں ہے اور اس کے علاوہ وفاقی ڈھانچے (سپریم سوویٹ کی پریذیڈیم، وزارتی کونسل اور سپریم کورٹ) میں ہر ریاست اپنے نمائندے برابری کی بنیاد پر بھیجتی ہے۔

جہاں تک فیڈریشن میں مساوات کا سوال ہے تو یہ بات ذہن میں واضح رہے کہ مساوات صرف قانونی نہیں بلکہ حقیقی ہونی چاہئے۔ ترقی یافتہ قوموں کو پسماندہ قوموں کی اقتصادی اور سماجی میدانوں میں بھرپور مدد کرنی چاہئے۔ سوویت یونین میں پسماندہ قوموں کی ترقی اس سلسلے میں ایک واضح مثال ہے۔ یہ سب کچھ صرف اس لئے نتیجہ خیز ثابت ہوا کیونکہ سوویت یونین نے پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لئے خصوصی پالیسیاں مرتب کیں اور مستقل مزاجی سے اُن پر گامزن رہا جبکہ ان پسماندہ علاقوں میں ایسے علاقے بھی شامل تھے جہاں اکتوبر انقلاب کے وقت جاگیردارانہ سماج موجود تھا۔ آج سوویت یونین کی تمام قومیں اُبھر کر ترقی یافتہ سوشلسٹ قوموں کی سطح تک پہنچ گئی ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق ۱۹۱۳ء سے ۱۹۷۷ء تک سوویت یونین کی مجموعی صنعتی پیداوار میں ۱۴۵ گنا اضافہ ہوا جبکہ صرف قازقستان میں ۲۲۷ گنا اور کرغزیا میں ۳۱۶ گنا اضافہ ہوا۔

اس نئی طرز کی فیڈریشن میں جمہوری مرکزیت ایک اہم کردار بنتا ہے۔ جمہوری مرکزیت فیڈریشن کے منافی نہیں بلکہ عین اس کے موافق ہوتا ہے۔ لینن کہتا ہے کہ "فیڈریشن میں اگر اقتصادی نقطہ نظر اور اہم قومی مفادات جس میں ریاستی آزادی کا پہلو بھی کسی حد تک شامل ہو مشترک ہوں تو پھر اس صورت میں فیڈریشن اور جمہوری مرکزیت کے درمیان کوئی تضاد نہیں بنتا"۔

سوشلسٹ راہ اختیار کرنے والے ممالک میں جمہوری مرکزیت کا اصول ایک لازمی جُزو ہے۔ فیڈریشن میں جمہوری مرکزیت وفاقی انتظامیہ کے بنیادی شعبوں

(اقتصادیات، دفاع وغیرہ) میں مرکزیت کے اصول کو لاگو کرتی ہے اور اس کیساتھ ساتھ ان شعبوں کی پالیسی سازی کے عمل میں ممبر ریاستوں کی بھرپور آزادانہ شرکت کو لازمی قرار دیتی ہے۔ اس اصول کا بھرپور اظہار مرکز اور ممبر ریاستوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم، وفاقی ڈھانچے، انتظامیہ اور ریاستوں کے اختیاراتی اداروں کے دو مساویانہ رشتے سے ہوتا ہے۔

فیڈریشن کا قیام جب حق خود ارادیت، رضاکارانہ الحاق، مساوات اور جمہوری مرکزیت کے اصولوں پر مبنی ہو تو قوموں اور قومیتوں کے آپس کے دوستانہ تعلقات اور سماجی اقتصادی اور ثقافتی ترقی کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

کثیر القومی ملک سوویت یونین کی ۶۰ سالہ مختصر تاریخ میں مضبوط قومی ریاستوں کی تشکیل اس بات کا واضح ثبوت ہے۔

اُن نو آزاد کثیر القومی ممالک میں جہاں قومی تضادات شدت اختیار کر چکے ہوں اور ریاست کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو، وہاں اس نئی طرز کی فیڈریشن ریاست کو متحد رکھنے میں، قوموں اور قومیتوں کے درمیان دوستانہ تعلقات استوار کرنے اور سماجی اقتصادی ترقی میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ نو آبادیاتی دور میں تقسیم شدہ قوموں کو دوبارہ متحد کرنے میں بھی فیڈریشن کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی مثال تنزانیہ ہے۔ تنزانیہ کی انقلابی جمہوری فیڈریشن کے بعض پہلو تو ایسے بھی ہیں جن کا سوشلسٹ یا سرمایہ دارانہ فیڈریشن کے اصولوں سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ بہرکیف جو بھی خصوصی اصول اس فیڈریشن کی ممبر ریاستوں کے

Tanganyka (Mainland Tanzania)

. Pumba and Zanzibar(Island Tazania) اور

نے اپنائے ہوئے ہیں وہ جمہوری بنیادوں پر ہی قائم ہوئے ہیں۔

تنزانیہ کی فیڈریشن دو سابقہ آزاد ریاستوں ۔

Republic of Tanganyka اور People Republic of Zanzibar and Pumba

کے رضاکارانہ الحاق کے نتیجے میں وجود میں آئی ۔ ۲۶ اپریل ۱۹۶۴ء میں ان ریاستوں کے اعلیٰ قانون ساز اداروں Supreme legistative bodies نے فیڈریشن کو قانونی شکل دیدی ۔ اس نئی وفاقی ریاست کا وجود میں آنا دراصل ان دونوں ریاستوں کے عوام کی سوشلسٹ معاشرے کی تشکیل کے لئے جدوجہد کا نتیجہ تھا ۔ بہرحال یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نہ تو ۱۹۶۵ء کے آئین میں اور نہ ہی موجودہ ۱۹۷۷ء کے آئین میں فیڈریشن سے علیحدگی کے حق کی ضمانت موجود ہے ۔

آئین میں وفاقی ریاست کی مد میں داخلی اور خارجی پالیسی کے اہم مسائل ، آئین میں ترمیم ، بیرونی تعلقات ، دفاع ، شہریت ، بیرونی تجارت ، ٹرانسپورٹ ، مواصلات ، نظام زر ، اعلیٰ تعلیم وغیرہ شامل ہیں ۔

تنزانیہ کی فیڈریشن کی انفرادیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کی ایک ممبر ریاست Zanzibar زیادہ مراعات یافتہ ہے یعنی کہ Mainland Tanzania کے مقابلے میں اس کو زیادہ اقتصادی و معاشی خود مختاری حاصل ہے ۔ اس کے پاس بجٹ اور منصوبہ بندی کا اپنا علیحدہ نظام موجود ہے ۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ریاستی اختیارات ، انتظامیہ ، عدلیہ کا نظام یہاں تک کہ اس ریاست کا اپنا آئین بھی موجود ہے ۔ جو ۱۹۷۹ء میں اپنایا گیا ۔ جبکہ Mainland Tanzania ۱۹۷۷ء کے وفاقی آئین اور وفاقی انتظامیہ ہی کے ماتحت ہے ۔ گو کہ ۱۹۷۸ء کے مردم شماری کے مطابق Mainland Tanzania کی آبادی ایک کروڑ ۷۵ لاکھ ہے جبکہ Island Tanzania کی آبادی ۴۷۵,۰۰۰ ہے ۔ لیکن وفاقی پارلیمان میں Island Tanzania کی نمائندگی ۴۳ سیٹوں

میں سے ۶۷ کی بنتی ہے جو کہ ٪ ۲۵ فیصد ہے۔ لیکن اس بات پر زور دینا انتہائی ضروری ہے کہ مرکزی ڈھانچہ مساوات کے اصولوں پر مبنی ہو۔ مثلاً دوبارہ ہم تنزانیہ کی مثال لیتے ہیں جہاں پر آئینی طور پر یہ بات موجود ہے کہ اگر United Republic of Tanzania کا صدر Mainland Tanzania ہے تو پھر نائب صدر ضروری ہے کہ Island Tanzania سے لیا جائے اور اسی طرح اس کے برعکس ہو۔ آئینی عدالت CONSTITUTIONAL COURT جو آئینی مسائل پر فیڈریشن کی ممبر ریاستوں کے درمیان اختلافات کو طے کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ کا قیام بھی مساوات کی بنیاد پر ہے یعنی ٪ ۵۰ فیصد جج United Republic of Tanzania کی جانب سے نامزد ہوتے ہیں اور باقی ٪ ۵۰ فیصد کو Zanzibar Govt نامزد کرتی ہے۔ مساوات کا اصول مختلف قوانین اخذ کرنے کے عمل میں بھی نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے۔ مثلاً تنزانیہ کے آئین میں ترمیم، یونائیٹڈ ریپبلک کی حیثیت سے متعلق بلوں کا پاس ہونا، یونائیٹڈ ریپبلک اور Zanzibar سے درمیان اختیارات کی تقسیم، تنزانیہ کے صدر کا دفتر، پارلیمان یا گورنمنٹ، اعلیٰ اختیاراتی ادارے، Zanzibar کی انتظامیہ اور عدلیہ غرض کہ ان تمام امور سے متعلق قوانین اسوقت تک اخذ نہیں ہو سکتے جب تک کہ پارلیمنٹ میں Mainland Tanzania کے ممبران ۲/۳ ووٹ اور اسی طرح سے Island Tanzania کے ممبران بھی ۲/۳ ووٹ نہیں دیتے۔ لہٰذا سیاسی تعلقات کے کچھ میدانوں میں تنزانیہ کی فیڈریشن کی ممبر ریاستیں برابری کے اصول پر چل رہی ہیں جبکہ کچھ معاملات میں Zanzibar کو خصوصی مراعات حاصل ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں اخذ کیا جا سکتا کہ

Zanzibar کی حیثیت فیڈریشن پر مسلط ہے ۔ موزوں آئینی مراعات Zanzibar کی خود مختار حیثیت کی ضمانت ہیں جس کی آبادی کا تناسب تنزانیہ کی کل آبادی کی ۳٪ فیصد سے بھی کم ہے ۔

قومی علاقائی خود مختاری بھی اُن ممالک میں ہیں کہ جن میں قومی مسئلہ پیچیدگی اختیار کر گیا ہو ، قومی سوال کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے ۔ قومی علاقائی خود مختاری واحدانی ریاستی ڈھانچے Unitary State کے ہوتے ہوئے خود اختیار حکومت Self government کو عملی شکل دیتی ہے ۔ اسکا عملی نفاذ ریاست کے اُن علاقوں میں ہوتا ہے جس میں منفرد انداز زندگی و نسلی ڈھانچہ اور کسی حد تک اقتصادی وحدت ۔
موجود ہو ۔ لہٰذا قومی علاقائی خود مختاری کے واضح طور پر دو مخصوص کردار بنتے ہیں ایک تو یہ کہ اس کا وجود اُس علاقے میں ممکن ہے جہاں کسی حد تک اقتصادی وحدت economic unity ہو اور دوسرا یہ کہ اس کی جغرافیائی تشکیل قومی بنیادوں پر ہو ۔ یعنی جہاں کی آبادی مخصوص زبان بولتی ہو اور ایک خاص انداز زندگی گزار رہی ہو ۔ خود مختار علاقوں میں ریاستی اختیاراتی ادارے انتظامیہ اور عدلیہ کی تشکیل مقامی افراد پر مشتمل ہو اور اس علاقے کی قومی بولی بولتے ہوں ۔ آئینی طور پر مرکزی ریاستی ڈھانچے میں قومی علاقائی خود مختاری کا اصول نافذ العمل ہو یعنی وفاقی حکومت اور پارلیمنٹ وغیرہ میں نمائندگی موجود ہو ۔

مختلف ممالک میں قومی خود مختاری کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں جس کا انحصار وہاں کی آبادی کی قومی ترتیب اور قوموں ، قومیتوں اور قبائل کے استحکام کی صورتحال پر ہوتا ہے ۔ سوویت یونین کی قومی نشوونما میں دو طرح کی خود مختاری نافذ العمل ہے یعنی سیاسی اور انتظامی سیاسی خود مختاری کا اظہار خود مختار علاقوں میں ہوتا

ہے یعنی خود مختار علاقوں اور خود مختار اضلاع کی تشکیل۔ سیاسی خود مختاری میں زیادہ حقوق حاصل ہوتے ہیں مثلاً آئین کی موجودگی اعلی ریاستی اختیاراتی ادارے، قانون سازی، اعلی عدالتیں اور حق شہریت۔ جبکہ انتظامی خود مختاری میں آئین شامل نہیں ہوتا اور مرکزی حکومت ہی خود مختار علاقے کی حیثیت کا تعین کرتی ہے۔

سوشلسٹ راہ اختیار کرنے والی کچھ ریاستوں میں جہاں قومی علاقائی خود مختاری جمہوری خطوط پر استوار کی گئی ہو وہاں یہ تبدیلی سیاسی اور سماجی مسائل کو جمہوری انداز میں حل کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس کی ایک مثال کثیر القومی ملک ایتھوپیا ہے جہاں مختلف قوموں اور قومیتوں سے تعلق رکھنے والے لوگ قومی استحکام سماجی اقتصادی صورتحال کی مختلف سطحوں اور زبان و مذہب کے حوالے سے منفرد انداز زندگی گزار رہے ہیں۔

ایتھوپیا اور زار شاہی روس بادشاہت اور جاگیردارانہ دور میں "قوموں کا قید خانہ" تھا۔ ایتھوپیا میں ملوکیت پسند حکومت کے دور میں حکمران طبقات کے مفادات کو تحفظ حاصل تھا جن پر مسلط اکثریتی گروہ نسلی اعتبار سے Amhaes تھے، قومی تنگ نظری کی پالیسی کو دیگر چھوٹی قوموں کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے روا رکھے ہوئے تھے۔ اس تنگ نظرانہ پالیسی کے باعث قومی تضادات شدت اختیار کر گئے اور مختلف علاقوں Ogaden, Eriteria میں قومی اقلیتوں نے مسلح کارروائیوں کا آغاز کیا۔ لہٰذا ایتھوپیا کی سوشلسٹ راہ اختیار کرنے والی ریاست کو جہاں ۱۹۷۴ء میں قومی جمہوری انقلاب برپا ہوا، پیچیدہ قومی مسئلہ وراثت میں ملا۔ نئی انقلابی حکومت کے نزدیک قومی سوال بنیادی اہمیت کا حامل تھا۔ ۱۹۷۶ء کی عبوری فوجی انتظامی کونسل نے قومی جمہوری انقلاب کے

تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے جو پروگرام مرتب کیا اُس میں قومی سوال کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ۔ اس سلسلے میں تمام قوموں اور قومیتوں کی علاقائی خودمختاری کی صورت میں حق خودارادیت تسلیم کر لی گئی ۔

خودمختاری کے دائرہ کار میں تمام قوموں اور قومیتوں کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اپنی سیاسی، اقتصادی اور سماجی امور اور خوداختیار حکومت کی تشکیل کے سلسلے میں خودمختار ہیں ۔ یہ بات واضح رہے کہ پروگرام میں نہ صرف حق خودارادیت کو تسلیم کیا گیا ہے بلکہ قانونی مساوات کے ساتھ ساتھ حقیقی مساوات پر بھی بہت زور دیا گیا ہے ۔ پروگرام میں کہا گیا ہے کہ سرحدی علاقوں میں مقیم قومیتوں کو عرصے سے غلاموں کا درجہ دیا گیا تھا جس کے باعث اُن کی ترقی بے حد متاثر ہوئی ہے لہٰذا اُن قومیتوں کی سماجی اقتصادی ترقی کے سلسلے میں خصوصی توجہ دی جائے گی تاوقتیکہ اُن کی ترقی کی سطح دیگر قوموں اور قومیتوں کے مساوی نہ آجائے ۔

مئی ۱۹۷۶ء میں عبوری فوجی حکومت نے ایریٹیریا کے مسئلہ کے پُرامن حل کے سلسلے میں اپنا پالیسی اعلان شائع کیا ہے ۔ اس اعلان میں ایتھوپیا کی تمام قوموں کی علاقائی خودمختاری کی صورت میں حق خودارادیت کی تصدیق کی گئی ۔ اعلان کے مطابق حکومت قومی حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں ملک کے تمام علاقوں اور قوموں کی تاریخ اور آپس کے تعلقات کا گہری نظر سے مطالعہ کرے گی اور دیگر تمام محرکات اور عوامی اُمنگوں کو مدنظر رکھتے ہوئے علاقوں کو ایک عملی ڈھانچہ فراہم کرے گی ۔

آئین کے شق نمبر ۳۱ کے مطابق برما کے ریاستی ڈھانچے میں کچھ ایسی خصوصیات نمایاں ہیں جو خودمختاری کے حوالے سے مثالی ہیں ۔ ملک کو سات قومی اور سات انتظامی علاقوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ قومی علاقوں کی حدبندی قومی بنیادوں پر

ان ضلعوں پر مشتمل ہے جہاں کی آبادی غیر برمی ہیں ۔ جبکہ انتظامی علاقے اصل برما کے خطے پر مشتمل ہیں ۔ قومی اور انتظامی علاقوں کی قانونی حیثیت یکساں ہے ۔ مقامی اُمور کے سلسلے میں علاقے خود مختار ہیں اور Council of state میں ہر علاقے کی نمائندگی مساوی بنیاد پر ہے اور کسی بھی علاقے کی سرحدوں میں تبدیلی اُس علاقے کی اکثریتی آبادی کی مرضی کے بغیر ممکن نہیں ۔

قومی علاقائی خود مختاری کی تشکیل ایسے ممالک میں بھی ممکن ہے جہاں ابھی تک قومی یکجہتی اور استحکام کا عمل مکمل نہیں ہو سکا ہے ۔ اور جہاں بعض قومیں اور قومیتیں بننے کا عمل ابھی تک ابتدائی مراحل میں ہے یا ان کے وجود میں آنے کے قوی امکانات موجود ہیں ۔ اس قسم کی صورت حال میں بھی قومی علاقائی خود مختاری قومی سوال کے حل کے سلسلے میں اہم کردار انجام دے سکتی ہے ۔

سخت مرکزیت صرف عبوری عرصے کے لئے ہی قابلِ قبول ہو سکتی ہے خصوصًا اُن ممالک میں جہاں قبائلی نظام موجود ہوں جو قبائلی وفاداریوں اور تنگ نظری کو جنم دیتا ہے ۔ اس صورت میں سخت عبوری مرکزیت کسی حد تک قبائلی علاقائیت پرستی اور علیحدگی پسندی کو ختم کرنے میں آسانیاں پیدا کرتی ہے ۔ لیکن بیک وقت اس کا نوکر شاہانہ طریقۂ استعمال منفی ردعمل بھی پیدا کر دیتا ہے اور مختلف نسلی گروہوں کے درمیان تضادات کو شدید بنا دیتا ہے جیسا کہ بعض افریقی ممالک کی مثالوں سے ظاہر ہے ۔ اور اس طرح قومی یکجہتی پیدا کرنے کے بجائے اس کو نقصان پہنچاتا ہے ۔ لینن کہتا ہے "مقامی (علاقائی، قومی اور دیگر) مسائل میں نوکر شاہانہ مداخلت درحقیقت اقتصادی اور سیاسی مسائل میں عمومی طور پر اور اہم بنیادی مرکزی مسائل میں خصوصی طور پر بہت بڑی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے ۔"

لہٰذا یہ قدرتی بات ہے کہ قومی سوال کے حل کا طریقہ کار طے کرتے وقت کہ کسی

خاص کثیر القومی مُلک کا ریاستی ڈھانچہ کس طرح سے تشکیل پائے، یہ بات نظر میں رکھنا انتہائی ضروری ہے کہ وہاں کی مکمل تاریخی نشوونما کا بغور مطالعہ کیا جائے۔
لیکن کسی بھی صورت میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ قومی سوال کا حل محنت کشوں کی جدوجہد کے ساتھ وابستہ رہے تاکہ قومی آزادی کے ساتھ ساتھ سماجی آزادی بھی حاصل ہوسکے۔

ترجمہ:- ظفر بلوچ
اشفاق سلیم مرزا

قومی سوال پر محنت کشوں کا موقف

ڈاکٹر ظفر عارف

آج تمام ترقی پذیر ریاستوں میں بشمول پاکستان دو بظاہر متضاد عملوں کا بیک وقت مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ۔ ایک جانب تو ان ممالک میں بین الاقوامی سرمائے کا نفوذ بڑھتا جا رہا ہے جو ان ممالک کو بین الاقوامی منڈی میں گھسیٹ کر ان کی محنت اور منڈی دونوں کو بین الاقوامیا رہا ہے دوسری جانب ان ممالک میں تنگ نظر، متعصب علاقائی و قومی تحریکیں سیاسی منظر پر سر اٹھا رہی ہیں ۔ اگر ہم صرف جنوبی ایشیا پر ہی نظر ڈالیں تو ہمیں یہ دونوں عمل صاف نظر آتے ہیں ۔ ایک جانب ان ممالک کے سرمایہ دار کثیر القومی اور ماورائے قومی کارپوریشنوں کے ساتھ اشتراک کر کے ان ممالک کے محنت کشوں کی پیدا کردہ قدر زائد کو بین الاقوامی استعمار کے سرمائے کے قدموں میں ڈالتے نظر آتے ہیں نیز خود بھی سرمائے کو اپنے ملک کی حدود سے باہر لگا کر خود بھی ماورائے قومی سرمائے کے چنیدہ حلقے میں داخل ہوتے جاتے ہیں ۔ دوسری جانب سرمایہ داریت کی آمد کے ساتھ ساتھ ان ممالک میں علیحدگی پسند علاقائی و قومی تحریکیں بھی قومی منظر پر طمطراق سے ابھرتی جاتی ہیں ۔

ایسے تضاد جہاں بھی نظر آئیں اُن دونوں کے درمیان نامیاتی اور اٹوٹ رشتہ کی موجودگی لازمی ہوتی ہے ۔ اور ایسا ہی ایک اٹوٹ رشتہ ان ممالک میں بین الاقوامی استعمار کی موجودگی اور خود ان ممالک میں بھانت بھانت کی شوریدہ سر قومی تحریکوں کے

درمیان قائم ہے۔ نیم نوآبادیاتی نظام کے خلاف ان نوآزاد ممالک کے لوگوں کی بڑھتی ہوئی تحریک کے قدموں کی رفتار کو سست کرنے کے لئے ضروری ہے کہ استعمار یہاں مرکز سے گریزاں تحریکوں کو جنم دے کر ان ممالک کی استعمار سے آزادی کی تحریک کو کمزور کرے اور ان ممالک کی معاشی، سیاسی اور ثقافتی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکائے۔ بین الاقوامی سرمائے کے لئے ضروری ہے کہ وہ بیک وقت ان ممالک کی سرحدوں کی قیود اور بندشوں کو گرا کر اپنی آمدورفت کے لئے راستہ ہموار کرے دوسری اپنی اس بے لگام آمدورفت کے خلاف ان نوآزاد ممالک کی مزاحمتوں کو کمزور کرنے کے لئے خود انکی سرحدوں کے اندر مزید انتظامی، دستوری حتیٰ کہ جغرافیائی سرحدوں کو جنم دے۔

چنانچہ ان ممالک میں مرکز گریز سیاسی تحریکیں روز بروز زیادہ بے باک اور غضبناک ہوتی جاتی ہیں۔ آج ہمارے ملک کے سرمایہ دار، جاگیردار اور قبائلی سردار، اور اعلیٰ وردی بے وردی نوکر شاہی کے متنوع حلقے جارحانہ قومیت پرستی کا۔ شدومد سے پرچار کر رہے ہیں۔ ان کا محاورہ اور لہجہ روز زیادہ دھمکی آمیز ہوتا جا رہا ہے اور ان کی ڈانٹ ڈپٹ کے دباؤ میں بورژوازی کے روشن خیال حلقے بھی تنگ نظر قوم پرستی کو مراعات دے کر اُسے چمکار پچکار رہے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ادنیٰ بورژوازی اور متوسط طبقوں کو بھی قوم پرستی نے اپنے الاؤ کی لپیٹ میں لے لیا ہے جہاں آگ اور خون کا لغو اور مہمل کھیل جاری ہے۔ حدّت اتنی زیادہ ہے کہ خود جمہوری اور اشتراکی تحریک کے اندر تنگ نظر قوم پرستی نے دراڑیں ڈال کر اُس کو مجبور و بے بس کر دیا ہے۔ اور قوم پرست جمہوریت پسند اور قوم پرست اشتراکی قومی جدوجہد اور قومیتی جدوجہد کی "اولیت" اور "قومیت" اور بعد میں "جمہوری" اور "اشتراکی" جدوجہد کی موقع پرستانہ مرحلہ وار جدوجہد کے پردہ میں جمہوری تحریکوں کو زک پہنچا رہے ہیں اور انتہائی ڈھٹائی اور بے شرمی کے ساتھ فوجی آمریت کے ساتھ ہم نوالہ و ہم پیالہ ہیں۔ ایسی صورت حال میں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ "قومی سوال"

پر محنت کش طبقے کے موقف کو راست انداز میں پیش کیا جائے اور اس مسئلہ پر مارکسی یعنی نقطۂ نظر کی بھرپور وضاحت کی جائے۔

محنت کشوں کا نظریہ بین الاقوامی ہے اور تمام انسانوں کی بین الاقوامیت پر یقین رکھتا ہے۔ اور اُن تمام نظریوں اور جبر و استحصال پر مبنی ان تمام حیلوں اور چالوں کو حقارت و نفرت سے رد کرتا ہے جو انسانوں کے ما بین علاقائی، قومی، نسلی، لسانی، ثقافتی جنسی، مذہبی اور دیگر رجعتی اور انقلاب دشمن تعصبات کو پروان چڑھا کر مکمل جمہوریت و اشتراکیت کے لئے محنت کشوں کی بین الاقوامی جدوجہد میں اختلاف و افتراق ڈال کر اُسے کمزور اور غیر موثر کرنے کے درپے ہیں۔ محنت کش طبقہ نہ صرف بھانت بھانت کے ان تعصبات کو رد کرتا ہے بلکہ ان کے خلاف سینہ سپر ہوتا ہے اور شد و مد سے عملی جدوجہد کرتا ہے۔ چنانچہ کسی بھی ملک میں محنت کشوں کی جماعت کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ملک کے اندر تمام قومیتوں کے محنت کشوں کو باہم جوڑتے ہوئے انہیں سرمایہ دارانہ استحصال اور جبر کے خلاف محنت کشوں کی بین الاقوامی جدوجہد کے دھارے میں شامل کر کے بین الاقوامی اشتراکیت کے اعلیٰ وارفع آدرش کی تحصیل و تکمیل کے لئے کمربستہ کرے۔

محنت کشوں کے نظریے کی بین الاقوامیت کوئی روحانی، اخلاقی، تصوراتی، موضوعی، خواب پرستانہ، ہوائی فریضہ نہیں بلکہ اس کی تاریخی مادی بنیادیں ہیں۔ یہ بین الاقوامیت انسانیت کے تاریخی تجربے کا نچوڑ ہے۔ انسان نے جب سے خود کفالت پر مبنی فطری معیشت کی بے بضاعتی کو خیرباد کہہ کر تقسیم کار اور اختصاصی پیداوار کا طریقہ کار اپنایا ہے، پیداوار اور مبادلۂ پیداوار کے عمل نے مسلسل خاندان، برادری، ذات پات، مذہب، قبیلہ، نسل، زبان، ثقافت اور قوم کی نظری اور علاقائی حدود کو مسمار کرتے ہوئے انسانیت کے وسیع تر سے وسیع تر اور وسیع ترین علاقوں کو اپنی بھنور کی لپیٹ میں لیا ہے۔ اس تاریخی عمل کے دوران نہ جانے کتنے بت ٹوٹے، کتنے خداؤں کی بے حرمتی ہوئی لیکن یہ

بھنور مسلسل اپنا گھیرا بڑھاتی رہی اور اس کے گھماؤ کی رفتار بھی بڑھتی رہی حتیٰ کہ آج
یہ عمل بین الاقوامی سرمائے کے زیر قیادت حقیقی معنوں میں، واقعتاً بین الاقوامی ہو چکا
ہے۔ محنت کش طبقہ منظر عام پر وارد ہی اُس وقت ہوتا ہے جب پیداوار اور مبادلۂ پیداوار
کے اس عمل نے بین الاقوامیت کی تحصیل کر لی ہو اور پیداواری قوتیں نشوونما پا کر ایسی
بین الاقوامی تاثیر کی حامل ہو چکی ہوں کہ ان کے سامنے کسی نظریاتی اور جغرافیائی
"سرحد" اور نسل، زبان، ثقافت پر مبنی خلیج کا بس نہیں چلتا۔ آج بین الاقوامی سرمایہ
کرۂ ارض کے دور دراز علاقوں، کبھی ناقابلِ گزر جنگلوں، پہاڑوں اور سمندر کی اتھاہ
وسعتوں میں گھری آبادیوں کو اپنی آغوش میں لے چکا ہے۔ یہ سرمایہ ہی ہے جس نے آج
ان محنت کشوں کو دھکیل کر سات سمندر پار در در کی خاک چھاننے کے لئے مجبور کر دیا ہے
جن کے آباؤ اجداد کے لئے سامنے کا پہاڑ دنیا کا آخری سرا تھا۔ وہ جن کے نزدیک سمندر
پار جانا پاپ تھا آج رضاکارانہ طور پر، خود پیسے دیکر، اپنی محنت فروخت کرنے کے
لئے براعظم پھلانگتے پھر رہے ہیں۔ محنت کی اس بین الاقوامی منڈی میں محنت کش کی
قومیت، نسل، مذہب اور ثقافت کی کوئی قدر و منزلت نہیں کوئی پوچھ گچھ نہیں بلکہ
محض اُس کی تجریدی قوت محنت کا بھاؤ تاؤ ہے۔ وہ محض اپنی واحد شئے خرید و فروخت
یعنی قوت محنت کو اپنے ہاتھوں میں لئے در بدر کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ اپنی اس قوت
محنت کو فروخت کرتے وقت نہ تو وہ سرمایہ دار کی قومیت کی پرواہ کرتا ہے اور نہ ہی
اُس کی قومیت سرمایہ دار کے بھاؤ تاؤ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہی وہ مادی بنیاد ہے جس
کے باعث محنت کش طبقہ بین الاقوامی طبقہ بن جاتا ہے اور بین الاقوامی سرمائے کے
بین الاقوامی استحصال کے خلاف محنت کشوں کی متحدہ بین الاقوامی جدوجہد محنت کشوں
کا فریضہ بن جاتی ہے۔

ایک معنی میں ہماری بات مکمل ہو چکی۔ ہم قومی مسئلہ پر محنت کش کا نظریہ بیان

کر چکے۔ قومی مسئلہ پر طبقاتی شعور رکھنے والے محنت کش کا نظریہ یہ ہے کہ وہ بین الاقوامیت
پر یقین رکھتا ہے اور ہر قسم کی قوم پرستی اور قومی تعصب کو رد کرتا ہے۔ تاہم یہیں سے
بات پھیلتی ہے۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے محنت کش طبقہ
تنہا بین الاقوامیت پسند نہیں بلکہ اس کرۂ ارض پر دوسرے بین الاقوامیت پسند طبقے
بھی ہیں جن کی بین الاقوامیت پسندی محنت کشوں کی بین الاقوامیت کی ضد ہے۔ چنانچہ
قومی مسئلہ پر محنت کشوں کے بین الاقوامی نقطۂ نظر کے سامنے بنیادی مسئلہ یہ درپیش ہے
کہ وہ اپنی بین الاقوامیت اور دیگر طبقوں کی بین الاقوامیت میں فرق قائم کرے۔

سرمایہ اور سرمایہ دار بھی بڑا بین الاقوامی ہوتا ہے۔ سرمائے کے سامنے بھی تمام
خاندانی، حسب نسب اور ہڈی بوٹی سے متعلق، نسلی، مذہبی، قبائلی، ذات پات اور
متعلق بہ رنگ، لسانی، ثقافتی اور قومی فرق پگھل جاتے ہیں۔ سرمائے نے عالمی معاشی
نظام کو جنم دیا اور کرۂ ارض کے دور دراز علاقوں میں پھیلی ہوئی آبادیوں کو اپنے دامن
میں سمیٹا، ذرائع آمد و رفت کو برق رفتار ترقی دی اور ابلاغ کے اُس لاسلکی نظام کو
پھیلایا جو قومی سرحدوں کو ہر لحظہ پامال کرتا رہتا ہے۔ عالمی منڈی اور عالمی تقسیم
محنت کی بنیاد پر تمام علاقوں کا ایک دوسرے پر دار و مدار بڑھایا۔ آج وہ علاقے بھی
بین الاقوامی منڈی اور بین الاقوامی محنت کی شماریات کا حصہ ہیں جو کبھی ناقابلِ گزر
جنگلوں، پہاڑوں اور ناقابلِ عبور سمندروں کے وسط میں گھرے ہوئے کنوئیں کے مینڈک
کی طرح رہتے تھے، کنوئیں کے مینڈک کی طرح سوچتے تھے اور کنوئیں کے مینڈک کی طرح
لڑتے تھے۔ سرمایہ دارانہ نظام نے ان تک کو بین الاقوامی شعور دیا۔ سرمائے کے اس
بین الاقوامی عمل کے دوران لوگوں کا ہزار ہا سال سے قائم ثقافتی انفراد تمام ہوا۔ اور مبادلہ
پیداوار اور لین دین کی آفاقی گرداب نے لوگوں کے آداب و اطوار اور معیارات اخلاق
و حسن، سب ہی کو اپنے اندر کھینچا۔ اشیاء کی خرید و فروخت اور بھاؤ تاؤ کے دوران

تجریدی گاہک اور فروخت کنندہ ایک دوسرے کے مقابل نہیں آتے بلکہ انسانوں اور اجتماعات کی کلیت اپنے مادی اور ثقافتی ورثہ سمیت باہم مختلط ہوتی ہے۔ اشیاء کی لین دین کے نتیجہ میں محض معاشی دار و مدار ہی نہیں بڑھتا بلکہ ثقافت، زبان، مذہب، الغرض معروضی دنیا کی جانب معاشروں کے کُل تاریخی اجتماعی و انفرادی ردعمل کا لین دین بھی ہوتا ہے۔ سرمایہ داریت کا پیدا کردہ عالمی معاشی نظام عرصہ پہلے اُس عمل کو مہمیز دے چکا ہے جو کرہ ارض پر پھیلی ہوئی علیحدہ علیحدہ، اپنے اپنے علاقوں میں محصور اور ایک دوسرے سے منفصل آبادیوں کی معاشی و ثقافتی، مادی و روحانی معروضی و موضوعی فصیلوں کو منہدم کر کے ایک بین الاقوامی آفاقی ثقافت اور بین الاقوامی آفاقی انسان کو جنم دے گا۔

یہ سرمایہ داریت کا ترقی پسندانہ پہلو ہے۔ اور علمی اشتراکیت اس کی قدر و وقعت پہچاننے میں کسی قسم کی کوتاہی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ مارکسی لیننی فکر انسانی تاریخ کے پورے سفر کے جائزے اور احاطے کی بنیاد پر اس امر کا بخوبی اندازہ رکھتی ہے کہ اس سفر کے دوران لکھوکھا علیحدہ و تنہا اور مستغنی انسانی آبادیوں کی بے بضاعتی پر مبنی خود کفالت تواتر کے ساتھ ٹوٹی اور وہ وسیع سے وسیع تر معاشی حلقوں کے مرہون منت ہوئے علمی اشتراکیت ایسے ناقابل پلٹ تاریخی عملوں سے سر ٹکرانے کے بجائے ہمیں ان کی سائنسی فہم کی بنیاد پر کل انسانیت کی بہتری کے لئے ہمارے سیاسی و موضوعی عمل اور جدوجہد کے لئے آدرش فراہم کرتی ہے۔ علمی اشتراکیت اور محنت کش طبقہ اس ضمن میں سرمایہ دارانہ نظام کی پیش قدمیوں کا قدر شناس ہے اور مختلف اقوام اور انسانی گروہوں کی قربت اور ادغام کے عمل کو نہ صرف خوش آئند قرار دیتا ہے بلکہ اُن کو تیز تر کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

تاہم سرمایہ دارانہ نظام کی متعارف کردہ بین الاقوامیت خود سرمایہ داریت کے اپنے خمیر سے اٹھتی ہے۔ اور یہ خمیر ہے محنت کا استحصال۔ سرمایہ دار خود اپنے ملک یا قوم کے

محنت کشوں کا استحصال کرتا ہوا پروان چڑھتا ہے۔ وہ خود اپنی قوم کے محنت کشوں کی پیدا کردہ قدر زائد ہتھیاتا ہے اور خود اپنے ملک کی منڈی پر اپنا تسلّط قائم کرتا ہے چنانچہ اس کی بین الاقوامیت کی اساس بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ دوسرے ممالک اور اقوام کی محنت کا استحصال کرے اور ان کی منڈی پر اپنا تسلّط قائم کرے۔ اس کی بین الاقوامیت استحصالی بین الاقوامیت ہوتی ہے۔ اس استحصال کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ دوسری اقوام پر سیاسی غلبہ قائم کیا جائے۔ دوسری اقوام کو مغلوب کر کے ان کو بین الاقوامیا لیا جائے۔ بالفاظ دیگر اُن پر جبر کیا جائے۔ سرمایہ دارانہ بین الاقوامیت بالضرور استعماری اور نو آبادیاتی یا نیم نو آبادیاتی اشکال اختیار کرتی ہے اور ہم سب ہی ان سے بخوبی واقف ہیں۔ انیسویں صدی سے سرمایہ داریت نے دنیا کو مہذب کرنے، نئی دنیا کی تلاش وغیرہ کے روشن خیال نظریاتی پردوں کے عقب میں دنیا کی مختلف آبادیوں پر جبری قبضے، بردہ فروشی، برہنہ تشدد اور کشت و خون کا جو کھیل کھیلا اُس کا سرسری مطالعہ ہی اس نفرت انگیز بین الاقوامیت کی کریہہ صورت کو واضح کر دیتا ہے۔ دوسری اقوام کے محنت کشوں کا استحصال اور ان اقوام کے لوگوں کی لوٹ کھسوٹ اُن کی منڈی پر تسلّط اور دوسری اقوام پر سیاسی غلبہ اور قومی جبر سرمایہ دارانہ بین الاقوامیت کے خاصّے ہیں۔

سرمایہ دارانہ بین الاقوامیت لازمی طور پر جبر و استحصال پر مبنی ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ محنت کش طبقے کے لئے انتہائی ضروری ہے کہ وہ اپنی بین الاقوامیت اور سرمایہ دارانہ بین الاقوامیت کے درمیان تمیز قائم کرے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تمیز کیوں کر قائم کی جائے؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے اس بات کی نشاندہی ضروری ہے کہ محنت کش طبقے اور سرمایہ دار کے علاوہ بین الاقوامیت کے داعی کچھ دیگر طبقے بھی ہیں۔ بلکہ شاید اگر کبھی بین الاقوامیت کی تاریخ لکھی جائے اور مسئلہ یہ چھڑ جائے کہ سب سے پہلے بین الاقوامیت

کی بنیاد کس نے ڈالی تو شاید اس مقدمے میں پہل کا دعویٰ محنت کش طبقے اور سرمایہ دار کے بجائے کچھ دیگر طبقے دائر کریں گے۔ ہماری مراد مختلف طرز کے قبائلی سرداروں اور جاگیرداروں سے ہے۔ سب سے پہلی بین الاقوامی شہنشاہی مملکتیں انہوں نے ہی تو قائم کی تھیں۔ سارگون اور حمورابی، قیصر و کسریٰ، چنگیز و ہلاکو، مغل سلطنت اور ہر ملک و قوم کے وہ ظلِ سبحانی اور وہ عظیم فاتح، جن کی یادیں ہمارے رنگا رنگ قوم پرستوں کو ستاتی ہیں جنکو وہ اپنا آئیڈیل بنائے بیٹھے ہیں، دراصل بین الاقوامیت ہی تو کر رہے تھے۔ یہ بھی ایک دلچسپ اور معنی خیز تناقض بالذات ہے کہ اگر تمام نہیں تو بیشتر تنگ نظر قوم پرست اپنے ایسے افسانوی سورماؤں اور فوق البشر رستمانِ رزم کی پرستش کرتے ہیں جنہوں نے دوسری اقوام پران کی قوم کا لوہا منوایا اور اپنے اُس تاریخی دور کی دوبارہ واپسی کی لو لگائے بیٹھے ہوتے ہیں جب ان کے آباؤاجداد نے اطراف کی اقوام کے وسیع علاقوں کو زیر کر کے دراصل مختلف اقوام کے لوگوں کو یکجا کیا تھا اور وسیع بین الاقوامی معاشی اکائیوں کو جنم دیا تھا اور مختلف لوگوں اور آبادیوں میں لین دین کا عمل شروع کرا کر ان کا ایک دوسرے پر دارومدار بڑھایا تھا۔ قوم پرستوں کے یہ سورما قوم پرستی کے بجائے بین الاقوامیت کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں ایک ایسی صورتحال میں جبکہ مختلف قبائل مسلسل خون آشام، خودکش جنگوں میں الجھے ہوئے تھے ہمیں اس بات سے انکار کرنے کی بھی ضرورت نہیں کہ ان عظیم تاریخی و افسانوی فاتحوں نے بین الاقوامی اور بین القبائلی سلطنتیں قائم کر کے لوگوں کو ان مسلسل جنگوں کی قتل و غارت گری سے نجات دلائی جو ان اقوام اور نسلوں کی بیخ کنی کر رہی تھیں۔ یہ رستمانِ وقت بجا طور پر اپنے آپکو 'نجات دہندہ' اور 'امن و امان قائم کرنے والا' وغیرہ کہلواتے تھے۔ انہوں نے واقعتاً مسلسل برسرِ پیکار اقوام اور قبائل کو عظیم تر مملکتوں میں متحد کر کے ان کی مادی زندگی کی افزائش اور آسائش کا بندوبست کیا تھا۔

اور نہ صرف مادی سطح پر بلکہ ان عظیم فاتحوں نے روحانی و ثقافتی سطح پر بھی بین الاقوامیت کو مہمیز دی۔ اگر ایک قبیلہ دوسروں کو فتح کرتا تو کہیں سب ہی ایک دوسرے کے خداؤں کو ماننے لگتے، کہیں ایک خدا غالب ہوتا اور دوسرے اُس کے لئے جگہ خالی کر دیتے اور کہیں ان سب خداؤں کو درجہ بدرجہ مراتب دے دیئے جاتے۔ یہی صورت ان خداؤں اور عقائد سے وابستہ تحریمات و ممنوعات کی ہوتی۔ صورت چاہے کچھ بھی ہو بہر حال یہ خدا بین الاقوامی ہو جاتے تھے۔ سب خداؤں کو تسلیم کر لیا جاتا تو سب خدا بین الاقوامی ہو جاتے، اگر بقیہ معدوم ہو جاتے تو ایک کی بین الاقوامیت مسلم ہو جاتی ورنہ یہ سب بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ درجہ بند ترتیب میں صف ایستادہ ہو جاتے۔ کانسی کی تہذیب کے دوران جب بڑی بڑی سلطنتیں بنیں تو پھر عظیم فاتحوں کی عظیم بین الاقوامی سلطنتوں کے ساتھ ساتھ عظیم بین الاقوامی خدا بھی آئے اور بین الاقوامی مذاہب بھی۔ اور پھر لوہے کے استعمال کے ساتھ ہی یہی عمل ایک نئی کیفیتی عظمت اور عظیم تر بین الاقوامیت کے ساتھ پھیلا۔ اسی عمل نے اخلاق و حسن و صداقت کے قومی معیارات کو بھی بین الاقوامیت کے ہاون دستہ میں کوٹ پیس کر ان کی آمیزش کی اور اس طرح مختلف جانب سے آکر ملنے والے ثقافتی چشموں کے دھاروں نے ایک دوسرے کے ساتھ ملکر ایک دوسرے کو مزید مالا مال کیا۔

قبائلی اور جاگیردارانہ بین الاقوامیت کا یہ پہلو یقیناً ترقی پسندانہ ہے۔ بکھرے ہوئے باہم متصادم اور خود کفالت کے اصول پر قائم یہ قبیلے یقیناً اپنی حالت استغنا میں اپنے ماحول کے تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہو پا رہے تھے۔ وہ ایسے شدید اندرونی تضادات کا شکار تھے جو ان کے وجود اور بقا کے لئے خطرہ بن چکے تھے۔ ان اندرونی تضادات کے حل کے لئے بیرونی توسیع نے ان کو مسلسل ہلاکت آمیز جنگوں کی آغوش میں دھکیل دیا تھا۔ صرف یہ بین الاقوامی مملکتیں ہی ان فلاکت خیز تضادات کے عناد

کو اپنے اندر سمو سکتی تھیں۔

تاہم جس طرح سرمایہ داریت کی بین الاقوامیت اُس کے اپنے خمیر سے اٹھتی ہے اُسی طرح جاگیردار اور قبائلی سردار کی بین الاقوامیت بھی اُس کی اپنی اساس کی آئینہ دار ہوتی ہے جاگیردارانہ اور قبائلی سرداری نظام کی اساس مطلق العنانیت اور شخصی اقتدار کلّی میں پیوست ہے۔ یہ خود اپنے قبیلے، جاگیر یا اقلیم میں کسی شخص کے ذاتی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی حقوق تسلیم نہیں کرتا۔ خود اپنی ذات میں خدائی، نیم خدائی یا ظلّ سبحانی ہونے کا یہ دعویدار لوگوں کے جسم و جان پر قادر مطلق ہونے کا دعویدار ہوتا ہے۔ قانون و آئین اس کے منہ کا نکلا ہوا لفظ ہیں۔ جب قانون دے تب بھی یہ قانون عطا کرتا ہے اُس کا خالق ہوتا ہے۔ انصاف بھی کسی کا حق نہیں بلکہ انصاف بھی عطا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی بین الاقوامیت بھی اس سانچہ میں ڈھلی ہوتی ہے۔ شمشیر زنی اور برہنہ تشدد کے بل پر قائم ہونے والی یہ بین الاقوامیت مسلسل تشدد یا اُس کی دھمکی کے بل پر جاری رہتی ہے۔ یہاں کسی بھی شخص کے کوئی حقوق نہیں ہوتے ہاں جس پر وہ مہربان ہو جائے، اگر اُس کے مزاج میں آئے، تو لطف و کرم کی بارش کر دے، دو جہاں عطا کر دے، گورڈن چائلڈ تانبہ کے دور کی بہیمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے مفتوح لوگوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ "یہ انسان بیلوں اور گدھوں کی طرح پالتو بنائے جاتے ہوں گے۔ فتوحات کے بعد ایسے درجاتی معاشرے پیدا ہوئے ہوں گے جن میں آقا اور غلاموں کی تقسیم ہوگی۔ قدیم ترین شہروں میں ہم طبقاتی تقسیم کی اسی پہلی صورت کا نظارہ کرتے ہیں"۔

الغرض اس بین الاقوامیت کا بنیادی خاصہ یہی ہے کہ اس میں ہر قسم کے حقوق ناپید ہوتے ہیں۔

محنت کشوں اور عوام کے کسی بھی پروگرام کے لئے ضروری ہے کہ وہ محنت کشوں کی بین الاقوامیت کو درج بالا دونوں اقسام کی بین الاقوامیتوں سے ممیّز کرے۔ قومی مسئلہ

پر محنت کشوں کے سیاسی موقف کو اُس سرمایہ دارانہ بین الاقوامیت سے جدا کرنا بھی ضروری ہے جس کا لازمی خاصہ قومی جبر و استحصال ہے اور اسکو اُس جاگیردارانہ اور قبائلی بین الاقوامیت سے بھی ممیز کرنے کی ضرورت ہے جو تمام سیاسی و سماجی حقوق کی نفی کرتی ہے۔ بالخصوص ہمارے جیسے ملک میں جہاں جدید ریاستی اقتدار و اختیار کے تانوں بانوں کی ظاہری ٹیپ ٹاپ یعنی آئین، انتخابات، تحریری مسودۂ قوانین، مساوات قانونی اور قانون کی بالادستی، آزاد عدالتوں، اور عوامی وردی بے وردی نوکروں چاکروں کے بہروپ کے پردے میں نیم قبائلی اور نیم جاگیردارانہ بد باطنی یعنی زور زبردستی اور لوٹ مار کو ملک کے طول و عرض میں چار دانگ بٹھانے کے حیلے جاری و ساری ہیں۔ جہاں جائز ریاستی اختیار کا تصور اور قاعدے، اور ان اختیارات کو استعمال کرنے والے ریاستی ادارے ان استعماری آقاؤں کے تحت پھلے پھولے ہیں اور ان کی عادات و اطوار ان نوآبادیاتی سرپرستوں کے زیر سایہ پختہ ہوئی ہیں جن کے نزدیک یہاں کے مقامی باشندے حیوان ناطق نہ ہوں، جہاں سرمایہ دارانہ استحصال متروک غلام دارانہ رشتوں کی مسخ اشکال سے گندھا ہوا ہو ایسے ممالک میں تو اس امر کی ضرورت انتہائی شدید ہو جاتی ہے کہ محنت کشوں کی بین الاقوامیت کو اُس جاگیردارانہ اور قبائلی بین الاقوامیت سے ممیز کیا جائے جس کی روح مطلق العنانیت اور آمریت ہے اور جو رفتہ رفتہ سرمایہ دارانہ استحصالی بین الاقوامیت کا روپ دھار رہی ہے۔

پاکستان میں آج ایک فوجی آمریت قائم ہے جس نے پاکستان کی تمام قومیتوں اور تمام طبقوں کے حقوق اور آزادیاں غصب کی ہوئی ہیں جو ملک کے آئین کو توڑ کر پچھلے دس سالوں سے اُس کے ساتھ کھلواڑ کر رہی ہے۔ جس نے انتہائی بے دردی سے اس ملک کے واحد منتخب وزیر اعظم کو پھانسی دی۔ اور بلا لحاظ قومیت بے شمار سیاسی کارکنوں اور راہنماؤں کو عقوبت گاہوں میں ڈال کر انہیں ایسی اذیتیں دیں جنکی مثال ہمارے خطے کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ جس نے کتنے ہی سیاسی مخالفوں کو پھانسی دی درجنوں کے

بارے میں یہ پتہ نہیں کہ اُن کے ساتھ کیا ہوا۔ جس کو حقوق اور آزادیوں کی کوئی پرواہ نہیں۔ آج بھی یہاں صرف ایک شخص کے منہ سے نکلا ہوا لفظ اور اُس کا جاری کردہ فرمان قانون ہے۔ جس نے تین سال قبل غیر جماعتی انتخابات کراتے وقت یہ کہا تھا کہ "کچھ دے رہا ہوں لے نہیں رہا" جو بیسویں صدی میں عوام کو صرف "شریک اقتدار" کرنا چاہتا ہے۔ جہاں ایک شخص لوگوں سے یہ پوچھ کر کہ وہ اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں کہ نہیں، اور خود کو اسلام سے خلط ملط کر کے اور اس سوال پر استصواب رائے میں محض ۵ فیصد رائے دہندگان کی حمایت پر ۸ رسال حکومت کرنے کے بعد مزید ۵ رسال کے لئے اقتدار اعلیٰ پر براجمان ہو جائے، اور تمام اصولوں اور قوانین کو بے دردی سے مسخرہ پن کا شکار کرے وہاں ظاہر ہے کہ عوام کے کسی بھی حلقے، طبقے یا قومیت کے حقوق کی بات ایک مذاق کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتی۔

ہمارے ملک کا سیاسی نظام تو قزاقانہ رہا ہی ہے اور بالعموم طریقۂ کار یہی رہا ہے کہ جو کوئی کامیابی سے دھاڑ امارے مسند اعلیٰ اُسی کی لیکن ساتھ ساتھ ہمارے ملک کی انتظامی اور ریاستی کل پرزے بھی بے مثال چور اور چیتر ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں بے پناہ قوت و طاقت مرتکز ہے۔ ملک کے تمام مالی و تجارتی وسائل ان کی دست برد میں ہیں۔ ملک میں سیاسی حقوق اور عوام کی جمہوری آزادیاں اور حقوق تو ناپید ہیں ہی لیکن بورژوا تصور حقوق کا جوہر اور نچوڑ یعنی حق ملکیت بھی ان کی دست اندازیوں کی لپیٹ میں ہے۔ زمیندار اور سرمایہ دار دونوں کو یہ بنا بگاڑ سکتے ہیں۔ اور روز خود ان کی صفوں سے نئے زمیندار اور سرمایہ دار ابھر رہے ہیں۔ زمیندار کی زمین، بیج، پانی، بینک کا قرضہ، اور فصل کے دام سب ہی یہ خود طے کرتے ہیں الغرض ان کی انگلی زمیندار کے ٹینٹوے پر رکھی رہتی ہے اور یہ جب چاہے اُسے تکمیل رہن کی ایک تنبیہ کے ذریعے راہ راست پر لا سکتے ہیں۔ اسی طرح سرمایہ دار بھی ان کے بھتوں کی ادائیگی کے بغیر ایک

قدم نہیں اٹھا سکتا۔ وہ باقاعدگی سے ان کے نذرانے پہنچاتا ہے۔ نتیجے کے طور پر سرمایہ دار اور زمیندار دونوں ہی اپنی معاشی قوت و طاقت کو سیاسی اقتدار و اختیار میں تبدیل کرنے کے قابل نہیں۔ جب صاحبان جائداد بورژوا حقوق کے لب لباب یعنی حق ملکیت کو وردی بے وردی نوکرشاہی کی دست درازیوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتے تو دیگر بورژوا آزادیوں اور حقوق کی بات تو دور کی بات ہے اور سیاسی حقوق اور بورژوا اقتدار کو تو بھول ہی جایئے۔ فی الحال انہیں فوجی آمریت کے پھینکے ہوئے اقتدار میں شرکت کے چند ٹکڑوں پر ہی گزارا کرنا پڑے گا، کبھی مجلس شوریٰ کی شکل میں، کبھی غیر جماعتی انتخاب کی صورت میں۔

اس محیط و بسیط اختیار و اقتدار کو وردی بے وردی نوکرشاہی کی کھلی لاقانونیت اور لوٹ مزید گہرا کرتی ہے۔ متنوع ریاستی وصولیابیوں اور ان کے تعین کے لئے انگریزی استعمار نے جو قوانین اصول اور قواعد اور ادارے یہاں رائج کئے تھے وہ کسی حد تک خود اُن کے اپنے ممالک میں خود اُن کے بورژوا تجربے اور طور طریقوں کے آئینہ دار تھے گرچہ ان میں استعماری لوٹ مار اور جبر اور مقامی آبادی کے ساتھ غلامانہ رویّوں کو بھی قانونی حیثیت دی گئی تھی۔ ان محصولات کو وصولنے والے اداروں اور قانون کا نفاذ کرنے والے اداروں کو ان ممالک کے معاشرے اور معاشرے کی تمام پرتوں سے مافوق رکھنے کا بندوبست بھی تھا اور "قانون کے نفاذ" کے دوران ان تمام اداروں کے افراد کا عمل عام قانون کی پکڑ سے باہر تھا۔ جس عمل پر عام شہری کو پھانسی کی سزا ہوسکتی تھی اُس پر قانون نافذ کرنے والے ادارے کے شخص کا محض تبادلہ ممکن تھا۔ معطلی، لائن حاضر ہونا، وغیرہ وغیرہ وہ سزائیں تھیں جن پر برطانوی استعماری آغوش میں نازونعم سے پلے ہوئے ہمارے چھوٹی موٹی سرکاری افسر اعصابی تناؤ میں مبتلا ہوتے تھے اور مکمل نفسیاتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوجاتے تھے۔
البتہ ایک ایسی صورتحال میں جبکہ لوٹ کھسوٹ، اور نوآبادیات کے عوام کی محنت کا

عطر استعماری آقاؤں کا تحفظ خاص تھی، یہ افسر شاہی "ایماندار" رہی۔ ایمانداری، فرائض کی بجا آوری، مستعدی اور جی حضوری کے مرقعّ اس مرد کی شخصیت اس کی اٹھک بیٹھک کے ہر عصبی رعشہ سے اسی طرح دیکھی اور سنی جاسکتی تھی جس طرح گھڑی کی سوئی کی ٹک ٹک دیکھی اور سنی جاسکتی ہے۔ استعمار کے تابع اور وفادار اس نام نہاد "عوامی نوکر" کی پُر تکلف اور پُر تصنع پابندی وضع و ضابطہ و آداب استعمار کی سفاکانہ اور وحشیانہ لوٹ کھسوٹ پر ایک باریک پردے سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ تاہم استعمار کی فوجی وسیاسی روانگی کے بعد یہ نقاب بھی تار تار ہوگئی۔ ان پر کبھی بھی مقامی معاشرے کا اثر ورسوخ تو کبھی رہا ہی نہ تھا یہ ہمیشہ سے اُنہی دسترس سے ماوری تھے انگریز کے جانے کے بعد ان کے اوپر سے جوابدہی کا آخری بوجھ بھی اترا اور اب یہ بالکل خودسر ہوگئے۔ تاہم ان کو اپنی نئی قوت وطاقت کی خود آگاہی میں بھی تھوڑا عرصہ لگا، اور اس عرصہ میں خود ان کی رسیدگی و پختگی بھی ہوئی۔ اعداد و شمار کے مطابق تقسیم کے وقت پاکستان کے حصہ میں آنے والی افواج میں کرنل سے اوپر کے عہدے کا ایک بھی افسر نہ تھا اور تمام اعلیٰ عہدوں پر تقریباً ۵۰۰ برطانوی افسر فائز تھے۔ بے وردی نوکر شاہی میں بھی صورتحال کوئی زیادہ مختلف نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں عنان اقتدار کے لئے اس وردی بے وردی نوکر شاہی حرص وہوس کی تسکین ممکن نہ تھی۔ لیکن جلد ہی یہ صورتحال بدلی۔ تقسیم سے پہلے ہی پہلی جولائی ۱۹۴۷ء کو ہی یہ فیصلہ کیا جاچکا تھا کہ پاکستان کی افواج کا انتظامی کنٹرول برطانیہ عظمیٰ کے ہاتھوں میں رہے گا۔ اسی سرپرستی میں ہمارے مقامی افسر پھلے پھولے انہی کی پسند و انتخاب نے ہمیں ہمارے اعلیٰ افسر دیئے اور انہی نے چار سال کے قلیل عرصے میں ۱۹۵۱ء میں ہمیں ایوب خان کی صورت میں ہمارا پہلا کمانڈر انچیف تحفہ میں دیا۔ اسی سال لیاقت علی خان قتل ہوئے، غلام محمد، اسکندر مرزا، اور ایوب خان کا مثلث تشکیل پایا اور پاکستان نے امریکہ سے فوجی امداد کی رسمی درخواست کی۔ الغرض باوردی نوکر شاہی نہ صرف ملکی

اقتدارِ اعلیٰ کے کھیل کے مزے لینے لگی بلکہ بین الاقوامی اکھاڑے میں شرکت کے وہ خواب شیریں دیکھنے لگی جن کی تعبیر خوفناک ہے ۔ ۱۹۵۱ء سے شروع ہونے والی اٹھکیلیوں کے نتیجے میں ۱۹۵۴ء میں پاکستان اور امریکہ نے باہمی دفاعی تعاون کے معاہدہ پر دستخط کئے اور اسی سال قومی حکومت اور قومی پارلیمان کو برخاست کیا گیا اور مالِ غنیمت کے طور پر ایوب خان کے ہاتھ وزارت لگی ۔ الغرض باوردی نوکر شاہی نے ابھی کمشکل پاؤں پر کھڑا ہونا شروع کیا تھا کہ اس نے چہار اطراف ہاتھ پاؤں مارنے شروع کئے اور پھر بہت جلد ہی یہ ملکی سیاسی و معاشی و ثقافتی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہو گئی ۔ پابندِ ضابطہ اہلکار ضابطہ ساز اور ماورائے ضابطہ ہو گئے ۔ ان کی خود بینی و خود آرائی کی کوئی جواب دہی اور احتساب نہ رہا ۔ حتیٰ کہ موجودہ ضیا آمریت میں باوردی نوکر شاہی کی خودسری اپنے عروج کمال کو چھو گئی ۔ نظریۂ ضرورت کے تحت آئین کی معطّلی ، شک پر پھانسی کی سزا ، پی سی او ، اور کسی افسر کی بدعنوانی کے بارے میں سچ کی اشاعت و تشہیر پر ہتک عزت کی تعزیر ، نظربندیوں کے ناقابلِ چیلنج قوانین ، عام اور شرعی عدالتوں سے ماورئی فوجی عدالتیں ، ناقابلِ چیلنج برطرفیاں وغیرہ اس باوردی آمریت کے بے لگام اختیار و اقتدار اور ملک کے تمام طبقوں اور عوام کے تمام حلقوں کے حقوق کی ناپیدگی کے عکاس و آئینہ دار ہیں ۔

بدعنوانی ، خیانت ، غبن ، تغلّب ، اور رشوت ستانی کسی نہ کسی پیمانے پر سرکاری اہلکاروں کا دیرینہ شیوہ رہے ہیں لیکن مطلق قوت و اختیار اور کسی بھی قسم کی جواب طلبی اور مواخذے سے مستثنیٰ و فارغ ہونے کے باعث اس باوردی نوکر شاہی کو کم از کم دنیاوی سطح پر معصومین کا درجہ عطا کر دیا گیا ہے ان کی معیّب حرکات و سکنات کے حضور تمام اخلاقی و قانونی و انسانی اقدار عاجز ہیں ۔ ان سرکاری حلقوں سے علیحدہ اور غیر وابستہ عوام کی تمام برتیں ان کی بدمعاملگی اور بددیانتی کا شکار ہیں ۔ معیشت میں

چور بازاری اور زیر زمین دھندا روایتی کاروباروں سے زیادہ تندرست و توانا ہے اور اُس کی جسامت بھی بڑی ہے۔ ایک تخمینہ کے مطابق حکومتی بجٹ میں جس سماجی معیشت کے آمد و خرچ کا حساب لگایا جاتا ہے وہ ہماری اصل معیشت کا صرف ۳۰ فیصد حصّہ ہے۔ بدعنوانیوں اور رشوت کو اب محض یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کسی چلتے چلانے نظام کی ناقابلِ لحاظ، ناگزیر کمزوریاں اور خامیاں ہیں بلکہ آج ملکی معیشت کے کسی بھی علمی و حقیقی احاطے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس ہمہ دم موجود عنصر کا باقاعدہ احاطہ کرتے ہوئے اس کی جسامت کے حرکی قوانین کو متعین کرے۔ بصورتِ دیگر تمام معیشی و اقتصادی پیش گوئیاں اور پیش بینیاں غیر سائنسی و غیر حقیقت پسندانہ رہیں گی اور علم اقتصاد اور ماہرین اقتصاد کا منہ چڑاتی رہیں گی۔ اس بدعنوانی اور رشوت ستانی کا جائزہ لئے بغیر ملک کے سماجی طبقاتی ڈھانچے کی تشریح بھی ناقص و نا تمام ہی رہے گی۔ ملک کا عدل و انصاف کا نظام بھی اسی بدعنوانی کی لپیٹ میں ہے جہاں منصفوں نے قانون کی موشگافیوں اور ان کے شارح و نمائندہ وکلاء کو دھکا دے کر یا تو انہیں محض دلال بنا دیا ہے یا پھر براہِ راست فریقین سے رابطہ قائم کر لیا ہے۔ ہمارا معاشرے میں قوت و طاقت کے قانون بالوں پر مبنی کل نظام یعنی سیاسی نظام کی اقسام کے امتیازی اوصاف کی تشریح و توضیح کے لئے ماہرین سیاسیات بادشاہت، عدیدیہ، اشرافیہ، جمہوریہ وغیرہ کے جو عنوانات وضع کئے تھے چور بازاری، چور دفتری اور چور صدلیی کے اس بسیط نظام نے ان سب کو ساکت کر دیا ہے۔ یہ اب حقیقی معنوں میں چور شاہی بن چکی ہے۔

ہماری روایتی حکمت نے ہمیں لوٹ مار کی ترکیب لفظی ورثہ کی ہے۔ بے شک لوٹ مار کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لوٹ مار کے بغیر ناممکن ہے، اور مار بغیر لوٹ کے مارنے والوں کی توانائی کا زیاں ہے۔ چنانچہ ہماری چور شاہی لوٹ، مار، اور پھر لوٹ کے خود رو اور خود افزا دائرے پر گردش کناں ہے۔ جوں جوں لوٹ بڑھتی جاتی ہے، جرائم

تشدد اور قوت تشدد کی نمود و نمائش بھی بڑھتی جاتی ہے۔ دور وحشت و بربریت کی سفاکانہ اور بہیمانہ سزاؤں کو کرید کرید کر نکالا جا رہا ہے اور ان کی نظر یاتی جھاڑ پھونک کر کے ان کا اجراء کیا جا رہا ہے۔ سرعام کوڑوں اور سرعام پھانسیوں سے لوگوں کو خوفزدہ کیا جا رہا ہے۔ ریاستی تشدد کے نئے نئے ادارے قائم ہو رہے ہیں۔ اور ہر ادارے کی جسامت بڑھ رہی ہے۔ ان کو جدید ترین آتشیں اسلحہ سے مسلح کیا جا رہا ہے اور انکو موٹر سائیکلیں، گاڑیاں، جیپیں، پک اپیں دیکر انکو سریع الحرکت بنایا جا رہا ہے اور انکی رفتار عمل بڑھائی جا رہی ہے اب ہیلی کاپٹر دینے کا فیصلہ بھی ہو چکا ہے۔ شہروں میں ہر چوراہے پر، اور دیہات میں ہر ناکے پر، ان کی قوت تشدد کی برہنہ نمائش کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ انہی سے پیوستہ اور منسلک کالے دھن کا نراجیتی تشدد اور لوٹ مار بھی ہے۔

مطلق العنان چور شاہی اور محیط و بسیط لوٹ مار اور جبر و استحصال کی یہ صورت حال ہی وہ پس منظر فراہم کرتی ہے جس میں محنت کش طبقہ اپنا ہر مسئلہ اٹھاتا ہے اور ہر ملکی مسئلہ پر اپنے موقف کی تشکیل کرتا ہے۔ مکمل اور غیر مشروط جمہوریت کے لئے جدوجہد تو محنت کش طبقے کی خود اپنی ضرورت ہے لیکن ایک ایسی صورتحال میں جبکہ مطلق العنانیت کا دور دورہ ہو، اور من مانی آمریت کا راج ہو جو محنت کش طبقے کے علاوہ معاشرے کی دیگر پرتوں اور طبقوں اور عوام کے وسیع حلقوں کو اپنی انانیت کا شکار کر رہی ہو اور وہ بھی باوردی آمریت کی لوٹ مار کا شکار ہوں اور ان میں بھی اس آمریت کے خلاف غم و غصہ کا جذبہ موجزن ہو اور وہ بھی اس بے لگام اور خودسر جابریت اور استبدادی نظام حکومت کے خلاف سپر آزما ہونے کے لئے مضطرب و بے چین ہوں تو محنت کش طبقہ جہاں مکمل اور مستقیم جمہوریت کے لئے اپنی طبقاتی حیثیت کو روبہ حقیقت کرتے کے لئے اپنی آزادانہ صف بندی کرتا ہے اور جمہوریت کے قیام کے لئے عوام کی تاریخی تڑپ

کے قطعی و آخری حل کے لئے خود کو آمادہ و تیار کرتا ہے وہاں وہ معاشرے کے دیگر طبقوں کی جمہوری خواہشات اور بیقراریوں کی حمایت و اعانت بھی کرتا ہے الغرض وہ مطلق العنانیت اور انسانی حقوق سے بے پرواہ و بے اعتنا، سفاک اور زمانۂ وحشت کی یاد تازہ کر دینے والے جابرانہ بندوبست ہائے حکومت کے خلاف بورژوا آزادیوں اور بورژوا حقوق کے لئے مختلف النوع طبقوں اور پرتوں کی جدوجہد کی ترقی پسندانہ ماہیت کی شناخت و اعتراف کرتے ہوئے بورژوا جمہوریت کی ڈولی کا بوجھ بھی اپنے کاندھوں پر اٹھا کر اُسے مسندِ اقتدار تک پہنچانے کے لئے تیار رہتا ہے ۔

اقتدار مطلق کی شارح اور نمائندہ استبدادی باوردی و بے وردی نوکر شاہی نے آج سارے اختیارات کو ایک مرکز پر مجتمع کیا ہوا ہے ۔ اُس نے یہاں پر ایک وحدانی ریاست بنائی ہوئی ہے اور ملک کے تمام طبقے اور تمام قومیں اس واحد مرکز کی تابع ہیں ۔ اس مرکز کی مرضی و منشاء کے بغیر نہ کوئی معاشی سرگرمی ہو سکتی ہے نہ کوئی ثقافتی و ادبی سرگرمی ۔ کارخانہ بھی اسی کی اجازت سے لگتا ہے اور رسالہ، جریدہ اور اخبار بھی اسی کی توثیق سے ۔ صوبائی حکومتیں، صوبائی پارلیمان، صوبائی انتظامیہ، سب ہی زیب داستان کے سوا کسی حیثیت کی حامل نہیں، ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے وحدانی بندوبست حکومت میں جو اختیارات صوبوں کو سونپے گئے تھے آج یہ اُن اختیارات کے حامل بھی نہیں یہ اُن کے مضمحل باقیات رہ گئے ہیں ۔ شہری بلدیہ، ٹاؤن کمیٹیاں اور ضلعی کونسلیں مکڑی کے جالے سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں جن کو جب جی چاہے صاف کر دیا جائے اور جب جی چاہے پھر بن لیا جائے ۔ کوئی ایسا شعبۂ زندگی نہیں جس کی صوبائی وزارت کے سر پر مرکزی وزارت سوار نہ ہو ۔ قانونی و آئینی اعتبار سے پولیس صوبائی محکمہ ہے، لیکن جہاں آئین و قانون کی کوئی بساط نہ ہو وہاں یہ صوبائی تحفظ کیونکر برقرار رہ سکتا ہے اور پھر چور شاہی، چوری اور سرزوری کے اس اہم ترین

بیرم کو اپنی مٹھی سے نکال کر اپنی شہ رگ کو کسی اور کے ہاتھ میں دینے کی متحمل کیونکر ہو سکتی ہے ۔ صوبائی حکومتیں چھوٹی مدوں کی خورد برد کر سکتی ہیں اور ان سے اپنی بساط کے مطابق گلچھرے اڑانے کے لئے غوث علی شاہ تا پاشا کھوڑو تا الحاج شمیم الدین اور دوست محمد فیضی جیسے چھٹ بھیئوں کو بحساب ضرورت چڑھایا اتارا جا سکتا ہے ۔ جھوٹی اور جسی ہوئی ہڈیوں پر ایک دوسرے پر غرانے کے لئے بلدیاتی کونسلروں کی شکل میں آوارہ کتوں کی زنجیر کھول کر انہیں بھی مصروف کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن بڑے شکار پر ، پاکستان کی زمین پر اور نہ صرف زمین پر بلکہ زیر زمین اور فضاء میں تمام قدرتی وسائل پر ، پاکستان کے ۹½ کروڑ عوام کی محنت کی پیدا کردہ تمام دولت اور سرمائے پر ، ان قدرتی وسائل اور پیداوار کو رہن رکھ کر آنے والے تمام بیرونی قرضوں کے اصراف پر ، الغرض تمام محصولاتی وصولیابی اور پورے پیداواری ، تجارتی ، اور رسد و رسائل کے شعبے پر مرکز کا بلاشرکت غیرے دعویٰ ہے ۔ اور اس دعوے کو روبہ حقیقت کرنے ، یعنی اس دعوے کو قبضہ میں تبدیل کرنے کے لئے ریاستی جبر و تشدد کے تمام کل پرزے ، فوج ، پولیس ، انواع و اقسام کی فورسز اور خفیہ اداروں کی نکیلیں بھی اسی مرکز کے ہاتھ میں ہیں ۔ صرف یہ قبضہ سچا ہے باقی تمام دعوے جھوٹے ہیں ۔ ضیا الحق بحیثیت "منتخب" صدر اور بحیثیت سربراہ افواج اس استبدادی ریاست کی ایک محض عارضی حادثاتی مشخص تجسیم ہے ۔ ضیا الحق نام نہاد منتخب صدر ہو کہ واقعتاً منتخب ، مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ، یا ضیا الحق نہ بھی رہے ۔ اور یہ دونوں عہدے کسی فرد واحد میں مرکوز نہ بھی ہوں تب بھی ان حادثاتی زوائد و کوائف کی تبدیلی سے اس وحدانی و مرکزی ریاست کی ماہیت اور جوہر میں کیفیاتی تبدیلی نہیں آتی ۔ یہ جوہر مرکز اور صوبوں اور ضلعوں اور شہروں اور قصبوں کے اختیارات و اقتدار کے تالوں بالوں اور توازن میں مضمر ہے ۔ فرد واحد میں یہ ارتکاز مطلق الصنانیت کی بیہودگی اور بے ہنری کے ثبوت کے علاوہ کچھ نہیں اس نے بدحواسی میں اپنے سر پہ سینگ بھی اگانے شروع کر دیئے ہیں ، اور ہر کس

وناکس کے نظارے کے لئے مطلق العنانیت کا عریاں مظاہرہ شروع کر دیا ہے۔

تاہم اس بیہودہ مطلق العنانیت کا یہ پھوہڑ پن اس کی اپنی امتیازی لغویت ہے اقتدار مطلق کی حامل وحدانی حکومتوں کے لئے ضروری یہی ہوتا ہے کہ وہ مالی و معاشی ذرائع اور وسائل اور تشدد پر اجارہ قائم کر کے انہیں مرکز واحدہ پر مرتکز کریں، لوٹ مار، اور پھر لوٹ کے دائرے کو مسلسل گردش میں رکھیں اور جہاں تک ممکن ہو اس لوٹ مار کی سرگرمی پر تہذیب و شائستگی کا پردہ ڈالیں اور بد اسلوبی سے پرہیز کریں۔ کئی ہزار سال پہلے چانکیہ نے اپنے مطلق العنان بادشاہ کو یہ نصیحت کی تھی کہ جو بادشاہ ڈنڈے کو زیادہ استعمال کرتا ہے وہ اپنی رعایا میں بدامنی پھیلاتا ہے۔ ہمارے باوردی نے د ی اقتدار مطلق کا حق تقدم چاہے کتنا ہی تشنہ اسناد تاریخ ہو اور چاہے وہ اسے کسی قدر بھی اپنے اوچھے پن کا شکار کرتے ہوں انہیں بہرحال مطلق العنانیت کو چلانے کے گر، خفیہ رموز و اسرار اور ادارے سب ہی تاریخی قبائلی اور جاگیردارانہ مطلق العنان آمریتوں اور استعمار دونوں ہی سے بطور ترکہ حاصل ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ اضطراری اور شعوری دونوں سطحوں پر ڈنڈے پر نظریاتی و روحانی، قانونی و آئینی، اخلاقی و آدابی گلکاریوں کے نرم و گداز غلاف بھی چڑھاتے ہیں۔ وہ یہ بھی سیکھ چکے ہیں کہ اس نظریے کا اندرونی مواد اور لباب بھی وحدانی ہونا چاہئے اور نہ صرف اس کی تشہیر و ابلاغ پر اجارہ داری ہونا چاہئے بلکہ تمام تشہیر و ابلاغ اور تعلیم و تعلم چور شاہی کے ہاتھوں میں مرتکز ہونا چاہئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہے۔ لوٹ، بدعنوانی خیانت اور رشوت میں برق رفتار اضافے میں ایک جانب اسلحہ اور وردی اور کوڑوں پھانسیوں کی سرعام نمائشوں کی افزونی میں دوسری جانب اور اسلامی قومیت اور پاکستانی قومیت کی تشہیر و تکثیر میں تیسری جانب عنصر بہ عنصر ایک ہی سرعت سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور لوٹ، تشدد اور نظریہ کی اس تثلیث کے تینوں لازم و ملزوم کونے پھیلتے ہوئے معاشرتی زندگی کے ہر گوشے پر محیط ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم پہلے ہی

کہہ چکے ہیں کہ لوٹ تشدد کے بغیر ناممکن ہے اور تشدد لوٹ کے بغیر مہمل ۔ یہی دوطرفہ ربط و تعلق تشدد اور نظریے میں ہے ۔ تشدد یا مار ایک جانب اور دوسری جانب نظریے، اصولوں اور قوانین وغیرہ کے درمیان بھی یہی ربط ہے بے لگام بے حساب اور بے لباس تشدد فعل عبث ہے اسے بہت جلد نظریے، قانون اصولوں، ضابطوں کی شکل دے کر اور برہنہ قوت و طاقت کے بل پر پیدا کردہ رشتوں کو آئینی و قانونی ضابطوں میں منضبط و منجمد کرنا پڑتا ہے، یعنی برہنہ تشدد کے ذریعے پیدا کردہ زیردست اور زبردست کے رشتوں کو حاکم و محکوم کے رشتوں کی صورت میں مستحکم کرنا ہوتا ہے اور ان پر اخلاقی و روحانی ملمع چڑھا کر انکو ابدیت بخشنی ہوتی ہے ۔ صرف اس اخلاقی و روحانی آب و تاب کے ظاہر میں برہنہ تشدد پر مبنی باطن کو چھپا کر ہی لوٹ مار کے نظام کو وہ استحکام دیا جاسکتا ہے کہ ظاہرا امن و شانتی میں نہ صرف لوٹ مار جاری رہے بلکہ بے لگام لوٹ اور وحشیانہ سفاکی نہ صرف 'حق' اور 'اختیار' کا روپ دھارلے جسے لوگوں کی رضاکارانہ اطاعت حاصل ہو بلکہ ایسی ابدی صورت حال نظر آئے جسے خداؤں، فطرت اور مقدر کی توثیق حاصل ہو، اسی نظریاتی و آئینی تام جھام کے طفیل مطلق العنانیت خطیبانہ و معلمانہ و ناصحانہ معصوم منفعتی اور سادہ لوحی لیے اخلاقی و اصولی وعظ اور پند و نصیحت بھی کرسکتی ہے اور بے ہمہ و باہمہ منصف منفعتی سے حکیم بھی بن سکتی ہے ۔ لیکن جہاں ایک جانب یہ روحانی، و نظری اور ثقافتی ساز برہنہ تشدد کی ضرورت ہے وہاں دوسری جانب خود یہ نظریاتی ڈھانچے بھی برہنہ تشدد پر قائم ہوتے ہیں ۔
روایتی مطلق العنانیتوں کے نظریے ساز ہمیں ایک بار پھر نظریے اور روحانی سازوسامان اور آلات تشدد کے اس انحصار باہمی کا بے لاگ اظہار کرتے نظر آتے ہیں ۔ آرت شاستر کے ایک بند میں کہا گیا ہے کہ 'ڈنڈا تمام محکوموں پر حاکم ہے ۔ ڈنڈا جاگتا رہتا ہے جبکہ سب سوتے ہیں ۔ اور داناؤں کا کہنا ہے کہ ڈنڈا ہی دھرم ہے ۔ ملک کے اندر قانون اور رسم و رواج کے راج کا بنیادی یار و مددگار ڈنڈا ہی ہے ۔' بعد میں چانکیہ نے ڈنڈے کے فلسفے کو منظم علم

کی صورت دیتے ہوئے واضح الفاظ میں کہا کہ' ذات جاتی نظام پر مبنی مذہبی قانون'
فلسفہ اور معیشت تینوں کی بنیاد ڈنڈا ہے۔ ڈنڈا ہی اُن پیچیدہ مفادات کا دفاع کرتا ہے
جن کو مذہبی قانون، روایتی فلسفہ اور روایتی معیشی رشتوں کی توثیق حاصل ہے۔ چنانچہ ضابطہ
قانون، درس اخلاق، اختیار و اقتدار کے مسلمہ اداروں، اور نظری و روحانی ساز و سامان
کے پردے کے عقب میں برہنہ تشدد کے اداروں اور پولیس اور فوج کے خون آلود جبڑے
اور پنجے صاف نظر آتے ہیں اور ہر بحرانی موقع پر موقع بہ موقع نمودار ہوتے رہتے ہیں۔
الغرض لوٹ، مار، اور وحدانی نظریہ اور اُس کے ابلاغ سب پر اجارہ
اور اپنی ذات میں ان سب کا ارتکاز مطلق العنانیت اور استبداد کا خاصہ
ہیں۔ پاکستان میں آمریت نے تمام مالی و معاشی وسائل، ریاستی تشدد کے تمام اداروں
اور تمام ابلاغ و تشہیر کو اپنے ہاتھوں میں مرتکز و محدود کیا ہوا ہے۔ اور چونکہ یہ مطلق العنانیت
بیہودہ اور ناتراشی بھی ہے اس لئے اس کے لئے ضروری تھا کہ مالی و معاشی پر قبضہ، تشدد
پر اجارے، اور نظریے کی کسی فرد واحد میں مشخص تجسیم کرے۔ ضروری تھا کہ ضیا الحق بنج
وقتہ نمازی بھی ہو اور اُس کے گرد روحانی ہالہ بھی ہو۔ جو کھلی لوٹ مار کو مخفی بھی کرے
اور اُسے برکت بھی دے۔

قوت و طاقت اور اقتدار و اختیار کا یہ محیط و بسیط ارتکاز مطلق العنان استبدادیت
کا خاصہ ہے اسی کی مطابقت سے محنت کش طبقہ اور اس کی سیاسی صف بندی طاقت کے
عدم ارتکاز کو اپنے سیاسی منشور کا ناقابلِ مصالحت ستون قرار دیتے ہوئے طاقت کے
عدم ارتکاز کی تحصیل کے لئے بھرپور جد و جہد کرتی ہے۔ محنت کش طبقہ جہاں استبداد
اور آمریت کے مکمل خاتمے کے لئے بے شمار دیگر پہلوؤں سے اُس پر ضرب لگاتا ہے وہاں وہ
اُس کی بنیاد کھودنے کے لئے اُس کے محیط و بسیط ارتکاز کی تحدید کرنے کی کوششیں بھی کرتا
ہے۔ محنت کش طبقہ جانتا ہے کہ گرچہ معاشرے کے دوسرے طبقے اور پرتیں حتیٰ کہ سرمایہ دار

اور زمیندار تک اور متوسط طبقوں کے لوگ بھی اس حاوی استبداد کے بھاری بوجھ تلے کسمسا رہے ہیں تاہم اس کے بھاری بوجھ تلے محنت کش طبقہ اور مجبور محنت کش عوام ہی سب سے زیادہ پستے ہیں۔ کارخانہ جاتی سرمایہ دار ان گنت محکموں کے اہلکاروں کے بھتوں کی ادائیگیوں کے آگے بے بس ولاچار ہے اور ہمہ دم ان کے سامنے دست بستہ کھڑا رہتا ہے، تجارتی سرمایہ بھی اس کے سامنے سرنگوں ہے اور زمیندار بھی۔ ادنیٰ بورژوازی کے چھوٹے کاروباری سرکاری محکموں اور پولیس کے محکمے کے عملے کو تاوان ادا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ بے بس ولاچار محنت کش عوام ہیں۔ مطلق العنانیت کے استبداد و جبر کا بار سب سے زیادہ انہی پر لادا جاتا اور اُس کی من مانیوں اور من موجیوں کا شکار بھی سب سے زیادہ یہی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گرچہ اس ارتکاز اور مطلق العنانیت کا قطعی سدّباب صرف اُسی صورت میں ہوگا کہ محنت کش طبقے کا راج قائم ہو اور محنت کش طبقہ ہی عدم ارتکاز قوت کا سب سے زیادہ صاحب استقلال اور صاحب استقلت شارح ہے اور وہ جانتا ہے کہ محنت کش طبقے کی بالادستی کے قیام کے نتیجے میں ہی قدم اُس راہ پر گامزن ہونا شروع ہوں گے جو بالآخر قوت و اقتدار کے مطلق العنان مرکزۂ واحدہ کو نیست و نابود کرنے کے علاوہ تمام دیگر مرکزوں کو منتشر کر کے بالآخر کھیتوں کھلیانوں اور فیکٹریوں اور دفاتر میں آجروں کی ملوکیت کے تمام دعووں اور تانوں بانوں کو ادھیڑ کر عوام کے مقدر کی باگیں خود عوام کے ہاتھ میں دے دیں گے تاہم وہ دریں اثناء مطلق العنانیت اور جابریت کی تحدید کے لئے عدم ارتکاز کے تمام منشوروں، پروگراموں اور مطالبوں کی حمایت کرتا ہے۔ اس عدم ارتکاز کے طالب کے ذاتی و طبقاتی اوصاف سے قطع نظر عدم ارتکاز کے مطالبے کی جمہوری و ترقی پسندانہ اساس کی شناخت کرتے ہوئے اُس کی غیر مشروط حمایت کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ عدم ارتکاز جمہوری جدوجہد کا بنیادی، عمومی اور آفاقی اصول ہے اور مطلق العنانیت اور جابریت کا قاطع ہے۔ وہ صوبوں، ڈویژنوں، ضلعوں، تحصیل، بلدیہ، ٹاؤن کمیٹیوں اور تمام چھوٹے اداروں

کے حقوق واختیارات پر مرکز کے غاصبانہ ڈاکوؤں کے خلاف احتجاج کرتا ہے اور مزید طاقت واختیار کے لیے اُن کی آرزوؤں کی حمایت کرتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ ان اداروں پر قابض افراد، جماعتوں اور طبقوں کے اوصاف تک سے چشم پوشی کرنے کو تیار رہتا ہے۔

بلاشبہ عدم ارتکاز جمہوریت کا آزادانہ وصف ہے۔ وہ انتخابات اور جمہوریت کے دوسرے اوصاف سے مشروط نہیں۔ انتخابات کے ذریعہ بھی ایک جمہوری مضبوط مرکز قائم ہو سکتا ہے۔ انتخابات کے نتیجہ میں بھی صدر کی صورت میں کسی فرد یا پارلیمان کی صورت میں کسی ادارے اور اُن کے چنیدہ اہلکاروں کے ہاتھوں میں تمام قوت واقتدار مرتکز ہو سکتا ہے۔ صرف انتخابات ہی کسی سیاسی نسخہ کے جمہوری تشخص کی ضمانت فراہم نہیں کر سکتے۔ قوت واقتدار کا عدم ارتکاز جمہوریت کا ایک آزادانہ وصف ہے جس کی تحصیل کے بغیر جمہوریت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ جب جمہوری طرز حکومت تک میں یعنی اُس طرز حکومت تک میں عدم ارتکاز کے اصول کی روح پھونکنا ضروری ہوتا ہے جہاں اقتدار اعلیٰ کامل طور پر منتخب ہو اور اُس کی جمہوری حیثیت غیر متنازعہ فیہ اور مسلّم الثبوت ہو تو پھر مطلق العنانیت میں جس کی کوئی تاریخی سند نہیں، کوئی سیاسی استحقاق وجواز نہیں جو صرف آتشیں اسلحہ کے بل پر دھونس دھپّہ کر رہی ہے کیونکر یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اُسے طلب مبارزت کئے بغیر ہی تمام اقتدار واختیار کو اپنی آغوش میں مرتکز کرنے کی کھلی چھوٹ دے دی جائے۔ ہماری مخصوص صورت حال میں جبکہ ایک ایسی طرز حکومت جاری ہے جس کا خاصہ ہی یہ ہے کہ وہ روزافزوں معاملوں اور تمام فیصلوں کا ارتکاز اپنی مٹھی میں کرتی جائے ایسے مستبد اور جابر نظام حکومت کیخلاف جمہوری جدوجہد منشور کا امتیازی ومنفرد عنصر عدم ارتکاز کا مطالبہ ہی ہوگا۔ عدم ارتکاز کی ترکیب لفظی جمہوری نصب العینوں کے وہ پیرول نعرے اور الفاظ ہوں گے جن سے جمہوریت پسند دوست دشمن کی تمیز کرتے ہیں۔ عوام کو درپیش مسائل ومعاملات کو نمٹانے اور طے کرنے کے لئے آخری وقطعی فیصلے کے شریک مراکز کی تکثیر اور

قوت و اقتدار کی تقسیم اور بٹوارے کے لئے مطالبے اور جد و جہد میں مطلق العنانیت کی قطع برید اور تخفیف میں کلیدی اہمیت کی حامل ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ عوام کی جمہوری تمناؤں اور آرزوؤں کی نمائندہ اور دعوے دار سیاسی جماعتوں کی مرکزی کمیٹیاں چاہے کوئی قرار دادیں منظور کرتی رہیں مجبور و بے بس عوام جہاں مطلق العنانیت کو فیصلہ کن دھکا دینے کے لئے مضطرب رہیں گے اور ایسی سیاسی صف آرائی کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے رہیں گے جو پورے سرمایہ دارانہ، ماقبل سرمایہ دارانہ، نیم جاگیر دارانہ، جاگیر دارانہ، قبائلی وغیرہ سماجی پیداواری رشتوں اور نیم نوآبادیاتی اور بالادستی آمریت کے تسلط کو اکھاڑ پھینکنے کے لئے اُن کی اجتماعی قوت کو مرتکز کرے وہاں وہ مطلق العنانیت کے چہار اطراف پھیلے ہوئے ڈراؤنے اور گھناؤنے پنجوں کی جزوی کاٹ چھانٹ کے لئے انہیں ملکی زندگی کے جس گوشے کو اس استبداد کے پنجوں سے قدرے نجات دلانے اور اُس پر اپنا فیصلہ اور اپنا ارادہ حاوی کرنے کے مواقع اور امکانات جب بھی مہیا ہوں گے وہ اُس راستہ سے گھس پیٹھ کر رستہ نکالنے کے لئے دنیا تلے اُوپر کرنے سے دریغ نہیں کریں۔ اور محنت کش طبقہ جس کے کاندھوں پر یہ تاریخی فریضہ آن پڑا ہے کہ وہ تمام محنت کش عوام اور استحصال و جبر کے تلے پستے ہوئے تمام عوام کے مصائب کے قطعی خاتمے کے لئے جد و جہد میں ہراول کا کردار ادا کرے ایسی تمام جد و جہد وں کا گرمجوشی سے خیر مقدم کرتے ہوئے معاشرے میں اپنی خصوصی حیثیت کے باوصف معاشرے کے گوناگوں مسائل کے بارے میں اپنے خصوصی موقف اور نقطہ ہائے نظر کی چھاپ لگانے کے لئے ہر ممکن ذریعہ اور وسیلہ استعمال کرے گا۔ معاشرے کی دوسری مظلوم پرتوں اور بالعموم عوام میں جب بھی گہما گہمی پیدا ہو گی اور ابھار آئے گا محنت کش طبقہ بھی بالضرور گرمائے گا چاہے خود اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی محنت کشوں کی خود رائے اور خود مُقرر کردہ جماعتیں عوام کے ان ابھاروں سے کتنی ہی غیریت کیوں نہ برتیں اور بطور

اعتذار ان ابھاروں کے رجعتی مواد پر کتنا ہی واویلا کیوں نہ کریں۔ بالعموم عوام اور محنت کش طبقہ دونوں ہی اپنے مسائل کے حل کے لئے مہدی اور مسیح موعود کی آمد سے قبل بھی کمر بستہ ہو کر کھڑے ہوتے رہتے ہیں۔ وہ اقتدار مطلق کو نیست نابود کرنے کے لئے کوششیں کرنے کے علاوہ اس ناشنوَمن ماتبیت کے قبضہ سے سیاسی مکان کے کچھ حلقوں کی گلو خلاصی کرا کر اُن پر اپنی جمہوری تمناؤں کی بالادستی کے قیام کی تگ و دو بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ تعلیمی ادارے اور اساتذہ و طلباء اپنی خود مختاری کے لئے جدوجہدیں کرتے رہتے ہیں اور ملکی زندگی کے ایک شعبے کو یک سنگ ستون مطلق العنانیت کی ناروا صریح مداخلتوں سے امکانی حد تک محفوظ کر کے ایک کنج عافیت تراشنے کے آرزومند رہتے ہیں، اور رہیں گے۔ شہری بلدیہ اور ضلعی اور ٹاؤن کمیٹیاں اپنے خصوصی دائرہ اختیارات کا رقیبانہ دفاع کرتی ہیں اور اس دائرۂ اختیارات کو بڑھانے کے لئے اور اس دائرہ اختیارات پر فوجی استبداد کے تجاوزات کے خلاف پُرعزم جدوجہدیں کرتی ہیں۔ ان اور ایسی ہی دیگر تحریکوں میں شامل مطلق العنانیت کے سامنے صف آراء معاشرے کے مختلف طبقوں اور پرتوں کی دھوم دھام میں محنت کش طبقہ بھی جھوم کر شامل ہوتا ہے۔

اور اسی ناطے سے محنت کش طبقہ قوموں کی حق خود ارادی کی بھرپور حمایت کرتا ہے یوں تو محنت کش طبقہ کسی بھی کثیر القومی ملک میں ہمیشہ قوموں کے حق خود ارادی کی حمایت کرتا ہے لیکن کسی بھی ایسے کثیر القومی ملک میں جہاں بنیادی جمہوری حقوق اور آزادیاں سلب ہوں، جہاں قدیم جاگیر دارانہ شہنشاہتوں کی طرز پر عمل پیرا مطلق العنان فوجی آمریت قابض ہو۔ جو تمام جمہوری و انسانی اقدار سے نابلد ہو اور جدید زمانے میں از کار رفتہ نظریوں کے پردے میں تمام لوگوں کے شہری و سماجی و سیاسی حقوق پر ڈاکہ ڈال رہی ہو، وہاں چھوٹی اور مغلوب قومیتوں کے لوگوں پر اس جبر و استبداد کا ہاتھ ذرا بھاری پڑنا لازمی امر ہے۔ اور نتیجے کے طور پر ایسے ممالک میں محنت کش طبقے کے لئے لازم ہو جاتا

ہے کہ وہ قومیتوں کے حقوق کی حمایت کرے۔ اور ان کے حق خود ارادی کے لئے آواز بلند کرے۔ محنت کش طبقہ بین الاقوامیت پر یقین رکھتا ہے اور تنگ نظر تعصب کو رد کرتا ہے لیکن اگر کسی ملک میں مطلق العنانیت کا دور دورہ ہو اور وہاں فوجی آمریت اور وردی بے وردی نوکر شاہی تمام قواعد و ضوابط اور آئین پر بالادست ہو تو محنت کش طبقہ لازمی طور پر چوکنا رہتا ہے۔ اور ایسی مطلق العنانیت کی بین الاقوامیت سے اپنی بین الاقوامیت کو ممیز کرنا اپنا فرض اولین گردانتا ہے۔

کسی بھی ملک میں جبر پر قائم بین الاقوامیت کی تجسیم اُس کے امن عامّہ کے اداروں اور دیگر متعلقہ اداروں کی قومی ساخت میں ہوتی ہے۔ برطانوی استعمار کے بارے میں اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ اُس نے براہ راست حکومت کے بجائے بالواسطہ حکومت کے اصول کو قائم کیا تاہم فوج کے معاملے میں یہ درست نہیں۔ برطانوی استعمار نے بالعموم فوج کے سلسلہ میں یہ اصول اپنایا ہوا تھا کہ ہندوستان جیسے کثیر القومی ملک میں ایک جگہ کی رجمنٹ دوسری قوم یا مذہب کے علاقے میں تعینات ہو۔ لیکن جب ۱۸۵۷ء میں قومی جبر کے لئے یہ حربہ بھی مطلوبہ حد تک موثر ثابت نہ ہوا تو اس پر اس اصول کا اضافہ کیا گیا کہ برٹش انڈین آرمی میں ہر دو مقامی باشندوں پر ایک برطانوی باشندہ ہوگا۔ اس کے علاوہ افسروں کے عہدوں پر تو عملاً انگریز ہی فائز تھے۔ اعداد و شمار کے مطابق برٹش انڈین آرمی میں ۶۰۰۲ انگریز افسر، ۴۱۶۵۲ انگریز سپاہی اور ۱۲۳۲۵۴ مقامی سپاہی تھے۔ اس فوج میں صرف ۸۰ مقامی کمیشنڈ افسر تھے۔ پہلی اکتوبر ۱۹۳۹ کو اس فوج میں ۴۰۲۸ انگریز افسر، اور صرف ۳۹۶ مقامی افسر تھے۔ ہمارے ملک کی موجودہ صورت حال میں فوج کی قومیتی ساخت کی شماریات تو دستیاب نہیں لیکن اس ادارے کی ترکیبی ساخت اتنی واضح ہے کہ شاید شماریات کی ضرورت بھی نہیں۔ علاوہ ازیں حکومتی جبر کے دوسرے اداروں پولیس، اور مختلف خفیہ

محکموں کی ساخت بھی سب پر واضح ہے ۔ اس قومیتی ترکیب کو اگر ملک میں واضح مطلق العنانیت ، لاقانونیت ، بدعنوانیوں اور نراجیت کے پس منظر میں دیکھا جائے تو اسبات کی وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی کہ ایسی صورتحال میں چھوٹی قومیتوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ بالخصوص چھوٹی قومیتوں کے محنت کشوں ، مزدوروں ، کسانوں اور عام لوگوں پر کیا گزرتی ہوگی جو اُوپری طبقوں اور پرتوں کے لوگوں کی مانند نہ تو "تعلقات" رکھتے ہیں اور نہ ہی رشوت دینے کے لئے اُن کے پاس پیسہ ہے ۔ اور نہ ہی ملک میں کوئی عدالتی نظام ہے جہاں غریب کی شنوائی ہو۔ کیا ایسی صورت میں کوئی بھی بین الاقوامیت پسند محنت کش اپنے جمہوری پروگرام سے قومیتوں کے حقوق کے مطالبوں اور قومیتوں کے حق خود ارادی کو جدا کرکے اپنی پاکئی داماں کی حکایت سنا سکتا ہے ؟ نہیں قطعی نہیں! قوموں کا حق خود ارادی پاکستان کی جمہوری تحریک کا لازمی حصہ ہے ۔

اور اس حق خود ارادی میں حق علیحدگی شامل ہے ۔ جس طرح حق خود ارادی شخصی ، شہری ، سماجی ، سیاسی و اقتصادی حقوق سمیت تمام انسانی حقوق کی اساس ہے اسی طرح قوموں کا حق علیحدگی اُن کے تمام دیگر حقوق کی ضمانت ہے ۔ جس طرح عورت کو چاہے تمام حقوق دے دیئے جائیں لیکن اگر اُس کو حق طلاق حاصل نہ ہو تو اُس کے تمام حقوق بے معنیٰ و بے کار ہو جائیں گے ، اسی طرح حق علیحدگی کے بغیر قوموں کے حقوق کی تمام گفت گو عبث ہوگی ۔ جس طرح عورت کا حق طلاق اُس کے حقوق کی پامالی کی صورت میں اسکو وہ آخری و قطعی حق دیتا ہے جو اُسکے حق انسانیت کا تحفظ فراہم کرتا ہے اور دیگر تمام حقوق کی تصدیق کرتا ہے اُسی طرح قوموں کا حق علیحدگی اُن کے تمام دیگر حقوق کی ضمانت اور توثیق فراہم کرتا ہے ۔ محنت کش طبقہ بین الاقوامیت پر یقین رکھتا ہے لیکن یہ بین الاقوامیت جبر و استحصال سے پاک ہے اسی لئے اُس کی بین الاقوامیت قومیتوں کے پُرامن اشتراک اور اُن کی پُرامن علیحدگی کو مفروض کرتی ہے ۔

محنت کش طبقہ جس وقت سیاسی منظر پر نمودار ہوتا ہے اُس وقت وہ پہلے دن سے کثیر القوی ریاستوں کو موجود پاتا ہے ۔ یہ ریاستیں جاگیردارانہ شاہانہ ، سرمایہ دارانہ اور استعماری جبر کا نتیجہ ہیں ۔ محنت کش طبقہ جبر و استبداد کی ان اقسام کے اجراء پر آنکھیں موند کر نہیں بیٹھا رہ سکتا ۔ وہ لازماً ایسے اداروں کی تشکیل کے لئے جدوجہد کرتا ہے جن کے سیاق میں قوموں کی پُرامن علیحدگی ممکن ہو ۔

تاہم اس حق علیحدگی کا مقصد یہ نہیں کہ تمام قومیں لازماً علیحدگی اختیار کر لیں ۔ نہ ہی اس سے یہ خدشہ پیدا ہونے کی ضرورت ہے کہ قومیں علیحدہ ہو جائیں گی ۔ جس طرح عورتوں کے حق طلاق کا لازمی مقصد یہ نہیں نکلا کہ تمام عورتوں نے اس حق کو استعمال کر لیا ہو اسی طرح قوموں کی حق علیحدگی کا مفہوم یہ نہیں کہ تمام قومیں اس حق پر عملدرآمد کر گزریں گی ۔ بلکہ یہ حق محنت کشوں کی بین الاقوامیت کے اصول یعنی قوموں کے پُرامن اشتراک کی واحد ضمانت ہے ۔ نہ ہی اس بات کا مفہوم یہ ہے کہ محنت کش طبقہ لازمی طور پر ہر ٹھوس علیحدگی کی تحریک کی حمایت کرے گا ۔ واضح رہے کہ محنت کش طبقہ صرف حق علیحدگی کی حمایت کرتا ہے ۔ جس طرح عورت کے حقِ طلاق کے ہر حامی پر یہ فرض عائد نہیں ہو جاتا کہ وہ ہر انفرادی عورت کے ہر مخصوص مطالبۂ طلاق کی حمایت کرے اسی طرح قوموں کے حق علیحدگی کا مطالبہ کرنے والے محنت کش طبقہ پر یہ فرض عائد نہیں ہو جاتا کہ وہ علیحدگی کے ہر مطالبے کی حمایت کرے ۔ محنت کش طبقہ محض حق علیحدگی کی حمایت کرتا ہے اور علیحدگی کے مطالبوں پر اپنے آزادانہ موقف اختیار کرنے کا حق برقرار رکھتا ہے ۔

محنت کش طبقہ بین الاقوامیت پر یقین رکھتا ہے اور بین الاقوامیت پر اسی یقین کے ناطے وہ جبر پر قائم بین الاقوامیت کی تمام صورتوں کی نفی کرتا ہے ۔ اور اسی اصول کے پیشِ نظر جہاں وہ قوموں کے حق علیحدگی کی حمایت کرتا ہے وہاں وہ قوموں

کے پُرامن اشتراک کی ہر ممکن سعی بھی کرتا ہے۔ وہ مختلف اقوام کے محنت کش طبقوں کو متحد کر کے انہیں ایک بین الاقوامی تنظیم میں منسلک کرتا ہے۔ اسی بین الاقوامیت اور اس کی نمائندہ جماعت کے ناطے جابر اقوام کے محنت کش بھی مجبور اقوام پر جبر کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور مجبور اقوام کا محنت کش طبقہ جابر اقوام کے حکمران طبقوں کے جبر کے خلاف کشمکش کرتے ہوئے وہاں کے محنت کش طبقے کے خلاف زہر نہیں اگلتا بلکہ اُن کو اپنا حلیف وحامی ہی گردانتا ہے۔

محنت کشوں کی اسی بین الاقوامیت کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ قوموں کے حق علیحدگی سمیت اُن کے حق خود ارادی کی مکمل حمایت کی جائے۔ اور چونکہ پاکستان میں ایک مطلق العنان آمریت قائم ہے جس کے ریاستی جبر کے اداروں پر "عظیم مارشل" قوم کا قبضہ ہے اس لئے محنت کشوں کا یہ فرض ہے کہ وہ چھوٹی قومیتوں کے ہر علاقے میں زیر ذکر اداروں کی خلاف معمول موجودگی نقل وحرکت اور کارروائیوں اور جبر کے استعمال کی ہر صورت کی بھرپور مخالفت کریں۔ اور ہر اُس قوت کی مخالفت کریں جو اس جبر کی حمایت کرتا ہے یا اُس کی کسی بھی طور ملمع سازی کرتا ہے ملکی زندگی کے کسی بھی معاملے میں کسی بھی قومیت کی کسی دوسری قومیت پر برتری اور اُس کے تحفظات کی مخالفت کریں اور ہر معاملے میں برابری اور مساوات کا تیقن کریں۔ یہ مطالبہ کریں کہ ہر قومیت کو دستوری طور پر حق علیحدگی حاصل ہو جس کا فیصلہ استصواب رائے سے ہو۔ نیز پاکستان میں عام انتخاب کے ذریعے صوبوں، ڈویژنوں اور ضلعوں اور انتظامی علاقوں کی تقسیم نو کی جائے اور ہر علاقے کو ممکنہ حد تک زیادہ سے زیادہ خود مختاری حاصل ہو اور ان کے انتظام وانصرام میں منتخب اداروں کو بالادستی حاصل ہو۔ نیز ان مطالبوں پر مؤثر جدوجہد کیلئے محنت کش طبقے کیلئے ضروری ہے کہ وہ بین الاقوامی بنیادوں پر پاکستان کی تمام اقوام پر محیط تنظیم کیلئے کوشاں ہو۔

پاکستان کے مخصوص حالات میں "پاکستانی" قومیت اور دیگر "قومیتوں" میں ایک جانب اور خود دیگر "قومیتوں" کے مابین اس چومکھی کش مکش میں نئی قومیتوں کی افزائش کی گنجائش بھی ہے اور نئی قومیتیں جنم بھی لے رہی ہیں۔ مہاجر قومیت اپنے آپ کو قائم بالفعل کر چکی ہے گرچہ ہمارے قومیتوں کے "کیمیا گروں" اور قومیت کو قومیت کی تعریف اور کسوٹی پر کس کر دیکھنے والے اس کی اسناد کو از روئے قانون رد کر چکے ہیں۔ اس کے برعکس سرائیکی قومیت کی اسناد کو از روئے حق تسلیم کیا جا چکا ہے گرچہ ابھی سرائیکی قومی تحریک کی کونپلیں پھلنا پھولنا ہی شروع ہوئی ہیں مزید کے بھی امکانات ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ مختصر جواب یہ ہے۔

پاکستان میں سرمائے اور سرمایہ داروں کے کچھ گروہ، انتہائی طاقتور گروہ اپنی ان ماقبل سرمایہ دارانہ مذہبی اور نیم مذہبی برادریوں کی بنیاد پہ ہی قائم تھے جنہوں نے معاندانہ جاگیردارانہ بطن میں سرمائے کو تحفظ فراہم کیا تھا۔ ایک ایسی صورت حال میں جبکہ بیشتر پاکستان نیم جاگیر دارانہ رشتوں میں جکڑا ہوا تھا اور وہاں ابتدائی اضعاف سرمایہ کا عمل ابھی شروع نہیں ہوا تھا اس سرمائے نے پاکستان کے طول و عرض میں اپنے پھیلتے ہوئے نفوذ کو "پاکستانی قومیت" اور "مسلم قومیت" کے نظریے کی چھت ہی فراہم کی نیز سرمائے کی باہمی چپقلش اور کش مکش کے لیے دلی سوداگر، چنیوٹی، میمن، گجراتی وغیرہ برادریاں مطلوبہ سرمایہ دارانہ گروہ بندیوں کی فراہم کرتی رہیں اور اس جنگ کو کامیابی سے نمٹانے کے لیے تقاضوں کی تکمیل کرتی رہیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زراعت میں سرمایہ داریت دخول کے نتیجے میں ان علاقوں میں بھی ابتدائی اضعاف سرمایہ ہوا جہاں جاگیردارانہ رشتے حاوی تھے پنجاب میں اس نئے سرمائے کے ساتھ چنیوٹی اور دیگر پنجابی سرمایوں نے باہم مل کر "پاکستانی قومیت" کو اغوا کر لیا سندھ اور پختون علاقوں میں ابھرنے والے۔ تیزی سے بڑھتے ہوئے سرمائے نے اپنے مخصوص تاریخی اقتصادی و سماجی حوالوں سے "اپنی اپنی" قوم مشخص کر لی ہے سرمایوں کی کش مکش اب ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو گئی کہ محض برادریوں

کے بل پر اس کشمکش میں اپنے پاؤں پہ کھڑا رہنا ممکن نہ رہا۔ سرمایہ داروں کے چند بڑے گروہوں سے "پاکستانی قومیت" بھی چھن چکی تھی اور ان کے پاس "اپنی" قوم بھی نہ تھی۔ چنانچہ مہاجر قوم میں ان میں سے کچھ کو "اپنی" قوم دستیاب ہوئی۔ رہ گیا معاملہ میمن، گجراتی وغیرہ کا انہوں نے کچھ عرصے سندھی "قوم" سے اٹھکیلیاں کیں اور سندھی قوم سے پرانے ناطوں کو نکالنے کا تجربہ کیا لیکن بخیف تر سندھی سرمائے کی جھڑکیوں اور دھتکار کے نتیجے میں اس وقت، عین اس وقت جب کہ یہ مضمون رقم کیا جا رہا ہے میمن اور گجراتی سرمائے اور مہاجر قومیت میں پینگیں لڑنے کا عمل جاری ہے اور دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ مہاجر سرمایہ، سرماؤں کی جنگ میں میمن، گجراتی سرمائے وغیرہ وغیرہ کو اپنا اتحادی بنا رہا ہے اور امر معلوس کے طور پر ان تمام سرماؤں کی مشترکہ "اپنی" قوم بالفعل بھی تشکیل ہو رہی ہے اور "مہاجر" سرمائے اور سرمایہ داروں کے قومی گروہ کی پنکھڑیاں بھی باہم جڑ کر پھول بن رہی ہیں۔

پاکستان کے سماجی و اقتصادی ارتقاء میں ایک اور عمل بھی رو پذیر ہو رہا ہے جس کے نتیجے میں مزید "قومیتوں" کا رونما ہونا ممکن ہے پاکستان میں ابھی بھی بعض علاقوں میں جاگیردارانہ یا ماقبل جاگیردارانہ رشتے جاری ہیں تاہم یہاں پر بھی گرد و پیش میں سرمایہ دارانہ رشتوں کی تیز بڑھوار اور خود ان علاقوں میں بھی سرمایہ داریت کے مختلف اوصاف کے نمو کے نتیجے میں ابتدائی اضعاف سرمایہ کا عمل ہو رہا ہے۔ یہ سرمائے بھی یقیناً محنت، منڈی اور وسائل کے لیے سرماؤں کی کشمکش کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے "اپنی" قوم کی تلاش میں ہوں گے اگر موجود سرماؤں نے انھیں "اپنی" اقوام میں جگہ نہ دی تو یہ بھی یقیناً اپنے تاریخی سماجی و اقتصادی حالات کی مطابقت سے "اپنی"، موزوں حال قومیت یا قومیتوں کی کھوج لگائیں گے۔ سرائیکی قومیت اسی عمل کے نتیجے میں روز افزوں طور پر حقیقت پذیر ہو رہی ہے، یوں ان عملوں کے نتیجے میں پاکستانی ریاست میں "پاکستانی قومیت" اور "مسلم قومیت" اور چار قومیتوں (بعض کے

کے مطابق پانچ، بعض کے مطابق چھ) کے علاوہ مزید قومیتیں مندکرہ بالا چوتھی جنگ میں شریک ہوجائیں گی۔ اور "قومی مسئلہ" کو پاکستان کا اہم ترین سیاسی مسئلہ بنانے میں اپنا کردار ادا کرنے لگیں گی "پاکستانی سرمائے" اور دیگر "قومی" سرماؤں اور خود ان "قومی" سرماؤں کے مابین ربط و تصادم کے متذکرہ بالا اوصاف کے تناظر میں ہی محنت کش طبقہ "قومی مسئلہ" پر اپنے نقطۂ نظر کی تشکیل کرتا ہے۔ وہ "پاکستانی" سرمائے سمیت تمام سرماؤں کے مسئلہ کو بیک وقت اٹھاتا ہے۔ وہ بیک وقت "پاکستانی" قومیت کی جارحیت اور دیگر "قومیتوں" کی جارحیتوں کو رد کرتا ہے۔

وہ کسی ایک "سرمائے" کے دوسرے سرماؤں کے خلاف مطالبات کو نہیں اٹھاتا بلکہ چونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ سرمائے نہ صرف باہم متصادم ہیں بلکہ اُن کے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ گہرے معاہدے بھی ہیں، اور یہ تصادم اور یہ اتحاد ایک مربوط کلیت میں گندھے ہوئے ہیں اس لیے وہ ان سرماؤں کے پُرتناؤ ربط میں سے صرف تناؤ کے ناقابلِ علیحدگی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے، صرف اس ایک رُخ کی بنیاد پر قائم "قومی مسئلہ" نہیں اٹھا سکتا بلکہ وہ سرماؤں کے تصادم اور ربط، ان کی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی خاصیت اور ان کی باہمی اتحاد کی جانب پیش رفت، الغرض ان کے باہمی ربط کے کلیت کے خلاف مسئلہ اٹھاتا ہے وہ "قومی مسئلہ" کو اِس انداز میں اٹھاتا ہے کہ سرماؤں کے باہمی ربط کی اس کلیت، ان کی باہمی مخاصمت اور دوستانہ تعاون، دونوں کے پیدا کردہ مسائل کا حساب بے باق ہو۔ وہ جانتا ہے کہ چونکہ تمام سرمائے مخصوص سرمایہ دارانہ استحصالی بین الاقوامیت کی جانب رواں دواں ہیں، چنانچہ کسی ایک قومی سرمائے کے اٹھاتے ہوئے "قومی" مسئلہ کی حمایت کر کے وہ اُس قومی سرمائے کو مضبوط و مستحکم کرنے اور اُسے چہار اطراف پاؤں پھیلانے اور سرمائے کے بین الاقوامی ارتکاز و اتحاد میں شامل ہونے میں مددگار ہی ہوگا اور اس عمل کے دوران وہ خود اپنے بین الاقوامی اتحاد کو شدید ضربیں پہنچا چکا ہوگا۔ اس لیے وہ مخصوص سرمایہ دارانہ انداز میں اٹھائے ہوئے "قومی مسئلہ" کو کلیتاً رد کرتا ہے اور اس کے برعکس اپنا "قومی" پروگرام دیتا ہے جس کی بنیاد قوموں کے پُرامن

اشتراک اور پُرامن علیحدگی پر قائم ہے وہ قوموں کے حق خود ارادی بشمول حق علیحدگی کا مطالبہ کرتا ہے۔ ساتھ ساتھ وہ "پاکستانی سرمائے" کے "قومی" پروگرام کو بھی رد کرتا ہے اور کھری جمہوریت کے قیام کے لیے اپنے جمہوری پروگرام کو بھی پیش کرتا ہے۔ وہ اس مرحلہ وار جدوجہد کے پروگرام کو رد کرتا ہے جو صرف "قومی" سرمایہ دار کے "قومی" پروگرام کی اعانت کر کے سرماؤں کی کش مکش میں کسی ایک "قومی" سرمائے کے مفادات کو مستحکم کر کے اُسے دوسروں کو بلیک میل کرنے اور خود اپنے لیے مراعات و تحفظ حاصل کرنا کا ذریعہ بننے کے علاوہ اور کچھ نہیں حاصل کر سکتی۔

پاکستان کے مخصوص حالات میں سرمایہ داریت عالمی استعمار کے زیر سایہ پروان چڑھی ہے، عالمی استعمار ہی نے یہ تعین کیا کہ پاکستان سرمایہ دارانہ راہ پر گامزن ہوگا اور اس سرمایہ دارانہ راہ کے خدوخال بھی اُسی نے متعین کیے۔ بالعموم صنعتی ترقی کے نتیجے میں ممالک اور اقوام استعمار سے آزادی کی جانب گامزن ہوتے ہیں لیکن استعمار کے زیر نگرانی و سرپرستی ہونے والی اس سرمایہ دارانہ صنعتی ترقی کے نتیجے میں ایک خصوصی اقتصادی و سیاسی وصف یہ پیدا ہوا کہ ملک پاکستان کا استعمار پر دارو مدار بڑھا۔ بالعموم سرمایہ دار کا ایک وصف یہ ہے کہ ملکی منڈی (محنت و اشیاء) اور وسائل پر اجارے کی خواہش میں وہ ملکی منڈی میں استعمار کے دخول کو کم سے کم تر کرنے بلکہ اُسے مکمل طور پر ختم کرنے کا خواہاں ہوتا ہے اور اس مقصد کے لیے پوری قوموں اور اُن کے عوام کو متحرک کرتے ہوئے قومی آزادی کی جدوجہدوں کی قیادت کرتا ہے یہ اُس کا ترقی پسندانہ وصف ہے لیکن پاکستان میں استعمار کے زیر سایہ ہونے والی مخصوص قسم کی سرمایہ دارانہ ترقی کے سیاق میں یہ سرمایہ دار اپنے اِس آفاقی ترقی پسندانہ وصف سے بھی محروم ہوا۔ اور اب مکمل طور پر عالمی سرمائے کا حاشیہ نشین اور اس کا دلال ہے۔ پاکستان میں سرمایہ دارانہ استحصال کے لیے "وسائل" (امداد، قرضوں، کلوں تجارتی کوٹہ وغیرہ) کا ایک معتدبہ حصہ یہ استعمار ہی فراہم کرتا ہے چنانچہ دیگر "وسائل" کی مانند ان وسائل پر دسترس کے لیے بھی مختلف سرماؤں میں کش مکش ہوتی ہے ابتداً تجارتی برادریوں پر مبنی سرمائے نے ہی "پاکستانی سرمائے" کے روپ میں ان وسائل پر مکمل قبضہ جمایا لیکن پھر اُس عمل کے ذریعے

جس کی نشاندہی ہم نے پہلے کی "پنجابی قومی سرمائے" کی مضبوطی و استحکام کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ "پاکستانی سرمائے" کی اپنی "قومی" ساخت کی تشکیل نو ہوئی، برادریوں کے سرمائے کو دیس نکالا ملا۔ اسی اثناء میں مختلف "قومی سرماؤں" کی تشکیل بھی ہوئی اور استعمار کے مہیا کردہ سرمایہ دارانہ وسائل اور استحصال کے امکانات سے مستفید اور نہال ہونے کے لیے سرمالیوں کی کش مکش نے "پاکستانی سرمائے" اور "قومی سرماؤں" میں ایک جانب اور خود "قومی" سرماؤں میں دوسری جانب کش مکش کی صورت اختیار کر لی۔

ظاہر ہے کہ استعماری وسائل کے لیے مبتلائے کش مکش یہ تمام سرمائے عالمی استعمار کے بارے میں اپنے رویوں میں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ یہ سامراج دوست ہیں۔ جدید ترین دستیاب اعداد و شمار کے مطابق ماورائے قومی کارپوریشنیں ترقی پذیر ممالک کے خام مواد کی برآمد کے بڑے حصّہ کی مالک ہیں۔ لوہے اور ایلومینیم کچ دھات کی فروخت کا ۹۰ تا ۹۵ فی صد حصّہ، عمارتی لکڑی کا ۹۰ فی صد حصّہ ان کے قبضے میں ہے، گیہوں، کافی، جوٹ، کپاس اور تانبہ کا ۸۵ تا ۹۰ فی صد حصّہ اور چائے اور کوکا پھلیوں کا ۸۵ فی صد حصّہ ان کی مٹھی میں ہے۔ نتیجہ کے طور پر ماورائے قومی کارپوریشنیں ترقی پذیر ممالک سے خریدے جانے والے خام موادوں کی کم سے کم قیمتیں مقرر کرتی ہیں۔ چنانچہ ان اشیاء کی آخری قیمتوں میں سے خام مواد پیدا کرنے والے ممالک کا حصّہ بہت کم ہے مثلاً کپاس پیدا کرنے والے ملک کو سوتی ملبوسات کی خوردہ قیمت کا صرف ۴ء ۶ فی صد حصّہ ہی ہاتھ آتا ہے، لوہے اور ایلومینیم کچ دھات کی آخری قیمتوں میں سے پیداواری ملک کو ذرا زیادہ بڑا حصّہ ہاتھ آجاتا ہے لیکن یہ حصّہ بھی دس فی صد سے زیادہ نہیں، وغیرہ وغیرہ۔

درج بالا اعداد و شمار تمام ترقی پذیر ممالک سے متعلق ہیں اور استعمار کے استحصال کے صرف ایک پہلو سے متعلق ہیں پاکستان میں سامراج کے استحصال اور سیاسی ریشہ دوانیوں کا موضوع ایک علیحدہ موضوع ہے اور اس کی کلیت کا احاطہ علیحدہ بھرپور تحقیق و تجزیے کا متقاضی

بہتے تاہم درج بالا اعداد و شمار سے اس استحصال کی جسامت کا تھوڑا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے خام موادوں کے ۸۰ تا ۹۵ فی صد حصے پر ماورائے قومی کارپوریشنیں قابض ہیں، اور ان ممالک کو ان موادوں کو آخری قیمتوں کا صرف ۶ تا ۱۰ فی صد حصہ ہاتھ آتا ہے بیشرطیکہ ہمارے دوست یہ دلیل نہ کریں کہ "خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی" ہم پاکستان میں استعمار کے استحصال کے ہمہ گیر پہلوؤں کے کسی بھرپور احاطے کی غیر موجودگی میں یہ مفروض کرتے ہیں حق بجانب ہوں گے کہ پاکستان بھی اِن اعداد و شمار سے مستثنیٰ نہیں، پاکستان میں "پاکستانی سرمائے اور دیگر قومی" سرماؤں کی جوتم پیزار اسی ۶ تا ۱۰ فی صد حصہ پر بٹوارے کا جھگڑا ہے۔

ان میں سے کوئی بھی اس ۹۰ تا ۹۴ فی صد کے حصے کے لیے جنگ کرنے کے لیے تیار نہیں جو استعمار لے اڑتا ہے۔ صرف اسی ۶ تا ۱۰ فی صد حصہ میں سے بڑا ٹکڑا لے اڑنے کے لیے "پاکستانی قومیت" سمیت دیگر تمام "اپنی" "اپنی" قومیتوں کو مستعد و کمربستہ کرنے کے لیے تو زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں لیکن اُس ۹۰ تا ۹۴ فی صد حصے کے لیے فکرمند نہیں جو ملک میں رہتا ہی نہیں۔ اس کی وجہ ہے استعماری استحصال کے نتیجے میں ملکی معیشت پر جو بوجھ پڑتا ہے اس کو پاکستان کے محنت کش مظلوم اور کچلے ہوئے محنت کش عوام کے کاندھوں پر منتقل کرنے کے معاملے میں سارے سرمائے "پاکستانی سرمایہ" اور دیگر قومی سرمائے" تمام کے تمام متحد و متفق ہیں۔

چونکہ ان تمام سرماؤں کی آنکھ ہی استعمار کی گود میں کھلی ہے اور اُسی نے ان کی پوری اٹھان اور بڑھوار سنواری ہے اس لیے استعمار دوستی اور استعمار پروری ان دلال سرمایوں کا خاصہ ہے تاہم پاکستانی سرمایہ" اور قومی سرمائے" استعمار کے ساتھ اپنے اپنے بندھنوں کو مختلف انداز میں نبھاتے ہیں۔

"پاکستانی قومیت" اور اس کی بنیادی پیر و کار ضیاء الحق مطلق العنانیت اپنے مخصوص ناتراش انداز میں، جس ناتراش انداز سے وہ ملکی زندگی کے ہر مسئلے کو نمٹاتی ہے، واشگاف الفاظ میں ڈھٹائی سے کہہ چکی ہے کہ عالمی استعمار ہمارا دوست، مربی اور سرپرست ہے جس کا

جو جی چاہے کرلے "پاکستانی قومیت" کے دیگر شارح 'میدانِ اقتدار سے باہر کھیل میں بعد حسرت ویاس اپنی باری کے منتظر، ملکی سیاسی جماعتیں' ایک جانب استعمار سے "پاکستانی سرمائے" کے رشتوں اور دوسری جانب استعمار سے پاکستانی عوام کی غضب ناک دشمنی کے درمیان پھنسے ہونے اور دونوں کی سرپرستی اور حمایت کی آرزوؤں میں منقسم ہونے کے باعث' استعمار کے مسئلے پر اپنے منہ میں گھونگنیاں ڈال کر کچھ ابہامی آوازیں نکالتے رہتے ہیں۔

حمایت و مخالفت دونوں کے مدارج ہیں صرف بھرپور اور کھلی حمایت اور بھرپور کھلی مخالفت ہی حمایت و مخالفت کی علامت نہیں ہوتی۔ زندگی کے ہر گوشے اور حلقے میں ٹھوس حقیقی حالات کی کلیت کے تناظر میں ہی مختلف اقدامات کی حامیانہ یا معاندانہ نوعیت متعین ہوتی ہے اور اس امر کا تعین ہوتا ہے کہ حمایت و مخالفت میں کس قدر شدت' اور توانائی کے کس قدر اصراف کی ضرورت ہے۔ استعمار کی گود میں پلنے بڑھنے والے "قومی سرمائے" کو اپنے مربّی و سرپرست استعماری سرمائے کی حمایت کا مسئلہ ایک ایسے سیاق میں درپیش ہوتا ہے جب کہ استعماری سرمایہ اپنے پیچھے بھرپور طور پہ گارڈ سے ہوتے ہے "اور پاکستانی قومیت کی شارح ضیاء مطلق العنانیت "پاکستانی سرمائے" کی اس معاملے میں تمام سابقہ لطافتوں کو خیرباد کہہ کر' کھل کر ڈھٹائی سے عالمی استعمار کے ساتھ "اپنے گہرے" روابط کی تشہیر کر رہی ہے۔

اس ضمن میں اُسے ایک بار پھر "پہلے اور بعد" والا مرحلہ وار جدوجہد کا وہ موقع پرستانہ پینترا بڑا خوش خصال لگتا ہے جو پہلے بھی اس کے لیے بڑا کارآمد ثابت ہوا ہے۔ اس کا نعرہ ہے: "پہلے قومی جدوجہد اور بعد میں سامراج دشمن جدوجہد۔ ہم نے پہلے بھی دیکھا کہ اس قسم کا نعرہ کس طرح محنت کش طبقے اور محنت کش عوام کی بے پناہ توانائی کو مختلف سرماؤں کی پرہوس مبالغہ آمیز آرزوؤں کے تابع کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے یہ بھی سمجھا کہ کس طرح مرحلہ وار جدوجہد کی یہ نعرہ پاکستان میں "پاکستانی سرمائے" اور مختلف "قومی سرماؤں" کی ترقی

اور ان کی جو مکھی جنگ اور ہم آہنگی کے باہم متضاد مگر مربوط پہلوؤں کی کلیت کے چلن کو جز جز کرنے کے باعث سرمایہ دارانہ حقیقت کی۔ ایک جزوی یعنی غلط تفہیم پر قائم ہے ہم آگے چل کر سامراج کے سوال پر بھی دیکھیں گے کہ مرحلہ وار جدوجہد کی یہ موقع پرستانہ حکمت عملی کیوں کر "عالمی سرمائے" اور "پاکستانی سرمائے" اور "قومی" سرماؤں کے ربط باہمی کی جزوی یعنی جدلیات کی ابجد کی رو سے غلط اور گمراہ کن تفہیم پر قائم ہے۔

لیکن آیئے پہلے عالمی استعمار کی درپردہ حمایت کے لیے ایک اور "قومی" داؤں کا تجزیہ کریں یہ داؤں بڑی افلاطونی دانشورانہ تام جھام اور اعداد و شمار اور معاشیاتی خطوط خمیدہ کی ریل پیل میں پیش ہوتا ہے دلیل کچھ یوں ہے "قوم پرست" سامراج کے خلاف ہیں لیکن

وہ پنجابی سامراج کے خلاف ہیں۔ بعض "قوم" پرستانہ رجحانات میں "پنجابی" سامراج میں مہاجر سامراج کا اضافہ ہو جاتا ہے، بعض میں پنجابی کی جگہ "مہاجر" سامراج لے لیتا ہے، چند جدید تر رجحانات میں پختون سامراج کا اضافہ ہو جاتا ہے ایک دلیل اس رُخ میں چلتی ہے چونکہ پنجابی (مہاجر پختون) سامراج ہی امریکی سامراج کا ایجنٹ ہے اس لیے پنجابی سامراج سے چھٹکارے کے نتیجے میں امریکی سامراج سے نجات مل جائے گی دوسری وہی مرحلہ وار عنصر کو پھر متعارف کرا دیتی ہے یعنی اس کے تحت پہلے پنجابی (مہاجر پختون) سامراج کے خلاف جدوجہد پھر امریکی سامراج کے خلاف جدوجہد۔ اور چونکہ عالمی استعمار کے عالمی سرمائے کی عالمگیر لوٹ کھسوٹ کا علمی نظریہ لازماً اس لوٹ کھسوٹ کے اعداد و شمار محنت اور منڈی کے استحصال وغیرہ کے اعداد و شمار سے مزین ہوتا ہے اس لیے اس کے ظاہر کی بھونڈی نقالی کر کے اور پاکستانی ریاست کے اندر منڈی، محنت، مادی و مالی وسائل کی چلت پھرت کے اعداد و شمار اور ان کی بدلتی ہوئی صورتوں کے خطوط خمیدہ بنا کر پنجابی (مہاجر و پختون) سامراج کے بے ہنگم نظریئے کو نیم سائنسی علمیت کی چادر بھی اوڑھا دی جاتی ہے۔ دلیل کی بنیاد یہ ہے کہ چونکہ سامراجی سرمایہ استحصال کرتا ہے اور چونکہ استحصال موجود ہے پس پنجابی (مہاجر پختون) سامراج کی موجودگی ثابت

ہوئی۔ پنجابی (مہاجر، پختون) سامراج کا یہ تصور سامراج کے اس علمی تصور کے مضحکہ خیز پرتو کے سوا کچھ نہیں جس کا مقصد موجودہ دنیا میں عالمی سرمائے کے عالمگیر استحصال کے وسیع و ہمہ گیر اوصاف کا اظہار ہے۔ یہ انتہائی بھونڈا تصور پیٹی بورژوا تصوریت پرستی کا شاخسانہ ہے جو افلاطونی و ارسطوئی تصوراتی طریق کار کے تحت پہلے ہر تصور کی تعریف تلاش کرتے ہوئے اس کی ابدی ماہیت کو منجمد کرتی ہے، جو تمام زمان و مکان سے ماوری ہے، اور پھر اس تصور کو لے کر ان گوناگوں ٹھوس حقیقتوں کی فہم کے لیے کوشاں ہوتی ہے جو زمان و مکان سے مشروط ہیں، اور ہمہ دم تغیر و تبدل کا شکار ہونے کے باعث وہ کسی ابدی ماہیت کے حامل تصور کے فکری چمٹے سے نہیں اٹھائے جا سکتے تا ابدی، ہم آہنگ ماہیتوں کی حامل لفظی ٹوپیوں کو لیکر پھیری لگانا اور ان کو زیر دستی حقیقت پر پہنانے اور چڑھانے کی کوشش کرنا تصوراتی طرز فکر کا وہ امتیاز ہے جو بورژوا مفادات پر پردہ ڈالنے کے لیے بورژوا نظریہ سازوں کا دیرینہ خدمت گار رہا ہے۔

چنانچہ بورژوا مفادات کے حاشیہ نشین ہمارے عامیانہ پیٹی بورژوا دانشوروں نے بھی استعماریت کے بورژوا دشمن علمی نظریئے کو استعمار کی خدمت پر مامور کرنے کے لیے استعمار یا سامراج کے الفاظ و تصورات کی ابدی ماہیت تلاش کر لی ہے۔ یہ ابدی ماہیت ہے سرمایہ دارانہ استحصال یا ایک قوم کے سرمائے کا دوسری قوم کا استحصال۔ اور جہاں یہ استحصال دیکھا استعمار اور سامراج کے لفظ کی ٹوپی پہنا دی۔ فی الحقیقت تمام "نجی" سرمایہ "دوسروں" کا استحصال کرتا ہے، اور تمام "نجی" "سرمایہ اپنے اس استحصال کے حلقے کو وسیع سے وسیع تر کرتے ہوئے "زیادہ سے زیادہ دوسروں" کا شدید سے شدید تر استحصال کرتا جاتا ہے۔ سرمائے کے استحصال کی توسیعی کوششوں میں چند سرماؤں کی عالمی سطح پر توسیع، ان کے عالمی ہمہ گیر، ہمہ جہتی استحصال، عالمگیر سطح پر ان کی اجارہ داریت کے قیام، اور عالمگیر سطح پر ان دیوقامت سرماؤں کی معاشی، تجارتی و ثقافتی سرگرمیوں کی بدلتی ہوئی صورتوں کی حقیقت کی کلیت کی تفہیم

کے لیے علمی اشتراکیت نے لفظ "استعمار" گھڑا اور جس دن سے مارکسی لیننی سائنس نے
اس لفظ کو یہ علمی معنویت دی ہے بورژوا نظریہ ساز اس کی اس معنویت کو مسخ کرنے کے
لیے طرح طرح کی نظری چور چالیں لگا رہے ہیں ان حربوں میں ایک حربہ یہی ہے کہ "عالمی
سامراج" کو "سامراجوں" کے ایک غول میں مخفی کر دیا جائے۔ پوری دنیا میں "سامراجوں"
کی ایسی کثرت کر دی جائے کہ محنت کشوں کو یہ سمجھ نہ آئے کہ کس کس کے خلاف جدوجہد کی
جائے یہاں تو سب ہی "سامراجی" ہیں، اور متنوع اہداف پر حملے میں ان کی توانائی کا اس قدر
زیاں ہو جائے کہ "عالمی سامراج" بے فکر ہو کر چین کی بنسی بجائے چنانچہ ہمارے پیٹی بورژوا دانشور
بھی خود پاکستان کے اندر روز نئے "سامراجوں" کی تحقیق و دریافت میں اعداد و شمار اکٹھا کر
رہے ہیں اور پنجابی سامراج، مہاجر سامراج اور پختون سامراج کی نظریہ سازی کر رہے ہیں اور
پہلے اور بعد کی مرحلہ وار جدوجہد کا موقع پرستانہ حربہ تو ہمیشہ ہی موجود ہے آج سندھی قوم
پرستی میں دو رجحانات رفتہ رفتہ مرتب ہو رہے ہیں۔ ایک کا نعرہ ہے کہ پہلے "مہاجر سامراج"
سے نمٹا جائے، دوسرے کا نعرہ ہے کہ پہلے "پنجابی پختون سامراج" سے لیکن دونوں کی ایک
مشترکہ بنیادی ماہیت یہی ہے کہ "عالمی سامراج" کو توجہ کی ضرورت نہیں اسے اپنی کارفرمائیوں
کے دوران دق نہ کیا جائے۔ محنت کش طبقہ اور پاکستان اور دیگر "قومیتوں" کے محنت کش مظلوم
عوام "پنجابی سامراج" "مہاجر سامراج" اور "پختون سامراج" کے عامیانہ نظریوں کی بورژوا تصوراتی
لباس اور ان میں مخفی بورژوا چور چال کی ماہیت کو سمجھتے ہوئے ان کو حقارت سے رد کرتے ہیں
اور ایسے تمام اعداد و شمار کو درخور اعتنا نہیں گردانتے جو ان لغو نظریوں کی تشریح و ابلاغ
کی حمایت میں یا ان کے زیر اثر ایسے دانشور جمع کرتے رہتے ہیں جو اپنے پیٹی بورژوا پس منظر کے
پیش نظر بورژوا ہتھکنڈوں کا اثر قبول کرنے کا مادہ رکھتے ہیں یہ اعداد و شمار اس کاغذ کا زیاں
ہیں جس پر انھیں رقم کیا گیا ہے محنت کش طبقہ "قومی مسئلہ" پر اپنے نقطہ نظر اور قومی حقوق
پر اپنے مطالبات کو "پنجابی سامراج" "مہاجر سامراج" "پختون سامراج" کے تاتراش بورژوا تصوراتی

جعلی نظریوں سے پاک رکھتا ہے۔

محنت کش طبقہ انتہائی انہماک کے ساتھ صرف ان اعداد و شمار پر توجہ مرکوز رکھتا ہے جو سرماؤں کی کشمکش کے نتیجے میں عالمی صورتِ حال کے اہم ترین اور ہمہ گیر خط و خال کا اظہار کرنے والے استعمار کے علمی نظریے کے تحت اس ملک اور قوم میں عالمی استحصال کے استحصال کی حالیہ گہرائی و گیرائی کی تشریح کرتے ہوں۔ اعداد و شمار کا یہی میدان وہ میدان ہے جس میں تحقیق و تفتیش پیٹی بورژوا دانشوروں کے حلقے میں روشن خیال ترقی پسند اور بورژوا حاشیہ نشین رجعتی دانشوروں کے درمیان تمیز کی کسوٹی قائم ہے خام اور نیم تیار پیدا کرنے والے ترقی پذیر ملکوں کو اپنی پیداوار کی آخری قیمتوں میں سے ۶ تا ۱۰ فی صد حاصل ہوتا ہے جب کہ ترقی یافتہ ممالک ۹۰ تا ۹۴ فی صد حصّہ لے اڑتے ہیں "پاکستانی سرمائے اور دیگر "قومی" سرماؤں میں اسی ۶ تا ۱۰ فی صد حصّے کے بٹوارے کے لیے "سامراج" کا نظریہ مسخ کر دیا گیا جب کہ ۹۰ تا ۹۴ فی صد حصّہ لے اڑنے والے عالمی سامراج کے بارے میں "پاکستانی قومیت" اور دیگر "قومیتیں" سب خاموش ہیں بظاہر بدترین دشمنوں میں یہ اشتراکِ عمل کیونکر ہے؟ اس لیے کہ عالمی سرمائے کی اس لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں پاکستانی معیشت پر پڑنے والے بوجھ کو پاکستانی ریاست کے عوام اور تمام "اقوام" کے عوام کے کاندھوں پر منتقل کرنے کے معاملے میں "پاکستانی" سرمایہ اور دیگر "قومی" سرمائے سب متفق و متحد ہیں پاکستان کا محنت کش طبقہ اور پاکستان کے بکلتے ہوئے محنت کش عوام ہی اس عالمی سرمائے کی لوٹ کھسوٹ کا تمام تر صدمہ جھیلتے ہیں چنانچہ وہ ہمیشہ ہی اپنی آزادی اور نجات کے لیے کمر بستہ ہوتے وقت استعمار کو مسئلے کو پیشِ نظر رکھتے ہیں وہ اس مسئلہ کو پہلے اور بعد کی موقع پرستانہ مرحلے وار جدوجہد کے مباحث کے گرد وغبار میں اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔

پہلے "قومی" جدوجہد بعد میں "سامراج مخالف" جدوجہد، مرحلہ وار جدوجہد کا یہ نعرہ محض موقع پرستانہ ہی نہیں، یہ ہمارے ملک میں عالمی سرمائے کی ریشہ دوانیوں کی شدت و وسعت

کی نامکمل تفہیم پر قائم ہونے اور اس معاملے پر "پاکستانی" سرمائے اور "قومی" سرمائے کے اتحاد و
اتفاق کا ایک شاخسانہ ہونے کے علاوہ عالمی استعمار کے ان ہتھکنڈوں کا ایک آلہ کار بھی ہے
جن کے ذریعے عالمی سرمایہ کسی بھی ملک میں اپنے نفوذ کو مستحکم کرنے، اپنی موجودگی کو دوام دینے
اور اپنے پیدا کئے ہوئے تضادات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مزاحمتوں کو کند کرنے کا بندوبست
کرتا ہے۔

پاکستان کے مخصوص حالات میں سرمایہ عالمی سرمائے کے زیرِ سایہ پروان چڑھا اور اسی
کے زیر نگرانی و سرپرستی رفتہ رفتہ مضبوط و مستحکم ہو رہا ہے اسی خصوصی اٹھان کے باعث
وہ عالمی سرمائے کا دست نگر اور وفادار ہے اس کا غالب وصف یہی ہے کہ یہ دلّال سرمایہ
ہے تاہم اس کا مفہوم یہ نہیں کہ یہاں سرمایہ اپنے لازمی اندرونی اوصاف کھو بیٹھا ہے اس
کا مفہوم یہ نہیں کہ سرمایہ خود اپنے آپ کو بڑھانے، وسیع سے وسیع تر حصّہ پر اپنی کارروائیاں
بڑھانے، اپنے منافعوں کو مسلسل بڑھاتے رہنے اور اس راہ میں حائل تمام رکاوٹوں اور عالمی
سرمائے سمیت تمام حصّہ داروں کو بتدریج مسلسل پسپا کرتے رہنے کے اوصاف ہمیشہ ہمیشہ کے
لیے کلیتاً جھٹک چکا ہے عالمی کرنسیوں کے تبادلۂ زر کی شرحوں، ترقی یافتہ ممالک کی تاملینی
پالیسیوں، عالمی رسد و رسائل پر اجارے، خام موادوں بالخصوص زرعی اجناس کی قیمتوں اور نئے
عالمی اقتصادی نظام کے قیام کے لیے تمام ترقی پذیر ممالک کی جدوجہد کے حوالے سے یہاں
کا سرمایہ بھی حدود کے اندر رہتے ہوئے متواتر اپنے منافعوں کی جسامت اور شرح کو بڑھاتے رہنے کیلئے
کوشاں رہتا ہے۔ پھر یہاں ریاستی سرمایہ بھی ہے جو غیر سرمایہ دارانہ اور معروضی طور پر استعمار دشمن رجحانات کا حامل ہے
گرچہ عالمی سرمایہ اس کی بے باقی کے لیے کوشاں رہتا ہے اور مختلف طرز کے ٹھیکوں، مختلف
نیم تیار اشیاء کی مہنگے داموں فراہمی کے آرڈروں اور توانائی اور ان ریاستی کارخانوں کی تیار
کردہ اشیاء کی نجی سرمائے کو سستے نرخوں فراہمی کے ذریعے اس ریاستی سرمائے کو نجی سرمائے
کی خدمت پر مامور کرتا ہے عالمی سرمایہ یہاں کے سرمائے کی پرورش و پرداخت اس انداز میں

کرتا ہے کہ اس کی عالمی سرمائے پر محتاجی بڑھے تاہم خود سرمائے کی اپنی اندرونی ساخت وماہیت یعنی اس کی آزادی کی خواہش کی مکمل نفی نہیں ہو پاتی۔ پھر عالمی اشتراکی نظام بھی ہے جو مختلف ممالک کو حتیٰ کہ نجی سرمائے تک کو ایسی امداد دینے کے لیے سرگرم ہے جو ان سے عالمی سرمائے کی محتاجی سے نجات دلائے۔ پاکستان میں فولاد کے کارخانے کا قیام اور جوہری توانائی، ایلومینیم کے کارخانے وغیرہ کی پیش کشیں اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ عالمی اشتراکی برادری سے تجارتی روابط بھی روز بروز زیادہ گہرے ہوتے جارہے ہیں۔ عالمی استعماری سرمایہ یہاں کے مقامی سرمائے کے اندرونی ولازمی وصف کی روزافزوں حقیقت پذیری، اور اس حقیقت پذیری کے ممد ومعاون خارجی وداخلی عوامل کی کارفرمائیوں سے بے بہرہ نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ عالمی سرمایہ بھی یہاں سرمائے اور سرمائے کے مختلف گروہوں کی کشاکش میں بھرپور طور پر ملوث ہو کر ہمہ جہتی کانٹ چھانٹ میں مصروف ہوتا ہے اور اس امر کا بندوبست کرتا ہے کہ یہاں سرمائے کے آزادی کے اندرونی ولازمی وصف کی حقیقت پذیری کو مؤخر کرے حتیٰ کہ اگر ممکن ہو تو اسے غرق ہی رکھے۔

اسی مقصد کے پیش نظر عالمی سرمایہ بھی پاکستانی ریاست میں "پاکستانی" سرمائے اور دیگر قومی سرمائے، اور مختلف "قومی" سرمائوں کی چومکھی کشمکش میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہاں کے سرمائے کی عالمی استعمار سے آزادی کی آرزو کی تحصیل کل پاکستانی ریاستی سطح پر اس سرمائے کی مضبوطی استحکام پر ہی منحصر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ سرمائے کے لازمی اندرونی وصف کے پیش نظر مختلف "قومی" سرمائے باہمی تصادم کے باوجود لازماً ہزارہا اقسام کے رشتوں میں بندھ رہے ہیں، اور باہمی انضمام کی جانب رواں دواں ہیں اور اپنے پیچھے ایسے ہزارہا لاکھوں اقتصادی تجارتی، سماجی اور اقتصادی رشتوں کے تانے بانے چھوڑ رہے ہیں جو یہاں کی مختلف اقوام کے درمیان روابط و رشتوں کی گرداب کو روز بروز تیز تر کر کے ان کے باہم متحدہ عمل کی شرائط پیش کی تکمیل کر رہے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ "پاکستانی" سرمائے اور مختلف قومی سرمائوں کے مابین

کشمکش کے باوجود عالمی سرمائے کی تبادلہ زر کی شرحوں خام مواد کی قیمتوں کے وغیرہ کے حوالے سے عالمی سرمائے کے خلاف ان سرماؤں کے مفاد مشترک ہیں۔ اور وہ جانتا ہے کہ کل "ریاستی" سطح پر سرمائے کا یہ خود مختار ارتکاز، اور اس کے عقب میں مجتمع عوامی قوت ان اقتصادی وسیاسی شرائط کی تسکین کر دے گی جن کے بل پر یہاں کا سرمایہ عالمی سرمائے سے آزادی کی خواہش کو حقیقت پذیر کر سکتا ہے چنانچہ عالمی سرمایہ کل ریاستی سطح پر اس انضمام کو شکست دینے کے لیے دو اطراف سے اپنا عمل جراحی کرتا ہے ایک جانب وہ "پاکستانی" سرمائے سمیت تمام "قومی" سرماؤں کو علیحدہ علیحدہ سرمائے کے عالمگیر انضمام کے عمل میں گھسیٹتا ہے اور اندرون ملک اور بیرون ملک مشترکہ کاروباری مہم جوئیوں میں ان سرماؤں کو ماورائے قومی کارپوریشنوں اور دیگر بین الاقوامی سرماؤں کے ساتھ الوٹ رشتے میں جوڑ کر ان کے مفاد کو اپنے مفاد سے جوڑ لیتا ہے اور یوں ان سرماؤں کی استعماری سرمائے سے عناد و تضاد کو کند کرتا ہے دوسری جانب وہ "پاکستانی" سرمائے اور دیگر قومی سرماؤں کے مابین کشمکش کو تیز کرتا ہے وہ مخصوص صنعتوں اور مخصوص علاقوں کے لیے امداد اور پابند قرضے دے کر ان کی کشمکش کو تیز کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ چھوٹی منڈیوں سے وابستہ سرمایہ اتنا مضبوط و مستحکم نہیں ہو سکتا کہ وہ عالمی سرمائے کو راستے سے ہٹانے کا خواہاں ہو اس لئے وہ تمام قومی سرماؤں اور "پاکستانی" سرمائے کو ایسی راہوں پر گامزن کرتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف جارحیت کے مرتکب ہو کر انضمامِ سرمایہ کی فطری راہ پر نہ چل سکیں۔

"سامراجی سرمائے" "پاکستانی" سرمائے اور "تمام قومی" سرماؤں کے باہمی ربط و تصادم کی یہ کلیت ہی پاکستانی ریاست میں سرمائے کے چلن کو متعین کرتی ہے یہاں محنت کش کے سامنے "سامراجی" مسئلہ اور "قومی" مسئلہ علیحدہ علیحدہ سامنے نہیں آتے بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ الوٹ رشتوں میں منسلک ایک کل کے طور پر پیش ہوتے ہیں چنانچہ محنت کش کیلئے پہلے اور بعد پر مبنی مرحلہ وار جدوجہد کا مسئلہ ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مرحلے وار جدوجہد کا موقف پرستانہ موقف

اسی گمراہ کن تصور پر مبنی ہے کہ "قومی" سرمایہ سامراجی سرمائے سے براہ راست مربوط نہیں چونکہ محنت کش کے سامنے مختلف "قومی" سرمائے "پاکستانی" سرمایہ اور "سامراجی" سرمایہ ایک اٹوٹ کل کے بطور سامنے آتے ہیں اس لیے وہ تمام مسئلے ایک ساتھ اٹھاتا ہے اور تمام مسئلوں کو ایک ساتھ حل کرتا ہے۔ سرمائے اور جمہوریت کا چولی دامن کا ساتھ ہے تمام دنیا میں جہاں بھی سرمایہ اور سرمایہ دار مضبوط ہوا وہ بورژوا جمہوریت کو اپنے ساتھ ساتھ لایا چنانچہ یورپ میں سرمایہ دار طبقے نے منظر پر غالب قوت کے بطور نمودار ہوتے ہی جاگیردارانہ نظام اور جاگیردارانہ شہنشاہتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور جا بجا بورژوا جمہوری انقلاب بپا کر کے عام انتخابات، دستور اور بورژوا جمہوری آزادیوں کی داغ بیل ڈالی۔ کہیں یہ انقلاب راست انداز میں آئے اور بادشاہوں کے سر قلم ہوئے، جاگیرداروں کی اقلیمیں ختم ہوئیں۔ کہیں یہ انقلاب مصالحت پر ختم ہوئے اور دستوری بادشاہتیں قائم ہوئیں۔ بہر صورت بورژوا جمہوریت کا قیام ہوا۔

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ اسی سرمائے کے ظہور و ترقی کے شانہ بشانہ "قوم" بھی ابھری اور سرمایہ دار طبقے نے قومی تحریکوں کی قیادت کرتے ہوئے قومی آزادی کے لیے جدوجہد بھی کی چنانچہ اب اگر ہم قومی آزادی کے لیے بورژوا جدوجہد کے ساتھ جمہوریت کے لیے اس کی جدوجہد کو شامل کریں تو پتہ چلتا ہے کہ سرمائے دار طبقے کی قومی جدوجہد، بورژوا جمہوری قومی جدوجہد تھی۔ وہ بیک وقت "قومی آزادی" کے لیے بھی ایک جدوجہد تھی اور بورژوا جمہوریت کے لیے بھی

بورژوا جمہوریت پر مبنی سیاسی نظام سرمایہ دارانہ پیداواری رشتوں سے خصوصی موزونیت رکھتا ہے چنانچہ جاگیرداریت اور جاگیردارانہ شہنشاہیت اور مطلق العنانیت کے خلاف "آزادی مساوات اور اخوت" کے نعروں تلے سرمایہ دار طبقے نے محنت کش طبقے، کسانوں اور ادنی بورژوازی کے وسیع حلقوں کو متحرک کیا۔ بڑے جگری سے ان کی قیادت کی اور مطلق العنان من مانی کی جگہ دستوری آئینی حکومت، قانون کی حکمرانی، عام حق رائے دہی اور سیاسی و شہری آزادیوں و حقوق پر مبنی سیاسی نظام کا قیام کیا۔ بلاشبہ سرمائے کا یہ پہلو اتنا آفاقی ہے کہ سرمایہ داریت اور جمہوریت ایک

ہی سکّہ کے دو رخوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پاکستان میں سرمائے کی ترقی وارتقاء کی خصوصی صورت کے باعث یہاں سرمایہ داریت کے اپنے اس جمہوری وصف کی بھی تحدید ہو چکی ہے۔"پاکستانی" سرمایہ تو مطلق العنانیت، فوجی آمریت، اور وردی یا وردی نوکرشاہی کے یک سنگ ستون نظام ہی میں پھلتا پھولتا ہے، اور ایوب آمریت اور ضیاء آمریت اس کے سنہری ادوار ہیں۔ اُسے جمہوریت دستور و آئین، عام حق رائے دہی، قانون کی حکمرانی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مختلف "قومی" سرمائے" اور "قومی تحریکیں" بھی جمہوریت کے نفاذ میں دلچسپی نہیں رکھتیں۔ ۱۹۸۳ء کی جمہوری تحریک کے دوران تمام "قومی" تحریکیں دور رہیں۔ سندھ کی قومی تحریک کی قیادت جی ایم سیّد نے اپنے عمومی واضح دو ٹوک انداز میں اس کی کھل کر مخالفت کی۔ پختون قومی تحریک کی نمائندگی کرتے ہوئے غلام احمد بلّور نے کراچی میں ایک شام اس تحریک میں ہم سب کو بھرپور حصّہ کی دعوت دے کر دوسری صبح پشاور میں اپنی عدم شمولیت کا اعلان کر دیا چونکہ ان کے کہنے کے مطابق باچہ خان مرحوم نے انھیں منع کر دیا۔ بلوچ قومی تحریک کے مختلف دائی بھی اس تحریک سے مکمل طور پر لا تعلق رہے۔ ایم آر ڈی کی ۱۹۸۶ء کی تحریک میں یہی نقشہ پھر دہرایا گیا۔ سندھ کی قومی تحریک پھر لا تعلق رہی اس وقت مختلف قوم پرست اے این پی میں جمع ہو چکے تھے انھیں اس بار تحریک شروع کرنے کے لیے تاریخ کے تعین کے بارے میں "غلط فہمی" ہو گئی اور خان عبدالولی خان عین تحریک کی ابتدا کے اہم ترین دنوں میں ملک سے باہر روانہ ہو گئے۔ بلوچ قومی تحریک ایک بار پھر اپنی لاتعلقی کا مظاہرہ کرتی رہی آخر ایسا کیوں ہوا؟ "پاکستانی" سرمایہ اور "پاکستانی" قومیت کے صف اوّل کے شارح اور دیگر "قومی سرمائے اور تمام "قومی تحریکیں" سرمائے کے ایک بنیادی آفاقی وصف بورژوا جمہوریت سے کیونکر اتنے بے پرواہ ہیں؟

اس کی بنیادی وجہ تو یہی ہے کہ پاکستان میں تمام سرمایوں کی ترقی و بڑھوار یورپ میں سرمائے کی ترقی وارتقاء سے قدرے مختلف خارجی و داخلی سماجی واقتصادی

حالات میں ہوئی یورپ میں سرمایہ دارانہ صنعت کاری کی ابتداء جاگیردارانہ بطن میں آہستہ آہستہ شروع ہوئی یہاں منڈیاں، قصبے اور شہر رفتہ رفتہ جاگیردارانہ مزاحمتوں میں پروان چڑھے۔ سرمایہ دار نے منڈیوں کے علاقوں، شہری حدود کی توسیع، اور تجارتی راہوں پر پُرامن آمد و رفت کا حق۔۔۔ زمین پر جاگیردارانہ دعووں، جاگیردارانہ جنگوں کی لوٹ کھسوٹ اور کھلی جاگیردارانہ لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کی مزاحمتوں پر مبنی طویل جدوجہد کے نتیجے میں ہی حاصل کیا۔ ادھر مزارعہ بھی جاگیردار سے دست و گریبان تھا۔ جاگیروں پر نیم غلام کاشت کار زمین کے رشتوں میں جاگیردار آقاؤں کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ اور وہ ان کو ان رشتوں سے آزاد کرنے کو کسی طور تیار نہ تھا۔ سرمائے کو محنت کی ضرورت تھی لیکن یہ محنت زمین کے رشتے میں بندھی جاگیر کی غلام تھی۔ زمین کے رشتے میں بندھے ہوئے یہ نیم غلام اپنے بندھنوں کو توڑ کر آزادی کے لیے کوشاں رہتے تھے اور شہروں میں سرمایہ دارانہ فیکٹریوں میں مزدوری کی صورت میں انھیں "یہ آزادی" مل سکتی تھی۔ وہ جاگیروں سے بھاگتے، کبھی پکڑے جاتے کبھی بچ نکلتے۔ جاگیردارانہ قانون جاگیردار کے غلام دارانہ حقوق کا دفاع کرتا۔ کسان تحریکیں اٹھتیں اور پھر بے پناہ جبر کے ذریعے دبا دی جاتیں۔ سرمائے کو محنت کی ضرورت تھی۔ اور یہ محنت اُسے صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتی تھی کہ مزارعہ زمین کے رشتوں کے بندھنوں کی نیم غلامی سے آزاد ہو۔ سرمایہ دار بھاگتے ہوئے مزارعوں کی مدد کرتا۔ جاگیردارانہ رشتوں کے خلاف سرمایہ دار اور محنت کش دونوں کی صدیوں پر مبنی جدوجہد نے ہی سرمایہ دار اور محنت کش کو اتحادی بنا دیا۔ جاگیردار کے خلاف سال ہا سال بلکہ صدیوں پر مبنی اس کش مکش نے ہی "آزادی، مساوات اور اخوت" کے اس نعرے اور نظریے کو مادّی بنیادیں فراہم کیں اور اس کو وہ معنویت عطا کی جس کے تحت سرمایہ دار نہ صرف بورژوا جمہوری تحریکوں میں محنت کش کی قیادت کر سکتا تھا بلکہ جاگیرداروں کے سر کے اوپر سے گزر کر خود جاگیردار کی رعایا، زمین کے رشتوں میں

بندھے ہوئے نیم غلاموں کو بھی اُمید کی کرن دکھاتے ہوئے انہیں بھی جاگیردار کے خلاف اپنے عقب میں مجتمع کر سکتا تھا اور جمہوری بنیادوں پر عام انتخابات کے بل پر دستور و آئین کے تحت مسندِ اقتدار پر بیٹھنے کے اپنے دعووں کو حقیقت پذیر کر سکتا تھا۔ جاگیردارانہ پیداواری رشتوں کے تناظر میں سرمایہ دارانہ پیداواری رشتے واقعتاً "آزادی" کا پیغام تھے۔ وہ "مساوی تر" تھے اور اخوت اور "بھائی چارے" کی تجسیم تھے۔ اور جاگیردارانہ رشتوں کے خلاف یہ طویل کشمکش ہی وہ مادی سیاق فراہم کرتی تھی جس میں یورپ کا سرمایہ اس ایمان و ایقان سے مزین ہوا کہ وہ عظیم عوامی قوتوں، مزدوروں، کسانوں اور محنت کش عوام کے طوفان کے بند کھول بھی سکتا ہے، اور انہیں باندھ بھی سکتا ہے وہ انہیں بورژوا جمہوریت کی حدود کے اندر مقید کر سکتا تھا۔

پاکستان میں سرمائے کی ترقی و ارتقاء کے سماجی و اقتصادی اوصاف میں یہ عناصر معدوم ہیں یہاں سرمایہ دارانہ ارتقاء ایک ایسے حالات میں ہو رہا ہے۔ جب کہ دنیا میں چہار اطراف میں سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کی دھوم دھام ہے۔ یہاں دیہات میں بھی سرمایہ دارانہ زراعت کا دخول شہروں میں صنعت کے دخول کے لگ بھگ ہی ہوا ہے چنانچہ یہاں نہ شہروں میں محنت کی قلت ہے اور نہ زراعت میں مزارعہ کو زمین کے رشتے میں باندھ کر رکھنے کی وہ کوشش بلکہ ایک معنی میں خود جاگیردار جو تیزی سے یا تو زرعی سرمایہ دار ہو چکا ہے، یا ہو رہا ہے، مزارعہ کو باہر دھکا دے رہا ہے وہ خود جاگیردارانہ "پدرانہ" اور "مشفقانہ" رشتوں کے بوجھ کو اٹھانے کو تیار نہیں۔ یہی وہ صورتِ حال ہے جس میں سرمائے کے پاس مزدور اور دیگر محنت کش عوام کے لیے "آزادی، مساوات اور اخوت" کے پیغام کے بجائے صرف بے دخلی، نیم بے روزگاری، بھیک اور فاقہ کشی کا پیغام ہے چنانچہ یورپی سرمائے کی مانند وہ کوئی ایسا منشور، ایسا سیاسی پروگرام نہیں پیش نہیں کر سکتا جو فی الحقیقت اپنی تر چھوار کے لیے سرمائے کی آرزوؤں کا نقیب

ہو لیکن جو اپنے اندر محنت کش عوام کی آرزوؤں کو سمو لینے کا فریب نظر بھی پیدا کرتا ہو۔ نہ تو وہ اپنے بورژوا جمہوری پروگرام پر محنت کش طبقے کو اپنے پیچھے لے کر چل سکتا ہے اور نہ ہی ان کی عوامی قوت کو اپنا تابع کر کے بورژوا جمہوریت کے توازن کو قائم کر کے اسے استحکام بخش سکنے کی توقع باندھ سکتا ہے۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ مطلق العنانیت کی حدود کے اندر اپنے تمام مطالبے اٹھائے اور انہیں طے کرے۔

جمہوریت کے مسئلے پر "قومی" تحریکوں کے رویوں کا ایک خصوصی پس منظر یہ ہے کہ موجودہ کثیر القومی پاکستان میں ایک "قوم" (پنجابی) بقیہ قوموں (سندھی، بلوچی، پختون وغیرہ) کی مجموعی آبادی سے بڑی ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ فی کس فی ووٹ پر مبنی جمہوریت "قومی مسئلہ" کا حل اس لیے فراہم نہیں کر سکتی چونکہ ایسی جمہوریت کے نتیجے میں "غالب قوم" کی اکثریت برقرار رہے گی اور "قومی" مسئلہ جوں کا توں برقرار رہے گا۔ کیا "سرائیکی" قوم کی موجودگی میں بھی یہ خدشہ برقرار رہتا ہے؟ اور اصل سوال یہ ہے کہ اگر صورت حال یوں ہی ہے تو پھر غالب "قوم" جمہوریت کی جانب پیش قدمی کیوں نہیں کرتی؟ "پاکستانی قومیت" کو تو عام انتخابات، دستور سازی، جمہوری حقوق و آزادیوں سے کوئی خدشہ لاحق نہیں ہونا چاہیئے؟ وہ کیونکر جمہوریت سے حتیٰ کہ بورژوا جمہوریت سے گریزاں ہے؟ اگر واقعتاً "قومی" تحریکیں غالب قوم کی اکثریت کے باعث جمہوریت سے گریزاں ہیں تو پھر وہ اُس مطلق العنانیت کو کیونکر برداشت کر سکتی ہیں جس میں غالب "قوم" کی نمائندگی اس کی آبادی کی اکثریت سے بھی زیادہ ہے؟ وہ اُس سے معاملہ کیوں کرتی ہیں؟ اور اس کے مختلف بندوبستوں، اور مطلق العنانیت کی حدود کے اندر "نمائندگی" کی مختلف صورتوں (مجلس شوریٰ، غیر جماعتی انتخابات، نامزد وزارتوں وغیرہ) میں کیوں شریک رہتی ہیں؟ فی الحقیقت "پاکستانی" سرمائے سمیت تمام "قومی" سرمائے اپنی اصل میں عوام "دشمن" ہیں۔ اپنی نمو سے لیکر اپنی ترقی و ارتقاء کے پورے سفر کے دوران وہ مسلسل محنت کش عوام کے آلام و مصائب

میں اضافہ کر رہے ہیں۔ یورپی سرمائے کے برعکس وہ اپنی زندگی کے کسی بھی دور اپنے ہاں عوام کی آرزوؤں کے عکاس نہ تھے، نہ ہوں گے چنانچہ نہ "پاکستانی" قومیت کے صف اول کی شارح ضیاء الحق مطلق العنانیت کی "عوام" میں جڑیں ہیں اور نہ ہی دیگر "قومی" تحریکوں کی۔ انہیں اپنے باہمی ربط و تصادم کے سارے مسائل "عوام" سے دور مطلق العنانیت کے دائرہ کار میں طے کرنے ہوں گے، چونکہ عوام جب بھی متحرک ہوں گے ان دونوں کے قدم پیچھے ہٹیں گے۔ یہ کوئی حادثہ نہیں کہ مطلق العنانیت کے ہر دور میں "قومی" مسئلہ اہم ترین مسئلہ بن کر سامنے آتا ہے اور مطلق العنانیت اور قومی تحریکیں باہمی لاڈ پیار کرتی ہیں۔

پاکستان کے مخصوص سماجی و اقتصادی حالات میں مطلق العنانیت ہی وہ سیاسی بندوبست ہے جس میں مختلف سرمائے/سرماؤں کے مختلف گٹھ جوڑ، اور "پاکستانی" سرمائے سمیت مختلف "قومی" "سرمائے"، باہمی کش مکش کے سارے مسائل طے بھی کر سکتے ہیں اور اس عمل کے دوران اُن عوام کی حرکت کا سدِ باب بھی کر سکتے ہیں جو جب بھی حرکت میں آتے ہیں تو ہر مسئلہ پر اپنی مخصوص آرزوؤں اور تمناؤں کے نقوش بھی چھوڑ جاتے ہیں۔ "پاکستانی" سرمائے اور "قومی" سرماؤں کے لیے ضروری ہے کہ وہ باہمی کش مکش نمٹانے کے عمل میں سرمائے کی لٹیا ہی نہ ڈبو دیں۔ اس لیے یہ کش مکش جمہوریت کے میدان سے باہر طے ہونی پڑے گی۔

یورپ میں سرمایہ داریت کی ترقی و عروج کے تجربے کی رُو سے یہ بات درست ہے کہ سرمایہ داریت اور بورژوا جمہوریت لازم و ملزوم ہیں۔ سرمایہ داریت ہر جگہ اپنے پیچھے پیچھے اپنا مخصوص سیاسی نظام یعنی جمہوریت لے کر آئی۔ تاہم یورپی تجربے کی رُو سے بھی یہ بات نصف صداقت ہی ہے۔ یورپ میں بھی سرمایہ داریت کی ابتدا اور مطلق العنانیت میں مخصوص ربط رہا۔ سرمائے ہی نے مختلف بادشاہوں کو رقومات فراہم کر کے ان کی بڑی مستقل افواج بنوائیں جن کے بل پر وہ ایسے مطلق العنان بادشاہ بن گئے جو جاگیرداروں کی چھوٹی چھوٹی افواج پر منحصر نہ رہے اور اس قابل ہوئے کہ اپنے طور پر آزادانہ فیصلے کر کے

انہیں جاگیردارانہ اقلیموں پر تخفوپ سکتے تھے۔ اور حکم عدولی کی صورت میں جاگیرداروں کی سرکوبی کر سکتے تھے جوابًا شہنشاہوں نے سرمایہ داروں کو جاگیردارانہ دعووں سے محفوظ چارٹرڈ ٹاؤن دیئے، جاگیردارانہ چنگی ناکوں اور جاگیردارانہ قانون سے نجات دلائی، سڑکیں بنوائیں اور ملک کے طول و عرض میں ان پر لوٹ مار سے تحفظ دلایا۔ بلاشبہ ایک ہمہ گیر مرکزی نظام، سرمایہ دارانہ استحصال، سرمائے کی بلا روک ٹوک علیت پھرت اور ایک وسیع منڈی (محنت و اشیاء وغیرہ) سرمائے کی ترقی و ارتقاء کے لیے ضروری تھے جاگیردارانہ عدم ارتکاز قوت اس مقصد کی راہ میں ایک روڑا تھا جب کہ مطلق العنان بادشاہت ان سرمایہ دارانہ تقاضوں سے ہم آہنگ تھی۔ چنانچہ یورپ میں بھی سرمایہ داریت اپنی بڑھوار کے ایک طویل دور اپنے تک مطلق العنان جاگیردارانہ شہنشاہیت کی ہم نوا تھی اور مطلق العنان شہنشاہیت بھی اس کی ممد و معاون تھی۔

لیکن تاہم بھی، بورژوا جمہوری انقلابوں کے نتیجے میں اگرچہ بعض جگہوں پر سرمائے نے راست انداز میں جاگیرداریت کے باقیات کو اکھاڑا اور مطلق العنان شہنشاہتوں کو ختم کیا لیکن بعض جگہوں پر مثلاً برطانیہ میں یہ جدوجہدیں مصالحتوں پر ختم ہوئیں دوسری جگہوں پر مثلاً روس میں سرمایہ داریت زار کی مطلق العنانیت کے زیر سایہ پروان چڑھتی رہی اور بورژوا انقلاب کی تکمیل فروری ۱۹۱۷ء میں جاکر ہوئی۔ اسی سرمایہ داریت نے فسطائیت اور مختلف دیگر طرح کی آمریتوں کو جنم دیا بہر حال پرانے استحصالی طبقات اور شہنشاہتوں سے مفاہمتوں کی مختلف صورتوں سے قطع نظر ان سب میں ایک قدر مشترک یہ تھی کہ ان سب نے محنت کش عوام کو دھوکہ دیا تھا کہ ان میں سب سے راست بورژوا جمہوری انقلاب، انقلاب فرانس تک نے روسو کی سواد اعظم کی قسمیں کھا کھا کر جو دستور منظور کیا اس کے تحت خود روسو بھی اگر زندہ ہوتا تو حق رائے دہی سے محروم رہ جاتا ان بورژوا جمہوری انقلابوں میں تمام حقوق اور آزادیاں اور مساواتیں سرمائے کی مقدار سے مشروط رہیں۔

درج بالا حقائق کے پیشِ نظر سرمائے اور مطلق العنانیت کا ربط بھی اتنا ہی گہرا ہے جتنا کہ سرمائے اور جمہوریت کا۔ تاہم پاکستان میں سرمائے اور مطلق العنانیت کا ربط و تعلق ایک اٹوٹ رشتہ ہے یورپ میں سرمائے نے اپنی بڑھوار کے ساتھ ساتھ ریاست کو بھی اپنا ہمنوا بنایا اور چونکہ ایک مضبوط مرکزی ریاست ہی سرمائے کی بھرپور ترقی و ارتقاء کا بندوبست کر سکتی ہے اس لیے اس نے مطلق العنان شہنشاہی ریاست کی امداد بھی کی اور اس کی مدد بھی لی۔ خود طاقت پکڑتے ہوئے اس نے رفتہ رفتہ جاگیردارانہ شہنشاہیت کو اپنا دست و بازو بنایا۔ تاہم پاکستان میں یک ستون مطلق العنان وردی بے وردی نوکر شاہی نے شروع دن سے جو سرمایہ دارانہ راہ اپنائی اور سرمائے کی جس طرح اعانت کی اُس کا خود پاکستان کے مقامی سرمائے اور سرمایہ دار طبقے کی طاقت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ پاکستانی سیاست و اقتصاد کے مختلف نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ گرچہ پاکستانی ریاست نے ابتداء سے سرمایہ داریت کی ہمت افزائی کی تاہم سرمایہ داریت کی یہ حمایت پاکستان میں سرمایہ دار طبقہ کی قوت کی عکاس نہ تھی حمزہ علوی لکھتے ہیں: "یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ بورژوا طبقہ کی ناتوانی کے باوجود پاکستان کی تخلیق کے فوری بعد ابتداء سے ہی ریاستی پالیسی نے صنعتی ترقی کی پرورش کی اور اس مقصد کے لیے بورژوازی کو ہر ممکن امداد اور اعانت دی گئی۔ اگر ہم کسی طبقہ کی مطلوبہ پالیسیوں کی موجودگی کی توجیہہ ان مطلوبہ پالیسیوں کو منوانے کے لیے اس طبقہ کی قوت کی بنیاد پر کرنا چاہیں تو اگر بعد کے سالوں کا ذکر نہ بھی کیا جائے تب بھی ہمارے لیے ۱۹۵۰ء کی دہائی کے دوران سرمائے کی اعانت میں اٹھائے جانے والے اقدامات کی توجیہہ بہت مشکل ہو جائے گی۔" (اسٹیٹ اینڈ کلاس ان پاکستان" ان حسن گردیزی اور جمیل رشید پاکستان دی ان سٹیبل اسٹیٹ، وین گارڈ ۱۹۸۳ء ص ۴۶) اگرچہ ہم حمزہ علوی کے اس نتیجے سے متفق ہیں کہ پاکستان میں سرمایہ داریت کی پرورش و پرداخت ریاستی مشینری نے کی اور ایسا کرتے ہوئے وہ معاشرے میں بورژوا طبقے کی قوت کی عکاسی نہیں کر رہی تھی بلکہ اس طبقہ کی قوت

سے آزادانہ طور پر اس طبقے کے ساتھ شفقت برت رہی تھی تاہم ہم پاکستان میں سرمایہ داریت کی ترقی وارتقاء کے اس خصوصی وصف کی اُن کی اس توجیہہ سے متفق نہیں ہو سکتے جو اُن کے اس تصوّر کے ضمن میں دی گئی ہے جس کے تحت پاکستانی ریاست ایک ایسی بالادست ریاست ہے "جو قدرے خود مختار اور تمام طبقوں سے ماوریٰ و آزاد ہے" یہ ایک ایسا غیر مارکسی اور غیر علمی تصوّر ہے جس کی جڑیں مارکسی لیننی تجزیوں کے مطابق پیٹی بورژوا فکر میں مضمر ہیں چونکہ وہ اہم مسئلے کا حل اپنے اسی بنیادی پیٹی بورژوا تصوّر کے تناظر میں تلاش کرتے ہیں چنانچہ وہ پاکستان میں سرمایہ داریت کے ارتقاء کے اس خصوصی مظہر کی توجیہہ کے لیے تصوّر پرستی کا شکار ہو جاتے ہیں وہ ریاستی مشینری، اَرباب اقتدار اور اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے سرکاری اہل کاروں کے انفرادی و اجتماعی شعور اور نفسیات میں اس خصوصی مظہر کی بنیادیں ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "تاہم اس کی (پاکستان میں سرمایہ داریت کی ریاستی پرورش کی) توجیہہ ایک نظری حقیقت میں مضمر ہے۔ وہ یہ کہ پاکستان کی تخلیق کے وقت اس عقیدہ پر لوگوں کا ایمان تھا کہ ہندوستان کے برعکس پاکستان ایک آزاد ریاست کے بطور اس لیے قائم نہیں رہ سکتا چونکہ پاکستان میں صنعتی بنیاد موجود نہیں ہے اور چنانچہ وہ پنپ نہیں سکتا۔" (ایضاً ص ۴۴) "پاکستان کی قیادت، سیاست کار اور افسر شاہی دونوں کے نزدیک یہ عقیدہ ایک قطعی اور کھری صداقت کا درجہ رکھتا تھا۔" (ایضاً ص ۴۴) اور پھر اس پر وہ اپنے ایک ذاتی واقعہ کا اضافہ کر دیتے ہیں "مصنف اسٹیٹ بنک آف پاکستان کا ایک سینئر افسر تھا اس حیثیت میں اس کو اعلیٰ ترین سطحوں پر ہونے والے وہ مباحث یاد آتے ہیں جن میں نئی ریاست خود اپنے آپ پر عائد کردہ اس کار متورہ کو زیر بحث لاتی تھی۔ مصنف کو یاد ہے کہ سابقہ نوآبادیات کی تجارت تھے بورژوازی کی سست روی پر ہمیں کس قدر تشویش اور فکر لاحق رہتی تھی" (ایضاً ص ۴۴) "نظری حقیقت"، "عقیدہ"، "ایمان"، "مباحث"، "تشویش"، "فکر" ان چیزوں نے پاکستان کو سرمایہ داریت کی راہ پر لگایا اور اس کی پرورش و پرداخت کی۔ یہ توجیہہ بلاشبہ مدارس میں موضوعی تصوریت

پر مبنی توجیہات کی مشق کے طور پر استعمال کی جا سکتی ہے چونکہ کچھ لوگوں کے نہیں بلکہ کلیدی مقتدر لوگوں کے ذہن میں یہ "عقیدہ" چار زانو بیٹھ گیا تھا اس لیے انہوں نے فلاں فلاں اقدامات اٹھائے اور یوں ان کے شعور کے ایک تصور نے ایک مادی، سماجی و اقتصادی حقیقت کو جنم دے دیا۔

اس امر میں کلام نہیں کہ جب بھی انسان کوئی کام کرنے نکلتا ہے اس کے ذہن و شعور میں اس کام کو کرنے کی خواہش اور اس کام کو نمٹانے کا کوئی منصوبہ ہوتا ہے اس کا عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ کام کرنا چاہیئے۔ اس عقیدہ پر اس کا ایمان بھی پختہ ہونا چاہیئے اور اس کام کی راہ میں مزاحمتوں یا رکاوٹوں پر اسے فکر و تشویش بھی ہونی چاہیئے۔ کام جتنا پیچیدہ اور اہمیت کا حامل ہو اسی قدر عقیدوں، ایمان، تفکرات پر مبنی نظری حقیقتیں بھی اہمیت کی حامل ہوں گی اور اس کی انجام دہی کرنے والوں میں مباحث بھی زور شور کے ہوں گے ہر کام کرنے سے پہلے شعور پر کچھ تصورات (عقیدے، نظریے وغیرہ) نقش ہوتے ہیں اور کام جتنی اہمیت کا حامل ہوگا تصورات (عقیدے، نظریے وغیرہ) کے یہ نقش اتنے ہی پیچیدہ، گہرے پر زور اور پر شور ہوں گے موضوعی تصوریت اسی صداقت پر قائم ہے۔ موضوعی تصوراتی توجیہات اسی آفاقی صداقت پر مبنی ہوتی ہیں اور اس صداقت کی آفاقیت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پاکستان میں سرمایہ داریت کی ترقی و ارتقاء ہی کا نہیں بلکہ دنیا میں ہر انسانی انفرادی و اجتماعی عمل، اور تمام تاریخی واقعات و سلسلہ ہائے واقعات کی توجیہات اس موضوعی تصوراتی تمثیل پر کی جا سکتی ہے چونکہ کسی انسان، بادشاہ، شہزادے یا انسانوں کے گروہوں نے یہ سوچا اس لیے انہوں نے ایسا ایسا کیا اور چنانچہ یہ یہ ہوگیا۔

موضوعی تصوریت کی یہ خامی نہیں کہ وہ سماجی یا انفرادی واقعات کی توجیہہ کرنے میں ناکام رہتی ہے بلکہ اس کی بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ انسانوں اور انسانی گروہوں کے شعور کو اپنی تشریح آپ قرار دیتے ہوئے اس کی مزید تحلیل و توجیہہ نہیں کر پاتی وہ یہ نہیں بتاتے

سے قاصر رہتی ہے کہ انسان یا انسانوں کے شعور پر یہ عقائد کیسے نقش ہوئے، وہ کیونکر ان تصورات (نظریوں، تفکرات، تشویشوں وغیرہ) کے حامل ہو گئے اور حمزہ علوی کی یہ توجیہہ کہ پاکستانی ریاست میں سرمایہ داریت کے ناز نخرے اس لیے کیے گئے کہ پاکستانی قیادت کے ذہن میں کچھ عقائد پختہ ہو گئے تھے ایک ایسی ہی موضوعی تصوراتی توجیہہ ہے جو یہ بتانے سے قاصر ہے کہ آخر پاکستانی قیادت کے شعور پر یہ عقائد کیونکر اور کہاں سے مرتسم ہو گئے بعد سے حدوہ یہ کہتے ہیں کہ پاکستانی قیادت کے شعور میں یہ عقائد اس لیے بیٹھ گئے تھے کہ انڈین نیشنل کانگریس نے تقسیم ہند کو اس لئے قبول کر لیا تھا کہ ان کے خیال میں پاکستان میں چونکہ صنعت نہیں اس لئے وہ پنپ نہیں سکتا (ایضاً ص ۴۷)۔ اس طرح وہ پاکستانی قیادت کے شعور کے اسباب و محرکات ہندوستانی قیادت کے شعور میں تلاش کر لیتے ہیں۔ اور یوں تصوراتی رجعت لامتناہی کا شکار ہو جاتے ہیں یعنی ایک شعور کی توجیہہ دوسرے شعور سے کرتے ہیں اور مسئلہ وہیں کا وہیں رہتا ہے۔

دراصل پاکستان میں سرمایہ داریت کے نمو وارتقاء کے بارے میں حمزہ علوی کی موضوعی تصوراتی توجیہات اُن کے اس بیبٹی بورژوا تصور کا لازمی نتیجہ ہیں کہ پاکستانی ریاست ایک ایسی بالادست ریاست ہے جو تمام طبقات سے ماوری اور آزاد ہے ایک دفعہ اس طرح سے ایک "آزاد" ریاستی مشینری مفروض قائم کرنے کا لازمی مضمرہ یہ ہے کہ اس "آزاد" ریاستی مشینری کا ہر قدم لازمی طور پر اس ریاستی مشینری کے اہل کاروں کے ایسے "خیالات و نظریات" کا نتیجہ ہوگا جو خود مختار ہوں گے اور جن کی مزید تشریح و توضیح نہیں کی جا سکتی۔ وہ محض اُن کے ذہن کی اپج ہی قرار پا سکتے ہیں چونکہ یہ خود تمام سماجی اقتصادی بندوبستوں اور ان کی طبقاتی صف بندیوں سے آزاد و ماوری ہیں اس لیے ان کے ذہن میں پیدا ہونے والے ہر خیال کا منبع خود اُن کا ذہن یا اُن کے ذہن کے دوسرے خیالات ہی ہو سکتے ہیں۔ امر لطف یہ ہے کہ یہ موضوعی تصوریت خود ان اعلیٰ سرکاری اہلکاروں

کے ذہنی رحجان سے ہم آہنگ ہے جو اسٹیٹ بنک یا دیگر دفتروں کی اعلیٰ سطحی میٹنگوں میں بیٹھ کر مختلف معاملات پر تمام "طبقاتی" و "گروہی" مفادات سے بالاتر ہو کر خالصتاً "عقلی" اور "منطقی" بنیادوں پر غیر جانبدارانہ انداز میں غور و خوض کر رہے ہوتے ہیں اور بزعم خود تمام دباؤں سے بے پرواہ تاریخ کی تخلیق کر رہے ہوتے ہیں چنانچہ حمزہ علوی اسٹیٹ بنک کی میٹنگ میں بہ نفسِ نفیس اپنی شرکت اور وہاں ہونے والے خالصتاً "فکری" مباحث اور طبقات سے "ماورئی" و "بے پرواہ" اپنی تشویشوں کی شہادت بھی دے سکتے ہیں۔

فی الحقیقت پاکستانی ریاست کے عقائد و تصورات حمزہ علوی کی سفارشات کے برعکس، نہ تو اپنی توجیہہ آپ ہیں اور نہ ہی یہ خالصتاً "بے غرضانہ" "غیر طبقاتی" فکری کاوشوں کا نتیجہ تھے یہ عالمی سرمائے اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے اس نقشہ کا حصہ تھے جس کے تحت وہ بتدریج سرمائے اور محنت دونوں کو بین الاقوامیا رہا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام نے ہی اس امر کا تعین کیا کہ پاکستان ترقی کی سرمایہ دارانہ راہ اپنائے گا اور پھر اس سرمایہ دارانہ راہ کے خدوخال بھی اسی نے متعین کئے۔ ایک پاکستان پر ہی کیا موقوف ہے؟ بیشتر سابقہ نوآبادیات نے ترقی کی سرمایہ دارانہ راہ اختیار کی اور عالمی سرمائے سے اسی قسم کے خصوصی روابط قائم کئے جو پاکستانی ریاست نے کئے۔ یقیناً حمزہ علوی ان تمام سابقہ نوآبادیات کی "ماورئی" ریاستی قیادتوں کے ذہنوں میں اس ایک ہی خود اپنی تشریح آپ عقیدے کی آمد کو کوئی حادثہ قرار نہیں دے سکتے۔ عالمی سرمائے نے پاکستان اور ان تمام دیگر نوآزاد ممالک کو ترقی کی سرمایہ دارانہ راہ پر اس لئے لگایا کہ بیک وقت ان ممالک کے تیز تر استحصال کے لیے یہاں محنت کی پیداواریت بڑھائی جائے اور ان ممالک میں سرمایہ داروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو جو عالمی اشتراکیت کے خلاف جنگ میں اس کا حلیف ہو۔ حمزہ علوی اس مفروضے سے کہ پاکستانی ریاستی قیادت پاکستان میں صنعتی ترقی کی خواہاں تھی فوری طور پر اس نتیجے پر کود جاتے ہیں کہ چنانچہ انھوں نے سرمایہ داریت

اور سرمایہ داروں کی مدد و اعانت شروع کردی۔ لیکن ان دونوں مفروضوں کے درمیان بہت وسیع خلیج ہے اور ایک سے دوسرے تک پہنچنے کے لیے سماجی و اقتصادی نظاموں کے بارے میں کچھ نظریاتی ترجیحات حائل ہیں صنعتی ترقی سرمایہ دارانہ بھی ہوسکتی ہے اور غیر سرمایہ دارانہ بھی اور محض "عقلی" بنیادوں پر صنعتی ترقی کی خواہاں پاکستانی ریاست کو ترقی کی ان دونوں راہوں کا یقیناً علم ہو گا اس کے سامنے عالمی اشتراکی نظام کی مثال بھی موجود تھی اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی بھی۔ ظاہر ہے کہ پاکستانی ریاست محض صنعتی ترقی نہ چاہتی تھی، محض صنعتی ترقی کے "عقیدے" پر اس کا ایمان پختہ نہ تھا "بلکہ وہ سرمایہ دارانہ صنعتی ترقی چاہتی تھی۔ اسٹیٹ بنک کے اعلیٰ افسران جن میں حمزہ علوی بھی شریک تھے، محض اس مسئلے پر اپنا سر نہیں دھن رہے تھے کہ اس ملک میں صنعتی ترقی نہیں ہو رہی بلکہ وہ اس مسئلہ پر مشوش تھے کہ یہاں سرمایہ دارانہ ترقی نہیں ہو رہی۔ انہوں نے جس انداز میں مسئلہ اٹھایا ہوا تھا۔ اس میں پہلے ہی سماجی و اقتصادی نظام کے بارے میں ترجیحات اور "طبقاتی" نقطۂ نظر مفروض تھا چنانچہ اب وہ خالصتاً "عقلی" و "منطقی" بنیادوں پر غور و فکر کر کے اپنی "آزادی" پر اپنی پیٹھ ٹھونک سکتے تھے چنانچہ پاکستان میں ایسی انڈسٹریل کارپوریشن نہیں بنی جس کا مقصد محض صنعتی ترقی ہو۔ بلکہ پاکستان میں ایک ایسی پاکستان انڈسٹریل کارپوریشن بنی جس کی بنیادی دستاویز میں یہ رقم تھا کہ "پی آئی ڈی سی کا بنیادی مقصد ریاستی ملکیت میں صنعتوں کا قیام نہیں بلکہ صنعتوں کی ترویج ہے کارپوریشن نجی سرمائے کو اپنے ساتھ شامل کرنے کی کوشش کرے گی اور جونہی یہ بات قابلِ عمل ہوئی اپنا سرمایہ بھی نجی سرمایہ کاروں کو منتقل کر دیگی"۔ چنانچہ حمزہ علوی صاحب کی پاکستانی ریاست کی قیادت کا شعور ریاستی ملکیت کے تصور سے آگاہ تھا لیکن وہ سرمایہ دارانہ نجی ملکیت کو ترجیح دے رہا تھا۔ اور یقیناً حمزہ علوی صاحب خود اس ریاستی قیادت کے شعور کی بنیاد پر یہ توجیہہ نہیں کر سکتے کہ اس نے اپنے شعور میں موجود ریاستی ملکیت کے تصور کو کیونکر

رد کر کے نجی سرمایہ دارانہ ملکیت کو کیونکر ترجیح دی! ایسا کرنے کے لیے محض موضوعی تصوریت سے اُن کا کام نہیں چل پائے گا، بلکہ ان کو مطلق تصوریت کا سہارا لینا پڑے گا۔ یقیناً وہ اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اور وہ بھی غیر سرمایہ دارانہ صنعتی ترقی کی راہ اپنانے کے بجائے سرمایہ دارانہ صنعتی ترقی کی راہ اپنانے کے فیصلے کی وجوہات ریاستی قیادت کے شعور کے باہر عالمی سرمایہ داریت اور عالمی اشتراکیت کی ہمہ گیر کشمکش میں پاکستانی قیادت کی پوزیشن میں ہی تلاش کریں گے۔

ہم اپنے اصل موضوع سے ذرا بھٹک گئے تھے اس لیے آیئے اپنے موضوع گفتگو کا اعادہ کرلیں ہم یورپ میں سرمایہ داریت اور مطلق العنانیت کے درمیان ربط و تعلق دیکھ چکنے کے بعد پاکستان میں سرمایہ داریت اور مطلق العنانیت کے کہیں زیادہ گہرے رشتے کو واضح کر رہے تھے ہم کہہ رہے تھے کہ پاکستان میں مطلق العنان ریاست نے ہی سرمایہ داریت کو پروان چڑھایا، نجی سرمائے اور سرمایہ داروں کو پالا پوسا پہلے بلا روک کھلی درآمدی پالیسیوں کے ذریعے تجارتی سرمائے کو فربہ کیا، لائسنسوں اور پرمٹوں پر سرمایہ کھلا پھولا پھر درآمدات پر پابندیاں لگا کر اور منافعوں کی انتہائی اونچی سطح کی اجازت دے کر صنعتی سرمائے کو بڑھایا۔ آدم جی، داؤد، لیہن، کریسنٹ، اصفہانی، کریم، سہگل، باوانی، فینسی، نشاط، ہوتی سب کو پی آئی ڈی سی کی لگائی ہوئی صنعتیں عطا ہوئیں، جاگیرداروں کی سیاسی طاقت سے قطع نظر زائد وسائل کو زرعی شعبہ سے صنعتی شعبہ میں منتقل کیا گیا خود وردی بے وردی نوکر شاہی کی صفوں سے صنعت کار اور سرمایہ دار تخلیق ہوئے۔ جاگیرداروں کی صفوں میں سے بھی سرمایہ داروں کی تخلیق اسی نے کی۔ پنجاب سے .... قزلباش، نون، قریشی اور عباسی (بہاول پور) اور تالپور، سومرو اور جتوئی سندھ سے اسی کی سرپرستی و اعانت سے سرمایہ دارانہ صنعت کاری میں داخل ہوئے زرعی سرمائے کا آغاز بھی اسی کے ہاتھوں سبز انقلاب سے شروع ہوا اور اسی کے زیر سرپرستی آج انتہائی تیزی سے پھل پھول رہا ہے۔ انہیں ٹریکٹر، ٹیوب ویل، اور کیمیاوی کھاد رعایتی نرخوں پر دیئے گئے نیز طرح طرح کے قرضے دیئے گئے آج زرعی سرمایہ بھی آسمان

کو چھوڑ رہا ہے۔ اس آمریت نے خود اپنی صفوں میں سے زرعی سرمایہ دار بھی پیدا کیے صرف ۱۹۸۵ء میں اس کی بینکوں نے نجی شعبہ کو ۹۰ ارب روپے سے زیادہ بطور زرِ پیشگی دیئے جبکہ مختلف کوآپریٹیو سوسائیٹیوں نے افراد کو مزید ۱۵ ارارب روپے سے زیادہ قرضے دیئے جبکہ اسی سال صرف ۹۰ کروڑ روپے کی وصولی ہوئی بنکوں اور دیگر مالیاتی اداروں کے قرضے بلاشبہ نجی سرمائے کی اعانت و سرپرستی کرنے کا صرف ایک ذریعہ ہیں۔ ان کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔ یہ ایک علیحدہ موضوع بھی ہے اور ایک غیر متنازعہ فیہ امر بھی کہ پاکستان میں تمام سرمائے، سرمایوں کے تمام گٹھ جوڑ، تمام "قومی" سرمائے اور پاکستانی "سرمایہ بھی اسی مطلق العنانیت کا مرہونِ منت ہے۔ ان کا وجود ہی اس کے دم سے ہے اور ان کا دوام بھی اسی پر منحصر ہے۔

اگرچہ "پاکستانی سرمائے اور "قومی سرماؤں" کے مقابلے میں یہ مطلق العنانیت بالادست نظر آتی ہے تاہم یہ "عالمی" سرمائے کی پالتو ہے اور اس کے سامنے بھیگی بلی بنی رہتی ہے۔ "عالمی" سرمایہ یہاں پر سرمایہ دارانہ راہ کی ترقی کے بنیادی خطوط متعین کر دیتا ہے اور پھر ان حدود کے اندر یہ مطلق العنانیت پاکستان کی سرمایہ دارانہ راہ کی کشتی کا ناخدا بنی رہتی ہے جس طرح یہاں تمام سرماؤں پر مطلق العنانیت کا کنٹرول ہے اسی طرح کی پاکستان کی کل معیشت پر "عالمی" سرمائے کا قابو ہے۔ پاکستان نے ۱۹۸۴ء-۸۵ء میں کُل ۳۸ ارب روپے کی اشیاء برآمد کیں جس میں سے ۱۹ ارارب روپے کی اشیاء عالمی سرمائے نے خریدیں یعنی پاکستان اپنی برآمدات کے ۵۰ فی صد کی کھپت کے لیے "عالمی" سرمائے کا دستِ نگر ہے۔ اسی سال پاکستان نے ۸۹ ارب روپے کی درآمدات کیں جس میں ۴۴ ارب روپے کی درآمدات جاپان، امریکہ اور یورپی ممالک سے ہوئیں یعنی پاکستان اپنی درآمدات کے تقریباً پچاس فی صد حصّہ کے لیے "عالمی" سرمائے کا محتاج ہے اس میں اگر مشرق وسطیٰ سے امریکی ماورائے قومی کارپوریشنوں سے آنے والے تیل کے اعداد بھی شامل کر لیے جائیں تو "عالمی" سرمائے پر منحصر درآمدات میں مزید ۲۰ ارب روپے کے لگ بھگ کا اضافہ ہو جائے گا اور پاکستان اپنی درآمدات کے ۷۷ فی صد سے زائد حصّے کے لیے عالمی سرمائے کا محتاج ہوگا۔ ان اعداد و شمار سے "عالمی" سرمائے

پر پاکستانی معیشت کے انحصار کی بھرپور سطح کا اندازہ نہیں ہوتا، چونکہ دیگر ممالک کے خانوں جنھیں درآمدات و برآمدات کا اندراج ہوتا ہے ان میں یہ تخصیص نہیں دستیاب کہ ان کا کون سا حصہ ان دیگر ممالک میں قائم ماورائے اور کثیر القومی کارپوریشنوں نے خریدا یا فروخت کیا اور نہ ہی ان اعداد و شمار میں فوجی ساز و سامان کی مد میں درآمدات کا کوئی حساب کتاب درج ہے پاکستان نے ۱۹۸۴-۱۹۸۵ء کے دوران ۱۱ ارب ۸۰ کروڑ ڈالر کے قرضے وصول کیے جس میں سے ۱۱ ارب ۴۷ کروڑ ڈالر کے قرضے "عالمی" سرمائے سے دو طرفہ یا کثیر الطرفہ بنیادوں پر لیے گئے اور صرف ۴ کروڑ ڈالر سے کم مشرق وسطیٰ اور مشرقی یورپ کے ممالک سے آئے یعنی پاکستان کے قرضوں کا ۹۶ فی صد سے زیادہ حصہ "عالمی" سرمائے کا مرہون منت تھا۔ ۱۹۸۴-۱۹۸۵ء میں پاکستان کی برآمدات کا ۵۰ فی صد حصہ، درآمدات کا ۷۰ فی صد حصہ، قرضوں کا ۹۶ فی صد حصہ "عالمی" سرمائے کا دست نگر تھا۔ یہ اعداد و شمار خود دل بٹھا دینے والے ہیں تاہم یہ پاکستانی معیشت پر عالمی سرمائے کے شکنجے کی پوری قوت کا اظہار نہیں اور یہ ہے وہ پاکستانی معیشت ہے جسے "پاکستانی" ریاست نے چلانا ہوتا ہے عالمی سرمایہ لوٹ نہیں وہ سال بہ سال اپنے متوقع مطلوبہ منافعوں کو وصولتا ہے اور غیر معاشی سیاسی مقاصد بھی پورے کرتا ہے۔ "عالمی" سرمائے کے ان مطالبوں کی تکمیل کرنے والی ریاست کے لیے "قذیے خود مختاری" کا تصور انتہائی بھونڈا اور منافقانہ ہے جتنا کہ وہ مختلف تصورات گمراہ کن ہیں جن کے تحت عظیم الجثہ اجارہ دارانہ سرمایہ دارانہ صنعت میں جدید انتظام و انصرام اور محنت کی جدید تنظیم کے نتیجے میں چند بورژوا نظریہ سازوں نے یہ تاثر پھیلانے کی کوشش کی تھی کہ اب جدید صنعتی ممالک میں سرمایہ داریت ختم ہوگئی ٹیکنوکریٹ آزادانہ، خالصتاً تکنیکی و علمی بنیادوں پر عقلی و منطقی فیصلے کرتے ہیں۔ گویا یہ جدید تکنیکی منتظمین سرمائے پر مطلوبہ اوسط شرح منافع سے بلکہ متجاوز شرح منافع سے معاوضوں کی ادائیگی سے مبرا و بے پرواہ ہو گئے ہیں پاکستانی ریاست پاکستانی معیشت پر "عالمی" سرمائے کے شکنجوں کی عکاس ہے اور "عالمی" سرمائے اور وسیع المشرب جگ ولیسی سرمایہ دار طبقے کا دست

بازو ہے پاکستانی سرمایہ دارانہ معیشت پر عالمی سرمائے کی گرفت اتنی مضبوط و مستحکم ہے کہ اس کے
چند محتاط اور میانہ رو اقدامات پاکستانی ریاست کی کسی بھی قیادت کو غیر مستحکم و متزلزل کر سکتے
ہیں اور اس کو منہ کے بل زمین پر گرا سکتے ہیں۔ پاکستانی ریاست نے "عالمی" سرمائے کے منافعوں
اور عالمی استعمار کی عالمی اشتراکیت کے خلاف کش مکش کے محکمات کی حدود کے اندر ہی کام کرنا ہے۔
چونکہ عالمی استعمار نے یہ نسخہ تجویز کیا ہے کہ اس نے عالمی اشتراکیت کے خلاف لڑنے کے لیے پاکستان
کے اندر ایک سرمایہ دار طبقے کو جنم دینا ہے اس لئے پاکستانی ریاست نے پاکستان میں سرمایہ دار طبقے
کی اعانت کرنی ہے اسے پروان چڑھانا ہے چاہے خود پاکستانی سرمایہ دار طبقے کے پاس اتنی قوت ہو
یا نہ ہو کہ وہ اپنی مطلوبہ پالیسیاں منوا سکے ان پالیسیوں کا قطعاً پاکستانی قیادت کے آزادانہ ،
بے غرضانہ شعور، عقیدوں، ایمان، تفکرات اور تشویشوں سے کوئی تعلق نہیں چونکہ "عالمی" سرمائے
نے بین الاقوامی محنت کے استحصال کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا ہے کہ عالمی استعمار کے استحصال کے لیے
ضروری ہے کہ پاکستانی عوام کی محنت کی پیداواریت میں اضافہ کیا جائے اور محنت میں شدت لائی
جائے اس لیے یہاں سرمایہ دارانہ صنعت کاری بھی ہوگی اور زرعی سرمایہ داریت بھی آئے گی چاہے
ان عملوں کے اجراء کے لیے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے طبقے کی جانب سے کوئی دباؤ ہو یا نہ
ہو اس بات کا اسٹیٹ بینک یا دیگر اداروں میں بیٹھے ہوئے اہل کاروں کی پاکستان کی
"محض صنعتی" ترقی کے لیے مباحث سے کوئی تعلق نہیں گویا اگر کوئی "اور اہل کار" بیٹھے ہوتے اور
ان کی گدی میں کوئی اور بات بیٹھ جاتی تو پاکستان میں ترقی کا رجحان کچھ اور ہو جاتا ہمیں اپنے
ستاروں کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے کہ اس وقت پاکستان کی قیادت میں ایک مخصوص "شعور" کے
حامل لوگ بیٹھے تھے ورنہ "شعور" کا کیا بھروسہ، کس وقت کس کے ذہن میں کیا بیٹھ جائے!
اور چونکہ عالمی استعماری سرمائے نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ پاکستان میں سرمایہ دارانہ صنعتی ترقی
روز افزوں طور پہ پاکستان کے تمام سرمائے کی "عالمی" سرمائے پہ محتاجی بڑھائے گی اور اس
مقصد کے حصول کیلئے وہ پاکستان میں سرمایہ دارانہ ترقی کے وسیع ترین خطوط راہ متعین کرتا رہتا ہے!

اس لئے چاہے پاکستان کے عوام اور دیگر طبقوں کے روشن خیال حلقے کتنا ہی غم و غصہ کیوں نہ کریں کتنا ہی کیوں نہ مضطرب ہوں اور دباؤ ڈالیں "پاکستانی" ریاست پاکستان کے تمام طبقات سے ماوریٰ و بے پرواہ پاکستانی سرماؤں کو صرف وسیع المشرب سرمائے دار طبقے کی متعین کردہ سرمایہ دارانہ راہ کی خطوط راہ پہ گامزن رکھے گی۔ پاکستانی ریاست پاکستان میں عالمی سرمائے کی تصریحات کے مطابق سرمایہ دار طبقے کو جنم دینے کے لیے عالمی سرمائے کی خدمت گذار "دائی" ہے اور پھر اس "بچے" کو پالنے پوسنے، اس کی ضروریات کی تکمیل کرنے، اس کی بے وقوفیوں اور شرارت انگیزیوں پہ اسکی سرزنش کرنے اور کبھی کبھی ٹھکائی لگانے کے لیے عالمی سرمائے کی مقرر کردہ "آیا" بھی۔

پاکستان میں "عالمی سرمائے" اور "مقامی" سرماؤں کی کارفرمائیوں کی اس ریل پیل میں ان تمام سرماؤں کو صرف ایک چیز سے خطرہ ہے۔ وہ ہے پاکستان کا محنت کش طبقہ اور پاکستان کے مظلوم اور پستے ہوئے محنت کش عوام۔ "عالمی" سرمائے اور تمام مقامی سرماؤں کے استحصال کا بوجھ یہی سہتے ہیں اور چنانچہ ان میں بے پناہ بے چینی موجود ہے۔ پاکستان میں جب سرمائے کو بحال کرنے کے لئے زراعت سے صنعت کی جانب وسائل کی منتقلی ہوئی تو اوپری دیہی طبقے کو لون، قرضوں، ٹریکٹروں اور کھاد وغیرہ کی شکل میں مختلف مراعات دے دی گئیں اور ان کی شکایات کی تلافی کردی گئی، لیکن اس کا تمام تر بوجھ چھوٹے کسانوں اور مزارعوں اور بے زمین مزدوروں پہ ڈال دیا گیا۔ مزدوروں اور کسانوں اور دیگر محنت کش عوام پر اتنے شدید بوجھ کے باعث عالمی سرمائے سمیت مقامی سرمائوں کی بنیادی ضرورت یہی ہے کہ یہ ریاست مطلق العنان ہو۔ وہ مزدوروں اور محنت کشوں کو دبانے کے لیے اسی مطلق العنانیت پہ ہی بھروسہ کر سکتا ہے۔

پاکستان کے مخصوص حالات میں "جمہوریت" سرمائے کے لیے دو اطراف سے خطرہ بنتی رہی ہے ایک جانب تو اس لیے کہ جمہوری انتخابات کے نتیجے میں لازمی طور پہ ریاست پر جاگیردارانہ یا نیم جاگیردارانہ قیادت برا جمان ہوتی ہے اور اس کے لازمی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ پاکستان

ہیں ابتداً دیہی آبادی کل آبادی کا ۹۵ فی صد تھی اور اگرچہ یہ صورت حال بدلتی رہی تاہم یہ تناسب
آج بھی دیہی آبادی کے حق میں ہی ہے۔ اور اس وقت لازمی طور پر انتخابات اور دستوری
جمہوری حکومت کا قیام کا لازمی مقصد یہ نکلتا کہ دیہی بورژوازی جاگیردار و نیم جاگیردار اور
قبائلی سرداروں کا ایک امتزاج قیادت میں آکر پاکستان کے لیے "عالمی" سرمائے کے نسخوں کو
بھی خراب کرتا اور خود "مقامی" سرمائے کی آرزوؤں اور تمناؤں کی بلا روک نشفی کی راہ میں
روڑے اٹکاتا چنانچہ "عالمی" سرمائے اور "مقامی" سرمائے دونوں نے مطلق العنان یک سنگ
ستون حکومت کو سرمائے کی ترقی کی بنیاد جانا۔ علاوہ ازیں جمہوری حکومت کسی نہ کسی طور
محنت کش عوام کی خواہشات کی عکاس بھی ہوتی۔ یہ اُمر بھی پاکستان کا ایک خصوصی وصف
ہی ہے کہ گرچہ سرمایہ داریت کی ترقی کے نتیجے میں یورپ میں سرمایہ دار نے نہ صرف صنعتی مزدوروں
اور شہری عوام کی قیادت کی بلکہ جاگیرداروں کے سروں کے اوپر سے خود جاگیروں کی رعایا کسانوں
کو بھی اپنے پیچھے صف آراء کیا۔ تاہم پاکستان میں یہ عمل برعکس حقیقت پذیر ہو رہا ہے۔
یہاں سرمایہ نہ صرف محنت کشوں کو اپنے عقب میں صف آراء کرنے سے قاصر ہے بلکہ دیہی حکمران
طبقے پر مبنی سیاسی صف بندیاں شہروں کی مزدور بستیوں اور دیگر مظلوم محنت کش عوام کی کچی
بستیوں کو اپنے عقب میں متحد کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں ظاہر ہے کہ محنت کش عوام کا یہ سیاسی
چلن سرمائے کے تجاوزات اور عوام دشمن سرگرمیوں پر ان کے فیصلے کا عکاس ہے نیز پاکستان
بہرحال برطانوی سامراج کے خلاف ایک ایسی جدوجہد آزادی کا نتیجہ تھا جس میں عوام بڑے پیمانے
پر متحرک ہوئے تھے۔ جس کی کامیابی کے نتیجے میں یہاں کے عوام نے مساوات و انصاف پر مبنی
ایک معاشرے کے قیام کی توقعات باندھی تھیں۔ سامراج سے آزادی اور مساوات اور انصاف پر
مبنی معاشرے کے قیام کی توقعات کی یہ قندیلیں گل نہیں ہو گئی تھیں اور کسی بھی جمہوری ابھار کے
نتیجے میں دوبارہ زور پکڑ کر "عالمی" سرمائے کی سرمایہ دارانہ راہ کے بندوبست کو مٹی میں ملا سکتی
تھیں۔ اس کے علاوہ خود "مقامی" سرمائے کے آزادانہ بڑھوار کے اندرونی اوصاف بھی روشن

خیال لوگوں کے ذہن میں ایسے نقوش چھوڑتے تھے کہ وہ "عالمی سرمائے" کے چنگل سے ملک کی آزادی کے لیے متحرک ہوں اپنے ملک کو ذلت آمیز پس ماندگی اور عالمی سرمائے کی دست نگری سے نجات دلائیں اور جاگیردارانہ استحصال سے غریب محنت کش عوام کو نجات دلائیں یہ تمام تر ان تمام آرزوؤں اور تمناؤں کے قومی محرکات میں "عالمی سرمائے" اور پاکستان میں "سرمایہ دارانہ راہ عمل" اس کے تجویز کردہ نسخے کے لیے شدید خطرات پوشیدہ تھے وہ جانتا تھا کہ جمہوریت، عام انتخابات وغیرہ ان قومی محرکات کے ناقابل مزاحمت دھارے کے بند کھول سکتے ہیں چنانچہ اس نے جمہوریت سے اجتناب کیا۔

۱۹۷۰ء میں متعدد عوامل کے ملاپ کے نتیجے میں یہی کچھ ہوا انتخابات ہوئے اور عوامی دھارے میں جاگیردارانہ قیادت، محنت کشوں کے ریلے اور روشن خیال دانشوروں کا گٹھ جوڑ جمہوری بنیادوں پر اسناد اقتدار لے کر انتقالِ اقتدار کا دعوے دار ہو گیا اور پھر مزید عوامل کی کارفرمائیوں کے نتیجے میں اسے انتقالِ اقتدار بھی کرنا پڑ گیا سرمایہ دارانہ نقطۂ نگاہ سے اس جمہوری حکومت نے "معیشت" کا (سرمایہ دار کی نگاہ میں معیشت اور سرمایہ دارانہ معیشت مترادف ہیں) ستیاناس ہی کر دیا عالمی سرمائے سمیت تمام سرمایوں کے نقطۂ نگاہ سے معیشت کا یہ ستیاناس اس لیے ہو گیا کہ پاکستان نے اپنی معیشت کو آزاد کرانے کے لیے اسٹیل مل، جوہری توانائی وغیرہ لگانی اور فولاد کے کارخانے سے متعلق صنعتوں اور کیمیاوی صنعتوں وغیرہ کا منصوبہ تیار کر لیا۔ روس اور دیگر مشرقی یورپی ممالک سے امداد اور قرضے لینا شروع کر دیئے۔ حبیب، بھنگل، ولیکا، اتفاق، فینسی، بیکو، آدم جی، ظفر الاحسن گندھارا کالونی، ریاض و خالد، داؤد، رنگون والا، حئی سنز، وزیر علی، ہارون کے کارخانوں کاروبار اور بینکوں وغیرہ پر مبنی اثاثوں کے معتدبہ حصے کو قومیا لیا یا ریاستی شعبہ قائم کر دیا جس کا مقصد پی آئی ڈی سی کے برعکس واقعتاً ریاستی ملکیت کا قیام تھا۔ نجی شعبہ کا "اعتماد" متزلزل کر دیا۔ مادر لٹے قومی کو دھچکا پہنچانے کے لیے جبری اسکیم شروع کر دی۔ مزدوروں کو آجروں پر چڑھا

دیا۔ ہڑتالیں عام ہوگئیں اور مزدور منہ زور ہوگئے۔ چھانٹی مشکل ہوگئی۔ کسانوں کو پانچ مرلے دے کر ان کو بھی اسناد ملکیت پکڑا دیں اور بے دخلی کو مشکل کردیا۔ زراعت میں سرمایہ داریت کے دخول کو تیز کردیا۔ کپاس کی پیداوار کرنے والوں کو خوش کرنے کے لیے کاٹن جننگ فیکٹریوں کو قومیا لیا۔ وعدہ کیا کہ اب مزید صنعتیں قومی تحویل میں نہیں لی جائیں گی اور گھی کی صنعت کو قومیا لیا۔ بین الاقوامی سرمائے نے اپنے اندرونی تضادات کو سر کرنے کے لیے کثیر القومی ادارے، بین الاقوامی مالیاتی فنڈ اور عالمی بینک وغیرہ ترویج دیئے تھے لہٰذا کثیر الطرفہ بنیادوں پر قرضوں اور سرمایہ کاریوں کا بندوبست کیا تھا۔ یہ دو طرفہ تعلقات کے لیے دباؤ ڈالنے لگے، اسلامی ملکوں کا واقعتاً سرگرم محاذ بنانے لگے، غیر جانبدار ممالک کی تحریک میں سرگرم ہوگئے، ایران میں کیوبا وغیرہ کی جانب جھکاؤ ڈالنے لگے اسلامی بم کی سوجھی۔ سی ایس پی کے ممتاز مادری ڈھانچے میں خلل اندازی شروع کردی، ان کی تنخواہوں کے تعین کے لیے علیحدہ ڈھانچوں کا دوسروں کے ساتھ انضمام کردیا، اس کی اعلیٰ سطحوں پر براہ راست داخلے کے لیے نئی دروازے کھول دیئے۔ نجی تعلیمی اداروں کو قومیا لیا۔ میٹرک تک فیسیں معاف کردیں۔ تعلیمی اداروں کے اعلیٰ فیصل اداروں میں طلباء اور اساتذہ کو نمائندگی دے ڈی۔ الغرض سرمائے کی لگی بندھی اصطلاحوں اور محاوروں کے مطابق ہر مظلوم طبقے اور پرت کی "توقعات" بڑھا دیں۔ جگہ جگہ حکمران جماعت کے مقامی وارڈ دفتر تھانے کے "معاملات" میں "دخل اندازی" کرنے لگے تھانے لوگوں کو پکڑ کر ابھی اپنے "بھتہ" کی وصولی کا بندوبست بھی نہ کر پاتے تھے کہ وارڈ چیئرمین اپنے "تیلی تنبولیوں" سمیت آن دھمکتے، کسی وزیر کا فون بھی کروا دیتے اور بندے کو چھڑا لے جاتے۔ لوجی کوئی "قانون" بھی نہ رہا۔ ہر چیز "وحشت" کا شکار ہوگئی۔ گھر گھر اعلیٰ و اعلیٰ متوسط بورژوازی کی خواتین کی ہر لحظہ ایک ہی شکایت کی آہ بکا سنائی دیتی: "اس بھٹو کا خدا ستیاناس کرے، اب تو نوکروں کے مزاج ہی نہیں ملتے۔"

اندراجات بالا پاکستان کی سیاسی تاریخ میں اس عارضی وقفہ کے محیط و بسیط مقام

کی بالائی سطح بھی نہیں کھرچتے۔ تاہم ان سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ جمہوری حکومت کس طور نیم جاگیرداریت، زرعی سرمائے محنت کش طبقے اور پاکستان کے محنت کش عوام کسانوں، ہنرمند اور اُجرت پیشہ ادنی بورژوازی، روشن خیال دانشوروں اور پاکستان کی عالمی استعمار سے "آزادانہ" ترقی کے خواہاں مختلف طبقوں کی پرتوں کے جذبوں کو مہمیز دینے کا باعث بھی ہو رہی تھی اور کس طرح پاکستان کی آبادی کے یہ طبقے اور پرتیں جمہوریت کے نتیجے میں کھلنے والے دروں سے دھکم پیل کرتے ہوئے ایک طاقت ور دھارے کی صورت میں داخل ہو کر پاکستانی معیشت و سیاست پر اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کے نقوش ثبت کر رہے تھے اور یہ وہ عوامی قوتیں ہیں جن سے سرمایہ ہول کھاتا ہے خصوصاً پاکستان کی مخصوص صورتحال میں جہاں زراعت و صنعت دونوں میں تقریباً ایک ہی وقت آگے پیچھے سرمایہ داریت کی آمد آمد کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تضادات کے باعث سرمایہ محنت کش طبقے اور محنت کش عوام کسانوں اور دیگر پرتوں کی قیادت سنبھال کر بورژوا جمہوریت کے خصوصی توازن کو ٹھہراؤ نہیں دے سکتا۔ اسے ایک ایسی "ریاست" کی ضرورت ہے جو ان قوتوں کے جذبوں اور تڑپ کی سرکشی کر سکے۔ مطلق العنانیت اس کی قطعی ضرورت ہے اور چنانچہ وہ بار بار مطلق العنان ریاست کی حاضرات کرتا ہے۔ اسے مستحکم و مضبوط کرتا ہے اُسے دوام دینے کے لیے کوشاں رہتا ہے، بلاشبہ چونکہ یہ مطلق العنانیت چور شاہی بھی ہے اس لیے وہ گاہے بگاہے اس کی بدعنوانیوں اور دیگر لغویتوں پر چیں بچیں بھی ہوتا ہے لیکن اوّل تو سرمایہ خود چوری، ڈاکے منشیات فروشی اسمگلنگ کالے دھن وغیرہ میں پلا ہوتا ہے اس لیے وہ رشوت، بھتوں وغیرہ کے بارے میں سر سے پیر تک بورژوا "نفوجھکو" چھچھی پر مبنی رویوں اور اخلاقی اقدار کا حامل ہی نہیں ہوتا۔ دوئم یہ رشوتیں وغیرہ اُس کے لیے اس لیے بھی قابل قبول ہیں کہ وہ اس طرح صدیوں کے جاگیردارانہ اور ماقبل سرمایہ دارانہ ریاستی انتظام و انصرام کے قواعد و ضوابط میں اُلجھے ہوئے جدید دفتری مطالبوں شرائطوں وغیرہ کو سُرعت سے سر کر لیتا ہے۔ اس طرح حاصل ہونے والی سرمائے کی تیز تر

لوٹ پوٹ اس کے حقوں کی ادائیگی کے نقصان کو پورا کرنے کے علاوہ اوپر سے کچھ اور ہی دے بھاگتی ہے تاہم سب سے اہم بات یہ ہے کہ مطلق العنان چور شاہی کو نذرانے دینے سے سرمائے کا اس وقت تک کوئی حرج نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس مد میں ہونے والے اخراجات کا بار ملک کے وسیع عوام کے کاندھوں پر منتقل کر سکتا ہو بلاشبہ مطلق العنانیت اس امر کا سیر حاصل بندوبست کرتی ہے چونکہ مطلق العنانیت نہ صرف اپنے بھتوں اور غنڈہ ٹیکس کا بوجھ پاکستان کے وسیع عوام کے کاندھوں پر ڈالنے کا بندوبست کرتی ہے بلکہ ان تضادات اور تلاطموں کا گلا بھی گھونٹ کر رکھتی ہے جو سرمایہ دارانہ استحصال کے نتیجے میں لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں اس لیے مطلق العنان چور شاہی سرمائے کی من پسند ریاست ہے۔

پاکستانی ریاست عالمی سرمائے کی دست و بازو ہے، تاہم عالمی سرمائے کی ضرورت بھی یہی ہے کہ یہ دست و بازو مطلق العنان ہو اس ضمن میں پاکستان میں سرمائے کے استحصال اور اس کے پھیلاؤ سے پیدا ہونے والے ان تمام اثرات، تضادات اور تلاطموں کو دبا کر رکھنے کے وہ محرکات عالمی سرمائے کے پیش نظر بھی ہیں جن کا تذکرہ ہم نے اوپر کیا۔ تاہم عالمی سرمائے کو مقامی حکمران طبقوں سے ماورائی یہ مطلق العنان بازو اس لیے بھی چاہیئے کہ وہ یہاں پر سرمائے کی ترقی وار تقاء کے خطوط راہ متعین کر سکے ان کی آزادی کی خواہش کو دہانہ لگا سکے نیز پاکستان میں مختلف سرماؤں کی کشتی مکشتوں کو سنوار سکے اور ملکی و غیر ملکی وسائل میں سے بڑا حصہ لے اڑنے کی ان کی امنگوں اور جذبوں اور ان امنگوں کو حقیقت پذیر کرنے کے لیے ان کی لپاڈگی کو اس حد سے تجاوز نہ کرنے دے کہ وہ سرمائے کی ترقی اور ملک میں سرمایہ دارانہ کشتی ہی کو ڈبو دیں۔ وہ وسائل کی بندر بانٹ کو اپنے ہاتھوں میں مرتکز رکھنا چاہتا ہے جمہوری طور طریقوں سے لازمی طور پر سرمائے کا کوئی ایک خاص گروہ یا ان گروہوں کا کوئی گٹھ جوڑ ریاست پر قابض ہو سکتا ہے اور وہ دوسرے سرماؤں کو زک پہنچا کر سرمایہ دار طبقے میں ایسی ناقابل عبور خلیج پیدا کر سکتا ہے جس پر پل نہ باندھا جا سکے علاوہ ازیں جمہوری طور طریقے دیگر عوامی قوتوں کے دھارو

کے بند بھی کھول سکتے ہیں اور خود سرمائے کی کش مکش ان دھاروں کو تیز کر کے ان کو لگام دینے میں ناکام بھی ہو سکتی ہے۔ مقامی سرمائے ابتداء سے ہی عالمی سرمائے اور اس کی دست و بازو ریاست کے زیرِ سایہ پروان چڑھے ہیں وہ خود اپنی حقیقت، اپنی ترقی وارتقاء کی راہوں سے آشنا نہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ عالمی بینک کا ایک ترجمان محبوب الحق ان کی تراش خراش کرتے ہوئے ان کو عنفوان شباب کے مرحلے سے گزرے، اور ان کی جوانی کی پُر تقصیر ترنگوں پر ٹھنڈا پانی ڈالتا ہے۔

پاکستان میں مادّی مالیاتی وسائل کے لیے زرعی سرمائے اور مصنوعاتی مہم جوئیوں میں مصروف صنعتی سرمائے اور تجارتی سرماؤں میں کش مکش ہے پاکستان کے مالیاتی وسائل میں سے بڑا حصّہ مصنوعاتی شعبہ ہی لے اڑتا ہے جب کہ زرعی شعبہ کو قدرے کم حصّہ ملتا ہے۔ ۱۹۸۴ء میں مصنوعاتی شعبہ کو ۴۰۔ارب سے زائد روپے بطور قرضہ دیے گئے، اگر اس میں تعمیراتی، ٹرانسپورٹ اور تجارت کے شعبوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو مزید ۱۹۔ ارب روپے کا اضافہ ہو جائے گا۔ جب کہ اسی سال زرعی شعبہ کو (جس میں جنگلات، شکار اور مچھلی کا شعبہ بھی شامل ہیں) صرف گیارہ ارب روپے دیئے گئے۔ یہ صورت حال فطری طور پر زرعی سرمائے کو برانگیختہ کرتی ہے گرچہ یہ سرمائے نحیف تر ہیں لیکن مالیاتی و دیگر وسائل کے لیے ان کی حرص مصنوعاتی سرمائے سے کسی طور پر کم نہیں علاوہ ازیں چونکہ انتخابات وغیرہ کے نتیجے میں ریاست کی تشکیل پر ان کا عمل دخل زیادہ گہرا ہو جاتا اس لئے یہ اس بات سے بے پرواہ کہ جمہوریت تمام سرمائے اور پوری سرمایہ دارانہ راہ کی مخالف قوتوں کو متحرک کر دیگی، صرف اپنے مفادات کو آگے بڑھانے اور مصنوعاتی سرمائے کو زک پہنچانے کے لئے جمہوری داؤں استعمال کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ اور اس مخصوص سرمایہ دارانہ راہ کو خراب کرنے پر تل جاتے ہیں جس کا نسخہ عالمی سرمائے نے تجویز کیا ہے۔

چنانچہ ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۶ء (جب کہ منتخب حکومت تھی) چار سالہ دور میں زرعی سرمائے کو ملنے والوں قرضوں میں ۵ ء ۲ گنا اضافہ ہوا جب کہ اسی دورانیہ میں مصنوعاتی شعبہ کو ملنے والے قرضوں میں ۵ ء ۱ گنا اضافہ ہوا۔ اس کے برعکس ایک عبوری وقفہ کے بعد ۱۹۸۱ء تا

۱۹۸۴ء مطلق العنان ریاست کے چار سالہ دَور میں زرعی سرمائے کو ملنے والے قرضوں میں ۱۳ گنا اضافہ ہوا جب کہ اسی دورانیہ میں مصنوعاتی شعبہ کو ملنے والے قرضوں میں ۱۰۸ گنا اضافہ ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ سرمایہ دارانہ راہ کا بنیادی بہاؤ مصنوعاتی سرمائے کی جانب ہی ہے یہ لیکن ۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۴ء دور ہی عالمی سرمائے کی متعین کردہ سرمایہ دارانہ راہ کی صحیح نشاندہی کرتا ہے اور چونکہ ۱۹۷۳ء تا ۱۹۷۶ء عالمی سرمائے کی اس متعینہ راہ سے چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی اسی لیے ان کے بورژوا ماہرین معاشیات شور مچا رہے تھے کہ پاکستان میں معیشت (جی صرف معیشت) کو تباہ کر دیا گیا۔ یہ سرمایہ دارانہ راہ اتنی محکم اور قطعی ہے کہ آج زرعی سرمایہ بھی روز افزوں طور پر ملک کے طول و عرض میں فیکٹری بی لٹے رپورٹیں لیے گھوم رہا ہے اور مصنوعاتی سرمائے کی مَد میں دستیاب مالی وسائل میں حصّہ بخرہ کرنے کے لیے بے تاب ہے۔ تاہم دریں اثنا عبوری وقفہ میں وہ مصنوعاتی سرمائے سے کش مکش میں یہ شور بھی مچاتا جاتا ہے کہ "صنعت کار ربیبہ لیکر واپس نہیں کرتے۔" وہ ایک جانب زرعی سرمائے کے لیے زیادہ مراعات کے لیے کوشاں بھی ہوتا ہے اور دوسری جانب خود بھی مصنوعاتی سرمائے میں شامل ہونے کے لیے تگ و دو کرتا ہے مگر ہماری پیٹی بورژوا دیہاتی اشتراکیت زرعی سرمائے کی اس دوہری نوعیت سے نابلد اس کی عبوری جدوجہد کی اس عارضی نوعیت سے ناآشنا، زرعی سرمائے کو محنت کش کسانوں کی مدد لانے کے لیے یہ نعرہ بلند کر دیتی ہے کہ "شہر دیہات کو لوٹ رہے ہیں" اور اسی پیٹی بورژوا دیہاتی اشتراکیت ایک ذرا زیادہ جارح صورت کمپوچیا کے "کھمیر روج" کی تمانند سندھ کے شہروں کو "نام پنہہ" بنانے کا "سپنا" دیکھنے لگتی ہے۔ ان کو یہ نہیں پتہ کہ خود زرعی سرمایہ زراعت میں اپنے امکانات کی وسیع ترین حدود کو چھو لینے کے علاوہ مصنوعاتی شعبہ کے امکانات کو حقیقت پذیر کرنے کے لیے شہروں کی جانب رواں دواں بھی ہے اور نئے شہر بھی بنا رہا ہے۔

زرعی سرمائے کی ناعاقبت اندیش ترجیحیں تو سرمایہ دارانہ نظام کی کشتی کو ڈول ہی

سکتی ہیں۔ مگر اپنے آپ کو فربہ تر کرنے کے لیے مصنوعاتی (تجارتی، تعمیراتی وغیرہ) سرمایہ بھی زرعی سرمائے سے کش مکش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔ اگر زرعی سرمائے کو صنعتی سرمائے سے عداوت ہے کہ وہ ملکی وسائل کے بڑے حصے کو ہتھیا لیتا ہے تو صنعتی سرمائے کو زرعی سرمائے سے یہ حسد ہے کہ زرعی سرمایہ اوسط شرح منافع سے زیادہ قدر زائد کی کشید کرتا ہے چونکہ زراعت میں صنعت کی مانند پیداوار کی قیمت اس صنعت میں اوسط حالات پیداوار اور اوسط لاگت پیداوار کی مناسبت سے مقرر نہیں ہوتی بلکہ خراب زمین پر حالات پیداوار کی مناسبت سے مقرر ہوتی ہے اس لیے اچھی یا اوسط زرخیز زمین پر سرمایہ دارانہ بنیادوں پر زراعت کرنیوالا متجاوز قدر زائد اور متجاوز منافع کما لیتا ہے اور تیز رفتاری سے بڑھتا ہے اس کی تیز رفتار بڑھوار اور اس بڑھوار کے نتیجے میں زندگی کے ہر شعبے اور پہلو پر اس کے اٹھتے ہوئے دباؤ کو روکنے کے لیے صنعتی سرمایہ بھی واویلا کرتا ہے "جاگیردار قرضے کھا گئے" وغیرہ وغیرہ اور زرعی سرمائے کو دیہات میں کمزور کرنے اور اس کی حمایت کو منقسم کرنے اور اس میں تھوڑا سا انتشار کا رنگ ڈالنے کے لیے یہی نعرے یہ صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ "بڑے جاگیردار قرضے کھا گئے" جمہور آف کامرس یہ قرارداد پاس کر دیتی ہے کہ "زرعی ٹیکس نافذ کیا جائے" اور مختلف پارٹیاں اس کو اپنے منشور کا حصہ بھی بنا لیتی ہیں اور پیٹی بورژوا شہری انٹیلی جنسیا بھی یہ نعرے لگانے لگتی ہے کہ "جاگیرداروں سے زرعی ٹیکس وصول جائے"۔ اس پیٹی بورژوا انٹیلی جنسیا اور ترقی پسندوں کو یہ نہیں پتہ کہ زرعی ٹیکس جاگیرداروں پر نہیں لگتا بلکہ چونکہ یہ آمدنی پر لگتا ہے اور آمدنی اس کی بڑھتی ہے جو سرمایہ دارانہ بنیادوں پر زراعت کرے گا اس لیے یہ ٹیکس اس زرعی سرمایہ دار پر لگتا ہے جو زراعت کے شعبہ میں سب سے ترقی پسندانہ عناصر و عوامل کا تعیب ہے۔

ضیاء الحق نے اپنی بجٹ کی تقریر میں کہا تھا کہ زرعی ٹیکس زراعت کو تباہ کر دے گا۔ فی الحقیقت اس کو کہنا چاہیئے تھا کہ زرعی ٹیکس سرمایہ دارانہ زراعت کو تباہ کر دے گا نہیں بلکہ اس کو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ زرعی ٹیکس پوری سرمایہ دارانہ ترقی کی راہ کھوٹی کر دے گا۔ حقیقت

یہی ہے کہ چیمبر آف کامرس کا زرعی ٹیکس کا مطالبہ اسی قدر ناعاقبت اندیش ہے جس قدر زرعی سرمائے کی یہ خواہش کہ صنعتی شعبہ کو ملنے والے وسائل میں سے وہ بڑے حصّے کا وصول کنندہ ہو جائے عالمی سرمائے کے پروردہ مقامی سرمائے سرمایہ دارانہ راہ سے خود آگاہ نہیں اور اپنی فوری انفرادی اشتہاؤں کی تسکین میں یہ خود اپنی دور رس ترقی کے مفادات اور سرمایہ دارانہ راہ کی ترقی کی راہ کھوٹی کرنے کا مادہ و صلاحیت رکھتے ہیں انھیں عالمی سرمائے کے ترجمان محبوب الحق کی ضرورت ہے جو سرمایہ دارانہ راہ کی عمومی اٹھان اور پاکستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر ان مختلف سرماؤں کی حرص و ہوس کی ممکنہ حد تک تسکین کرتے ہوئے ملکی وسائل میں ان کے حصّہ بٹوارہ کا نسخہ تجویز کرے اور ان نسخوں کے نفاذ کے لیے ایک ایسی ماورئی مطلق العنان ریاست کی ضرورت ہے جو ان تمام مقامی سرمائوں سے "آزاد" ہو اور پھر عالمی استحصار کی اس سرمایہ دارانہ "شریعت" کا اسلامی "عذر لنگ" پیش کرنے کے لیے ظفر احمد انصاری اور اہل عیال کی بھی ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ

چھپتی ہوتی صداقت یہی ہے کہ زرعی ٹیکس کے معاملے میں نہ چیمبر آف کامرس کے سرمایہ دار اراکین درست ہیں نہ وہ پیٹی بورژوا اشتراکی اور ترقی پسند جو زرعی ٹیکس کے نفاذ کا شور مچا رہے ہیں اور کیا ہم اس یاد دہانی سے اس صداقت کی چبھن بڑھا دینگے کہ محبوب الحق کو کارل مارکس کی تصدیق و توثیق حاصل ہے جس نے سرمایہ دارایت کی ترقی کے قوانین پر بحث کرتے ہوئے زرعی ٹیکس کو رجعتی قدم قرار دیا تھا؟

ضیاء الحق نے اپنی تقریر میں کہا کہ وہ کانٹوں کی کرسی پر بیٹھا ہے بلاشبہ "عالمی سرمائے"، مختلف مقامی سرماؤں اور سرماؤں کے مختلف گروہوں، نیز ماقبل سرمایہ دارانہ جاگیردارانہ اور قبائلی رشتوں، ادنی بورژوازی کی تڑپ اور محنت کش طبقوں اور محنت کش عوام اور ان کے موید روشن خیال دانش وروں کی چومکھی کھینچ تان میں "عالمی" سرمائے کی پروردہ معاشرے سے ماورئی مطلق العنان ریاست کو چلانا کوئی پھولوں کی سیج نہیں ہو سکتی پاکستان کے مختلف

طبقے اور پرتیں اس ماورئی ریاست کو اپنے زیرِ نگیں کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے ان کی مختلف صف بندیوں نے ماضی میں ریاست کو تابع کیا بھی ہے اور وہ پھر اس کو تابع کرنے کے لیے کوشاں ہیں اور رہیں گے۔ انسانی تاریخ کی بدترین مطلق العنان ریاستوں کو معاشرے کی قوتوں کو خراج دینا پڑا ہے۔ اور پاکستانی مطلق العنان ریاست کو بھی یہاں کی معاشرتی قوتوں کو ان کی بھینٹ دینی ہے "بلدیاتی انتخابات" "وزارتیں" "غیر جماعتی انتخابات" اسی نازک ننت کا شاخسانہ ہیں جس کے تحت مطلق العنانیت کو طاقت اپنی مٹھی میں بند بھی رکھنا ہے اور اس مٹھی کو کھولنا بھی ہے "مقامی" سرمایہ بھی اپنی خصلت و وصف کو نہیں چھوڑ سکتا اس نے اس ریاست کو اپنا تابع کرنا ہے لیکن موقع پرستی اس کا مابہ الامتیاز ہے اور اگر وہ مطلق العنانیت کی ماورائیت کو مٹی میں نہیں ملا سکتا تو بھی اس نے اپنی بڑھوار جاری رکھنی ہے، وہ اس سے مل کر چلے گا۔ مطلق العنانیت اقتدار دینے کو تیار نہیں لیکن اُسے سرمائے کو شریک اقتدار کرنا ہوگا۔ سرمایہ بھی اگر ریاست کو تابع نہیں کر سکتا تو وہ شرکت اقتدار کر بھی لے گا۔ "عالمی" سرمائے کی دست و بازو مطلق العنانیت کے ساتھ پاکستانی معاشرتی قوتوں کی تگ و دو، حمایت و تصادم کے اتار چڑھاؤ اور کھینچ تان کی گوناگوں تفاصیل اگر ضبطِ تحریر میں آ بھی سکتیں تو بھی ان کا خلاصہ بھی یہاں ممکن نہیں صرف اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ جو "سرمائے"، اس مطلق العنان ریاست کے ساتھ مل بیٹھے وہ نہال ہوتے، جو متصادم رہے نا شاد رہے اس مطلق العنانیت کی ناقابلِ تسخیر قوت اور بے پناہ فوائد عطا کر سکنے کی صلاحیت کے پیشِ نظر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ متصادم رہنے والے۔ سرمائے بھی اپنی مابہ الامتیاز موقع پرستی کے بموجب جانے کچھ نے مخفی طور پر اس سے ہاتھ ملا لیے اور جو اب تک متصادم رہے وہ بھی تیار بیٹھے ہیں اور ان کی مختلف گفتگوؤں، مختلف موضوعات پر ان کی بے شمار باتوں، محاوروں اور تراکیب لفظی کے عقب سے ایک دبی ہوئی آہ کی تکرار ہمیشہ سنی جا سکتی ہے۔ "ہائے ہم پیچھے رہ گئے"۔ "وہ جو ہمارے سامنے کچھ نہ تھے ہم سے آگے نکل گئے ہمارا مقابلہ کرنے لگے"۔ اب سب کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے اور "عالمی" سرمایہ اور اس کی مطلق العنان چودھراہٹ

شراکت اقتدار کا جو بھی فارمولا پیش کرے گی تمام "سرمائے" اس کو قبول کریں گے۔

آج "قومی" مسئلہ بھی ایک مستحکم و مضبوط مطلق العنان ریاست کے اسی پس منظر میں اٹھتا ہے مختلف قومی تحریکیں اور قوم پرست بھی اسی مطلق العنان ریاست کے تناظر میں "قومی" مسئلہ کو اٹھاتے ہیں اور اس کی نوک پلک درست کرتے ہیں "پاکستانی" سرمایہ تو اس مطلق العنان ریاست سے ہم آہنگ اور ہم وسعت ہے مختلف "قومی" سرمائے بھی اس مطلق العنان ریاست کی ناقابلِ تسخیر حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے معاملہ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ربط ضبط کرتے ہیں، وزارتیں لیتے ہیں وغیرہ وغیرہ ہم نے قومی سرماؤں اور مطلق العنانیت کے اس تعلق کی وضاحت پہلے بھی کی اور اس پر محنت کشوں کے موقف کی نشاندہی کی۔

یہاں ہم ایک اور اہم پہلو کی جانب توجہ مبذول کرائیں گے قوموں کا یہ حق ناقابلِ مصالحت ہے کہ وہاں کے عوام اپنی مرضی کے مطابق اپنی تقدیر کا فیصلہ کریں۔ اور اسی مرضی کے تعین کے لیے ان کی نمائندگی، حق رائے دہی وغیرہ ناقابلِ مصالحت اصول ہیں لیکن "قومی" سرمایہ جب مطلق العنان ریاست کو مفروض کرتے ہوئے، اس کی اٹل ناقابلِ تسخیر قوت کا اعتراف کرتے ہوئے "قومی مسئلہ کو اٹھاتا ہے تو وہ قوموں کے حق خود اختیاری، حق رائے دہی وغیرہ کو مصلحت و مصالحت کا شکار کر دیتا ہے۔ اور عوام کے بنیادی حق "حق نمائندگی" کی ترمیم کر دیتا ہے وہ نمائندگی کے تمام مروّج اور آفاقی تصورات کو نظر انداز کر کے قوموں کے "حق نمائندگی" کو صرف مطلق العنان ریاست کے ریاستی کل پرزوں میں "اپنی قوم" کی تقرریوں تک محدود کر دیتا ہے۔ ان کے نزدیک قوموں کی "نمائندگی" کا صرف ایک مفہوم ہے اس مادری مطلق العنان ریاست کے محیط و بسیط شعبوں اور محکموں میں "ہماری قوم کا کوٹا" یہ ہمہ دم بس ایک ہی دھن میں پھنسے رہتے ہیں کہ فلاں شعبے میں کتنے سندھی ہیں۔ کتنے مہاجر، کتنے پنجابی، وغیرہ وغیرہ۔ فلاں شعبے میں کتنے افسر پختون ہیں، کتنے پنجابی، کتنے مہاجر وغیرہ۔ "پاکستانی" سرمائے اور مختلف "قومی" سرماؤں کے درمیان کھنچاؤ اور تناؤ کا ایک پہلو یہی ہے کہ "پاکستانی" سرمایہ اور "پاکستانی" "قومیت"

اور "پاکستانی" قومیت کے عقب میں مخفی پنجابی (مہاجر پختون) قومیت اس ماوریٰ مطلق العنان ریاست کے کل پرزوں اپنا غلبہ برقرار رکھنا چاہتی ہے جب کہ دیگر "قومی" سرمائے اور "قومی" تحریکیں اس ماوریٰ مطلق العنانیت کے شعبوں میں اپنی "نمائندگی" چاہتی ہیں اس مقصد کے لیے ہر ایک "اپنی آبادی" کو بڑھا چڑھا بیان کرتی ہے اور اس "نمائندگی" کے لیے ان تمام (مبالغوں، تحقیر و تمسخر، جارحیتوں وغیرہ کے حربے استعمال کرتی ہیں جن کو ہم نے پہلے بیان کیا۔ قوموں کی "نمائندگی" کے تصوّر کو ماوریٰ مطلق العنانیت کے کل پرزوں میں "نمائندگی" کے تصوّر تک محدود کرنے کا لازمی مفہوم یہ ہے کہ "پاکستانی" سرمائے سمیت تمام "قومی" سرمائیوں نے اس ماوریٰ مطلق العنانیت کی ماورائیت اور مطلق العنانیت دونوں سے مفاہمت کر لی ہے۔ پاکستان کا محنت کش طبقہ اور پاکستان کے مظلوم محنت کش عوام نہ تو پاکستانی ریاست کی اس "ماورائیت" سے مفاہمت کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی مطلق العنانیت کے سامنے سر تسلیم خم۔ چنانچہ وہ قوموں کے حق اختیاری اور حق علیحدگی کا مطالبہ کرتے وقت "نمائندگی" کے اس محدود تصوّر کو ہمیشہ رد کریں گے اور "نمائندگی" کے اس وسیع اور آفاقی تصوّر کی حمایت کرتے رہیں گے جس کے تحت ریاستی کل پرزے "نمائندہ" حکومت، قوموں کی "نمائندہ" منتخب حکومت کے تابع ہوں گے نہ کہ "عالمی" سرمائے کے۔

قومی تحریکوں کا "نمائندگی" کا محدود تصور ایک اور اعتبار سے فریب دیتا ہے جس طرح تمام سرمائے باہمی تصادم کے باوجود باہمی انضمام و ادغام کی جانب رواں دواں ہیں اسی طرح مطلق العنان ریاستی کل پرزوں میں شامل ہونے والے مختلف قوموں کے یہ "نمائندے" بھی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوتے ہیں۔ یہ سب کے سب ماوریٰ مطلق العنانیت کی امتیازی خصوصیات یعنی مطلق العنانیت اور معاشرے سے ماورائیت کی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں اور "عالمی" سرمائے کی عالمی اشتراکیت کے خلاف کش مکش اور "عالمی" سرمائے کے استحصال کے لیے اقتصادی، سیاسی، تجارتی، ثقافتی بندوبست کے الوٹ جز بن جاتے ہیں پر وہی پیرزادہ

غلام اسحاق، ضیاء الحق، صاحبزادہ یعقوب علی خان، جالی، پاشا کھوڑو، ہارون، رحیم الدین اور دیگر بے شمار سرکاری اہل کار قومی تحریکوں کے "نمائندگی" کے منفرد تصوّر کے مطابق مختلف قوموں کے "اپنے" نمائندے ہیں لیکن "غیروں" کے ایک ماورائی مطلق العنان نظام کا جزِ بن کر انہی کا کام سرانجام دے رہے ہیں اس طرز کی "نمائندگی" سے "قومی" سرمائیوں کا کام تو چل سکتا ہے۔ جو "عالمی سرمائے"، "پاکستانی سرمائے" اور "قومی سرمائیوں" کے ربط و تصادم کے ایک تانے بانے میں گندھے ہوئے ہیں لیکن کسی بھی "قوم" کے محنت کش طبقے اور مظلوم محنت کش عوام کو "نمائندگی" کا یہ محدود تصوّر تسلیم نہیں ہو سکتا وہ خود اس یک سنگ ستون مطلق العنانیت کی ملکیت کو اپنے نمائندوں کے تابع کرنے کے لیے جدوجہد کرتے رہیں گے۔

یہ مطلق العنان ریاست چور دفتری چور عدلیہ پر مبنی ایک چور شاہی بھی ہے۔ اس کے مخصوص شعبے کسٹم، پولیس، انکم ٹیکس، ریونیو وغیرہ خصوصی چوری، رشوتوں، بھتوں، جبری وصولیوں وغیرہ کے اڈے ہیں چونکہ "پاکستانی سرمائے" سمیت تمام سرمائے، سرمائے کے تمام گٹھ جوڑ اور تمام "قومی" سرمائے خود چور بازاری میں پلے بڑھے ہیں، اس لیے یہ اس چور شاہی کے بارے میں کسی قسم کی کراہت محسوس نہیں کرتے اسی پس منظر میں ان کے نزدیک قوموں کی "نمائندگی" کا ایک خصوصی مفہوم یہی ہے کہ ان کی اپنی "قوم" کو مطلق العنانیت کے ان چور محکموں میں "نمائندگی" ملے۔ "پاکستانی" قومیت ان محکموں پر اپنا غلبہ رکھنے پر مصر ہے اور دوسری "قومی تحریکیں" بھی ان میں "نمائندگی" پر اتنی ہی ڈٹی ہوئی ہیں پاکستان کا محنت کش طبقہ اور محنت کش عوام "نمائندگی" کے اس تصوّر کو تسلیم نہیں کر سکتے بالآخر ان تمام رشوتوں، جبری وصولیوں وغیرہ کا بار محنت کش عوام کے کاندھوں پر ہی منتقل ہوتا ہے اس لیے وہ لازماً اس چور شاہی سے نفرت کرتے ہیں اور اس کو جوابدہ کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ اس چور شاہی کی بنیادیں اس ریاست کی مطلق العنانیت اور ماورائیت میں مضمر ہیں اس لیے وہ "نمائندگی" کے مسئلے کو اس انداز میں اٹھانے پر مجبور ہیں کہ یہ مطلق العنانیت معاشرے کے نمائندوں کی تابع ہو اور اس کی

ماورائیت اور مطلق العنانیت ختم ہو وہ قوموں کی "نمائندگی" سے یہ مراد لیتے ہیں کہ ریاست پر قوموں کے نمائندوں کی "بالادستی" ہو۔

اس کے ساتھ ہی ہم قومی سوال پر محنت کشوں کے موقف کی وضاحت کر چکے۔ قومی مسئلہ پر محنت کشوں کا موقف بین الاقوامیت کے اصول پر مبنی ہے جو انسانوں کے درمیان تمام قومی تعصب و تنفر کو رد کرتا ہے اور تمام اقوام کو ایک بین الاقوامی اکائی میں جوڑنے کے لئے کوشاں ہے۔ تاہم اسی اصول کا باوضع و پُر استقامت اطلاق اُسے اس بین الاقوامیت کی تحصیل میں جبر و استحصال پر مبنی اُن طور طریقوں کی پُر زور مخالفت کی جانب راغب بھی کرتا ہے جن پر ماضی کے اُن ماقبل جاگیردارانہ، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ طبقوں کی چھاپ ہے جن کی اساس ہی جبر و استحصال پر قائم ہے۔ وہ قوموں کے پُرامن اشتراک و پُرامن علیحدگی کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔ چونکہ قوموں کے پُرامن اشتراک اور پُرامن علیحدگی میں ہی بین الاقوامیت کے اس آدرش کی تحصیل مخفی ہے جس کا واحد و تنہا شارح محنت کش طبقہ ہی ہے۔ محنت کش طبقہ تاریخ کا واحد طبقہ ہے۔ جو بھرپور مستقیم جمہوریت پر یقین رکھتا ہے اور قوموں کے اشتراک و علیحدگی دونوں کو اسی بھرپور جمہوریت کے اصول کے نقطۂ نگاہ سے وضع دارانہ طور پر برتتے ہوئے، دونوں کو قوموں کی جمہوری رائے سے مشروط کرتا ہے اور ایسے اداروں کے قیام کا طالب ہے جہاں قومیں جمہوری طریق پر، ایک فرد ایک ووٹ کے اصول پر، اپنی آزادانہ مرضی و رائے سے جڑ بھی سکیں، علیحدہ بھی ہو سکیں۔

گرچہ ایک معنی میں ہم قومی مسئلہ پر محنت کش طبقے کے نقطہ نگاہ کی وضاحت کر

چکے اور بات ختم ہوئی تاہم ایک دوسرے معنی میں، دراصل ابہام یہیں پر پیدا ہوتا ہے۔ اس ابہام کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح اس دنیا میں محنت کش طبقے کے علاوہ دیگر طبقے بھی ایسے ہیں جو بین الاقوامیت کرتے ہیں اور اس بین الاقوامیت کو اپنے طبقے کی استحصال و جبر پر مبنی احساس کے عکس میں ڈھالتے ہیں اور جس طرح یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ محنت کش طبقے کی جمہوری بین الاقوامیت کو اس جابر و استحصالی بین الاقوامیت سے ممیز کرتے ہوئے قوموں کے پرامن حق خود ارادی اور پرامن حق علیحدگی کا دفاع کیا جائے اسی طرح اس دنیا میں محنت کش طبقے کے علاوہ دیگر طبقے بھی ہیں جو قوموں کے حقوق و آزادیوں کے مطالبے کرتے ہیں۔ یہ طبقے اپنے اپنے مخصوص مفادات اور اپنے اوصاف کے تناظر میں ہی قوموں کے حقوق و آزادیوں کے مسئلہ کو اٹھاتے ہیں اور اس کو اپنے ہی رنگ میں رنگتے ہیں۔ ہم آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق محنت کشوں کی بین الاقوامیت کو جابر و استحصالی بین الاقوامیت سے ممیز کرنے کے عمل میں ایک ایسے مقام پر آگئے ہیں جہاں اس کا دیگر طبقوں کی قوم پرستی سے خلط ملط ہونے کا امکان ہے۔ نہ صرف امکان نہیں، بلکہ فی الحقیقت ہمارے مخصوص سیاسی حالات میں قومی مسئلہ پر محنت کشوں کے امتیازی بین الاقوامی جمہوری موقف کو اس مسئلہ پر دوسرے طبقات اور ان کی سیاسی صف بندیوں کے موقفوں سے علیحدہ کرنے میں ناکامی ہی اس مسئلہ پر اس انتشار ذہنی کا سبب ہے۔ جس کے باعث پہلے "قومی جدوجہد" اور پھر بعد میں "طبقاتی جدوجہد" جیسے "مرحلہ وار جدوجہد" کے موقع پرستانہ نعروں اور لائحہ ہائے عمل نے نہ صرف محنت کشوں کی طبقاتی جدوجہد کو بلکہ دیگر محنت کش عوام اور ترقی پسند حلقوں کی جمہوری جدوجہد کو بھی خبط کیا ہوا ہے۔ چنانچہ اصل سوال یہ ہے کہ یہ کونسے طبقات ہیں؟ ان کی قوم پرستی کے خصوصی

امتیازی اوصاف کیا ہیں؟ اور ان کے قوم پرستانہ پروگرام کو محنت کشوں کے قومی پروگرام سے کیونکر ممیز کیا جا سکتا ہے؟

یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہم ذیل میں قوم پرستانہ پروگراموں کے ضمن میں ان طبقات کا ذکر دوبارہ کریں گے جن کا ذکر ہم نے بین الاقوامیت کے ضمن میں کیا تھا۔ امرِ واقعہ یہی ہے کہ ہر طبقے کا بیک وقت ایک بین الاقوامی اور ایک قومی پروگرام ہوتا ہے۔ ہر طبقہ بیک وقت ان دونوں کشتیوں میں سوار ہوتا ہے اور مستعدی سے دونوں کے چپو چلاتا رہتا ہے۔ ان طبقات کے ہر دو پروگراموں کے بنیادی خدوخال اور ان کے بین الاقوامی و قومی پروگراموں کے جدلیاتی ربط و تعلق، نیز دوسرے طبقات کے ان ہر دو پروگراموں سے ہر انفرادی طبقے کے دونوں پروگراموں کا تضاد و تعلق ہی وہ پیچیدہ تناظر فراہم کرتے ہیں جس میں محنت کش طبقہ قومی مسئلے پر اپنے خصوصی جمہوری بین الاقوامی موقف کو حقیقت پذیر کرتا ہے۔

قوموں کے حقوق کے پیروکاروں کی صفوں میں قبائلی سردار اور جاگیردار بھی آتے ہیں۔ یہ دونوں بنیادی طور پر فرسودہ کردار ہیں اور قوم پرستی کے کتنے ہی رجعتی پہلوؤں کے جدامجد اور ربانی مبانی یہی ہیں۔ دراصل یہ بنیادی طور پر قوم پرست نہیں ہوتے، اور قوم اور قومی ریاست کے جدید تصوّر سے ان کی آشنائی واجبی سی ہی ہے۔ سماجی اقتصادی اعتبار سے قومیت اور قومی ریاست کا تصور جاگیرداریت اور ماقبل جاگیرداری رشتوں کی قبر پر سرمایہ داریت کی نمو کے ساتھ ابھرا۔ جاگیرداریت اور مطلق العنانیت کی تباہی اور بورژوا جمہوری معاشرے اور ریاست کی نمو سے ہی قومی ریاست اور قوم کے جدید تصورات وابستہ ہیں۔ سندھی قوم، بلوچی قوم، پختون قوم، قبائلی سرداروں اور جاگیرداروں کے لئے بڑی آفاقی اصطلاحات ہیں۔ قبائلی سردار کی فکر قبیلہ تک محدود ہوتی ہے اور جاگیردار کی اپنی جاگیر یا اقلیم کی کانٹوں دار حد بندی

تک ۔ وہ اپنی اصل میں جس قوم پرستی کا شارح ہوتا ہے اس کی مثالیں لاشاری قوم، مگسی قوم، بلیجو، جونیجو وغیرہ ہیں۔ اس قوم پرستی کو جدید قوم پرستی سے ممیز کرنے کے لئے قبائلی، ماقبل جاگیر دارانہ اور جاگیر دارانہ "محدودیت" کی اصطلاح زیادہ پُر معنی اور بلیغ ہے۔ اس قبائلی ماقبل جاگیر دارانہ اور جاگیر دارانہ "محدودیت" کی سماجی و اقتصادی جڑیں خود کفالت پر مبنی فطری معیشت میں مضمر ہیں۔ خود کفیل قبائل اور جاگیریں مستغنی مزاج ہوتی ہیں۔ وہ اپنے کاروبارِ زندگی کو چلانے کے لئے قبیلہ یا جاگیر سے باہر کسی سے نہ لین کرتی ہیں نہ دین۔ ان کے تمام تر معاشی رشتے قبیلہ یا جاگیر کی حدود کے اندر محدود ہوتے ہیں اور ان کا تصور اور سیاست و اقتدار کا تصور بھی اسی حد تک محدود ہوتا ہے۔ " خود کفالت پر مبنی معیشت کے حامل اجتماع کی ریاست قبائلی سردار اور جاگیر دارانہ اقلیم اور جاگیر دار آقا ہوتا ہے، جو بس اپنے قبیلے کے اندر، اپنی جاگیر کے اندر حق خود اختیاری کے لئے کوشاں ہوتا ہے اور اس کی حدود کے اندر معیشت، سیاست، امن عامہ، عدالتیں، ثقافت سب پر بلا شرکت غیرے قبضہ چاہتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی آمد اس جاگیر دارانہ محدودیت کے جوڑ جوڑ کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ زرِ نقد اور نقد آور اجناس اور نقدی رشتے، مبادلے اور خرید و فروخت اور منڈی کی آمد، بڑھتی ہوئی تقسیم کار اور پیداوار میں اختصاص، ریل اور سڑکوں کی تعمیر، صنعتی زراعت، اجرتی مزدوروں کی آمد اور نیم غلاموں کی رہائی، وغیرہ خود کفیل فطری معیشت میں روز افزوں دراڑیں ڈالتے ہوئے سرمایہ دارانہ زراعت کو فروغ دیتے ہیں۔ نیز فرمائشوں پر سازوسامان تیار کرنے والے چھوٹے دستکار اور ہنرمند بھی بڑے پیمانے کی پیداوار کے لئے جگہ چھوڑتے ہیں اور اطراف میں قصبوں اور شہروں میں صنعتیں اور بڑھتی ہوئی منڈیاں بھی اثر انداز

ہوتی ہیں۔ اور یوں مختلف جگہوں پر مختلف حد تک قبائلی اور جاگیردارانہ محدودیت کی بنیادیں بہہ جاتی ہیں۔ سماجی و اقتصادی اعتبار سے جاگیرداروں کی خود کفالت کے خاتمے اور وسیع تر پیمانے پر لین دین اور مبادلۂ اشیاء یعنی منڈی کے لئے پیداوار کا یہی وقفہ وہ وقفہ ہے جس میں قومی ریاست کی تڑپ اٹھتی ہے۔ اور قبائلی و جاگیردارانہ معاشرہ قوم پرستی کی جانب مائل ہوتا ہے

اگرچہ قوم پرستی اور قومی ریاست کی جانب یہ رغبت جاگیردارانہ اور قبائلی "محدودیت" کے ماضی کے نقطۂ نگاہ سے ایک بڑی پیش قدمی کے مترادف ہے تاہم جاگیردارانہ اور قبائلی "محدودیت" میں رچے لیسے یہ حلقے سرمایہ دارانہ قوم پرستی کی عبوری اساس سے ناآشنا، اس بات سے ناواقف کہ سرمایہ دارانہ قوم پرستی ایک عبوری وقفہ ہے اور سرمایہ داریت تیزی سے ترقی کرتی ہوئی بین الاقوامی سرمایہ دار اور بین الاقوامی محنت کش طبقوں کو جنم دے رہی ہے قوم پرستانہ نعروں پر اپنے ماضی کی "قبائلی اور جاگیردارانہ محدودیت کی چھاپ لگانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ قوم پرستی کی تحریکوں پر بیشتر تنگ نظر متعصب نعروں اور تصورات کا منبع و سرچشمہ یہی جاگیردارانہ اور قبائلی محدودیت ہے۔ یہ آگے بڑھتے ہوئے بھی بلکہ کشاں کشاں آگے کھنچتے ہوئے بھی پیچھے کی جانب دیکھتی جاتی ہے۔ وہ ماضی کی روحوں سے فیضان حاصل کرتے ہوئے آگے کھسکتی ہے۔

محنت کشوں کی بین الاقوامیت کے علمبرداروں کو قوموں کے حق خود ارادی یا حق علیحدگی کی وکالت کرتے وقت قومیتوں کے حقوق کے ایک اور علمبردار پیٹی بورژوا طبقے کو بھی نظر سے محو نہیں کرنا چاہیئے۔ پیٹی بورژوا طبقے کی اس قوم پرستی کی اقتصادی بنیادیں چھوٹے پیمانے کی پیداوار میں ہیں۔ چھوٹے پیمانے پر پیداوار کرنے والا شخص کسی محلے یا گلی میں بیٹھا آس پاس کے محلے یا گلیوں سے آرڈر لے کر چھوٹے پیمانے کی

پیداوار کرتا ہے، یا محلّے یا بازار میں دکان لگا کر خوردہ فروشی کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی کل معیشت کا انحصار چھوٹی موٹی لین دین پر ہوتا ہے۔ اپنی محدود منڈی اور گراہکوں کے علاوہ اسے کسی سے سروکار نہیں ہوتا۔ اپنی اسی محدود معیشت کے باعث یہ ہر طرز کی تنگ نظری کو قبول کرنے کا مادہ رکھتا ہے۔ شہر اور قصبے لازمی طور پر مختلف قومیتوں کے لوگوں کی آماجگاہ ہوتے ہیں جو لازمی طور پر اس کے مقابل انہی اقسام کے کاموں پر لگتے ہیں اور اسی محدود منڈی میں اس سے مسابقت کرتے ہیں۔ ان کی مسابقت کو ختم کرنے یا منڈی میں اپنے حریفوں کو شکست دینے کے لئے تنگ نظر قوم پرستی اس کو بہترین ہتھیار کا کام دیتی ہے اور وہ اس ہتھیار کو پورے خشوع و خضوع سے اٹھا لیتا ہے۔ نیز بورژوا طبقے اور بڑے سرمائے کے تجاوزات کے نتیجے میں اس کی معیشت بڑے جوکھم میں بھی ہوتی ہے۔ ان معاشی تھپیڑوں اور ہمہ دم لاحق خدشات کے پیش نظر پیٹی بورژوازی زود رنج بھی ہوتی ہے اور رحم علی النفس میں مبتلا رہتی ہے۔ خود پر ترس کھاتی رہتی ہے اور اس کا یہ ایمان ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ مظلوم کوئی نہیں۔ اور اسی زود رنجی اور خود ترسی کے باعث یہ طبقہ سب سے زیادہ متلوّن مزاج اور متشدد ہوتا ہے۔ پورا پیٹی بورژوا طبقہ، جس میں داخلوں کے کوٹے پر لڑتے ہوئے طالبعلم، سرکاری اور نجی ملازمتوں کے حصول اور ملازمتوں میں ترقی و تبادلے کے لئے چشمک کرتے ہوئے کلرک اور چھوٹے افسر، چھوٹے پیمانے کی پیداوار کرنے والے اور چھوٹے تاجر، محلّے کا مولوی وغیرہ شامل ہیں؛ اسی تنگ نظر قوم پرستی کا شارح ہے، اور قوم پرست تحریکوں کے سب سے متشدد دستے فراہم کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ یہ طبقہ ہی ہمارے ملک میں علوم و فنون کا محرم بھی ہے اس لئے ہر قومیت کی خود پرستی اور خود پنداری کے استعارے اور محاورے، ہر قوم میں غرور بے جا پیدا کرنے کے لئے اس کے کارہائے نمایاں کی تکبیر و تکثیر، اور دوسری اقوام کے استخفاف اور تمسخر و تحقیر کے لئے ان کے

اوصاف کی ضابطہ بندی بھی اسی طبقہ کے زیر اثر ہوئی ہے۔ متعصب قوم پرستانہ لغویات کے اضعاف میں سماجی پرت ہی پیش پیش رہتا ہے۔

تاہم قبائلی اور جاگیردارانہ محدودیت اور پرشور پیٹی بورژوا تنگ نظری دونوں ہی سرمایہ دارانہ قوم پرستی کے دائرہ کار میں متحرک ہوتی ہیں۔ اور سرمایہ داریت کے حرکی قوانین سے تجاوز نہیں کر سکتیں۔ چنانچہ ان قوانین کی دریافت ہی قومی مسئلہ پر محنت کشوں کے موقف کی ضابطہ بندی میں معاونت کر سکتی ہے۔ یہ بات غیر متنازعہ فیہ ہے کہ پوری دنیا میں قومی ریاستوں کا قیام اور قومی بنیادوں پر ریاستوں کی ٹوٹ پھوٹ سرمایہ داریت کی آمد کے ساتھ ساتھ ہوئی۔ اس سرمایہ دارانہ قوم پرستی کی سماجی اقتصادی بنیادیں کم از کم ایک منڈی پر سرمایہ دار کے بلا شرکت غیرے قبضے اور "اپنی" قوم کے محنت کشوں کی محنت پر بلا شرکت غیرے استحصال کا حق قائم کرنے پر مبنی ہیں۔

یہ قوم پرستی استحصالی قوم پرستی ہے۔ اس قوم پرستی کی بنیاد ہی محنت کش کا استحصال ہے۔ نتیجے کے طور پر یہ محنت کش کے مفادات کے منافی ہے اور سرمایہ دار قوم پرست شعوری طور پر قوم پرستانہ پروگرام کی تشکیل اس انداز میں کرتا ہے کہ سرمائے کے استحصال کے خلاف محنت کشوں کی جدوجہد کمزور رہے۔

واضح رہے کہ سرمایہ دارانہ قوم پرستی اپنی ابتدا سے ہی کچھ ترقی پسند اوصاف کی حامل ہوتی ہے۔ ایک منڈی پر اپنا تسلط جمانے اور "اپنی" ایک قوم کے محنت کشوں کا بلا شرکت غیرے استحصال کرنے کی کوشش میں سرمایہ دار قوم کے بڑے حلقوں کو متحرک کرتا ہے اور ان کو قومی جبر سے نجات دلانے کے لئے آمادہ جدوجہد کرتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ اسی وقت جاگیردارانہ نظام کے خلاف بھی برسرپیکار ہوتا ہے بلکہ وہ ان مقاصد کے حصول کے لئے کسی ایک یا ایک سے زائد جاگیروں کی حدود سے کہیں وسیع تر "ہم قوم" عوام کو یکجا و ہم آہنگ کر کے انہیں جدوجہد کے لئے کمربستہ کر رہا ہوتا ہے۔

چنانچہ نہ صرف اس کا اقتصادی بندوبست (منڈی وغیرہ) جاگیر دارانہ خود کفیل معیشت میں مداخلت کر رہا ہوتا ہے۔ اور قصبوں شہروں کی شکل میں جاگیر دارانہ اقلیم میں ایسے خود مختار علاقوں کو جنم دے رہا ہوتا ہے جنہیں جاگیر دار شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے بلکہ جاگیر دار سرمایہ دارانہ قوم پرستی کے سیاسی اثر کو بھی رقابت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کو اپنے "بندوں" پر اپنے سیاسی اثر کی تخفیف کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اس کی مزاحمت بھی کرتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک میں بھی قوم پرست تحریکوں کو قبائلی سرداروں اور "وڈیروں" سے لازمی طور پر مزاحمت ملتی ہے۔ چونکہ قوم پرستی بہر حال جاگیر دارانہ اقلیم سے کہیں وسیع تر مرکز کو جنم دینے کی سعی کر رہی ہوتی ہے اسلئے وہ لازمی طور پر جاگیر دارانہ اور قبائلی اقلیموں میں دخل در معقولات کر کے ان کی رعایا کو اقلیم سے باہر کسی مرکز سے وابستہ کر رہی ہوتی ہے۔ انہیں سیاسی اعتبار سے وسیع النظر کر رہی ہوتی ہے۔ جاگیر دارانہ نظام کے معاشی بندوبست کے علاوہ اس کے سماجی بندھنوں اور سیاسی کل پرزوں کو پسپا کرنے کا وصف ہی انسانی تاریخ کے ارتقاء میں سرمایہ داریت کا ترقی پسندانہ پہلو ہے۔ تاہم یہ بات بھی مدنظر رہے کہ چونکہ سرمایہ دار طبقہ ایک قوم "اپنی قوم" کے محنت کشوں کا بلا شرکت غیرے استحصال چاہتا ہے اور اس منڈی پر تمام دیگر سرمایہ داروں کے داخلے کو ممنوع کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے اس مقصد کی تحصیل کے لئے "غیر اقوام" کے داخلے کو روکنے کے لئے اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ "اپنی" قوم کے تمام طبقات، گروہوں و پرتوں کو اپنے عقب میں یکجا و متحد کرے۔ چنانچہ عین اس وقت جب وہ جاگیر دارانہ محدودیت میں مضمر اور جاگیر دارانہ محدودیت سے پھوٹنے والے تعصبات و توہمات، عقائد و نظریات، اقتدار و معیارات کو سہلاتا بھی ہے۔ نیز وہ زمیندار بھی اپنی کمر پر از کار رفتہ "محدود" جاگیر دارانہ نظریات و تعصبات کا بوجھ لادے کشاں کشاں سرمایہ دارانہ قوم پرستی کی صفوں میں داخل ہوتے ہیں جو آہستہ آہستہ

جاگیردارانہ خود کفالت پر مبنی فطری معیشت سے نکل کر اشیائے خرید و فروخت کی پیداوار میں آنے کے باعث اور دیگر سرمایہ دارانہ اثرات کے زیر اثر" جاگیردارانہ اقلیم" سے وسیع تر اجتماعی اکائیوں کے متلاشی ہوتے ہیں۔ یہ بھی یقیناً سرمایہ دارانہ قوم پرستی پر اپنے محدود نظریات اور عصبیتوں کے رنگ چھوڑتے ہیں اور یہی وہ تقاضے اور عوامل ہیں جو سرمایہ دارانہ قوم پرستی کو اس کے رجعتی اوصاف سے مزین کرتے ہیں۔

تمام سرمایہ دارانہ قوم پرستی کا ارتقا انہی ترقی پسندانہ اور رجعتی پہلوؤں اور اوصاف کی کشاکش میں ہی پروان چڑھتا ہے۔ سرمایہ دارانہ قوم پرستی اپنی ابتدائی مراحل سے ہی ان دونوں پہلوؤں کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اور محنت کش طبقہ سرمایہ دارانہ قوم پرستی کے ان دو پہلوؤں کے تصادم کے محرکی قوانین کے ضمن میں ہی اور مستقبل میں ان کی ترقی و ارتقاء کی سمت کے بارے میں علمی قیافوں کی روشنی میں "قومی مسئلہ" پر اپنے موقف کو صورت پذیر کرتا ہے۔ صرف موقع پرست ہی، صرف وہ موقع پرست ہی جو پہلے ہی سے متعصب قوم پرستی میں شرابور ہیں، سرمایہ داریت کے ترقی پسندانہ پہلوؤں کو نظر انداز کر کے اور ——————— اس کے ترقی پسندانہ اور رجعتی اوصاف کی کشاکش اور باہمی ربط کی کلیت کو سمجھے بغیر صرف اس کے رجعتی اوصاف اور ان رجعتی نعروں کی بنیاد پر جن کی ٹکلیاں وہ اپنے آپ پر چسپاں کر کے جاگیردارانہ محدودیت کو اپنے ساتھ لگانے کے لئے کوشاں ہوتی ہے" قوم پرستانہ اشتراکیت" اور "قومی جدوجہد کی اولیت" کے نعروں تلے محنت کشوں کی بین الاقوامی تحریک اور کل ریاستی بنیادوں پر ان کی صف بندی کے امکانات اور کوششوں پر "دکان بند" کا بورڈ

لگا کر کسی بڑے شامیانے میں شامل ہو کر پرائی شادی پر عبداللہ دیوانہ کے مصداق انقلابی ہل چل میں بے مصرف مصروف ہو سکتے ہیں۔

مارکسی فکر میں یہ امر بھی غیر متنازعہ فیہ ہے کہ سماجی و اقتصادی ترقی وارتقا کے دوسرے مرحلے میں سرمایہ بین الاقوامی ہو جاتا ہے۔ بین الاقوامی منڈی تشکیل ہو جاتی ہے، بین الاقوامی رسد ورسائل اور بحری و بری و فضائی آمدورفت کے ذرائع ترقی پاتے ہیں۔ اقوام کے درمیان ہمہ گیر اقتصادی، سماجی و ثقافتی ربط ضبط کا عمل روز افزوں تیز ہوتا ہوا انتہائی شدت اختیار کر لیتا ہے، اقوام کے درمیان قائم مادی و روحانی تمام "جنگی ناکے" ٹوٹتے ہیں۔ پوری کی پوری آبادیاں ایسے عظیم ام البلد اور جگ دیسی شہروں میں مجتمع ہوتی ہیں جہاں "اقوام" ایک ہاون دستے میں کٹ کر، ایک گداز ندہ میں مختلف دھاتوں کی مانند پگھل کر اپنی انفرادیت کھو دیتی ہیں۔ اور پوری آبادی بین الاقوامی سطح پر متحدو یکجا سرمائے اور سرمایہ دار طبقے اور بین الاقوامی محنت اور محنت کش طبقے کی صورت میں ایک دوسرے کے سامنے اس تصادم کے لئے صف آرا ہونے لگتی ہے جو سرمایہ داریت اور سرمایہ دار طبقے کا روز قیامت ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی وارتقاء کا اندرونی لازمی جبری قانون یہی ہے کہ وہ قوموں کے تشخص اور انفراد کی تباہی کا رجحن پڑھتے ہوئے مسلسل معاشرے کے وسیع تر اقتصادی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی الغرض تمام مادی و روحانی گوشوں اور حلقوں کو اپنی گرداب میں گھسیٹتے ہوئے اور تمام اقوام کو بلا استثناء اپنی بھنور کی لپیٹ میں لیتے ہوئے، نیز ہر شامل اور نئے شامل ہونے والے گوشے اور حلقے میں سرمایہ داریت کے نفوذ کو گہرا کرتے ہوئے دیوانہ وار، ایسے کہ جیسے اسے اس کی موت کی روحیں طلب کر رہی ہوں، ایک ایسے معاشرے کی صورت گری کرتا جائے جہاں صرف بین الاقوامی سرمایہ، بین الاقوامی محنت کے مقابل ہوگا۔

سرمایہ داریت کی یہ سمت، اس کی اٹھان اور پرواز کا یہ خط مستدیر اور اس کی

یہ منزل ہی قومی مسئلہ پر سرمایہ دارانہ نظام کی ترقی پسندانہ ماہیت کی آئینہ دار ہے اور محنت کش طبقہ سرمایہ داریت کے اس وصف سے الجھنے کے بجائے اس کو خوش آمدید کہتا ہے۔ چونکہ محنت کش طبقے کے علمی نظریے کا شعور رکھنے والے محنت کش کو معلوم ہے کہ یہی عمل وہ عمل ہے جس کے ذریعے محنت کش طبقہ اپنی اجتماعیت کی تحصیل و تکمیل کر کے اپنے عروج کو چھوتا ہے اسلیے وہ کسی ایسے رویے کا متحمل نہیں ہو سکتا جو خود اس کی اپنی بڑھوار تھامنے کا باعث ہو۔ صرف سرمایہ ہی مرتکز و متحد نہیں ہوتا بلکہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت منتشر اور خود کفیل یا نیم خود کفیل اکائیوں میں بکھری ہوئی محنت بھی مجتمع ہوتی ہے۔

اور وہ بنیادی شرائط پیش پیدا ہوتی ہیں جن کے تناظر میں محنت کش طبقہ خود آگاہ و خود بین ہو۔ صرف سرمایہ ہی تمام چنگی ناکوں، مالیاتی قواعد و ضوابط، تبادلۂ زر کی پابندیوں، کروڑگیری ممانعتوں، اور درآمد و برآمد کے قوانین کو توڑتا ہوا بین الاقوامی نہیں ہوتا بلکہ اسی عمل میں خود محنت کش کی بین الاقوامیت بھی مضمر ہوتی ہے۔ وہ بھی تبدیلیٔ وطن، پاسپورٹ ویزا کی تمام بندشوں، قیود اور تکلفات کو برطرف کر کے اور ہزار ہا سال کے زمین کے غلامانہ اور نیم غلامانہ رشتوں حتیٰ کہ خاندانی رشتوں کو توڑ کر، سمندروں اور براعظموں کو پھلانگتا محنت کی بین الاقوامی اجتماعیت کی جانب رواں دواں ہوتا ہے۔

ہمہ گیر بین الاقوامیت سرمایہ داریت کا آفاقی قانون اور آفاقی منزل ہے۔ تاہم منزل، کا یہ استعارہ غلط اور گمراہ کن ہے۔ بین الاقوامیت کوئی جغرافیائی مقام نہیں کہ یکایک ایک دن ہم وہاں پہنچ جائیں گے اور پھر وہاں کے اپنے ماحولیاتی فطری متعلق بہ آب و ہوا اور سماجی حالات و قوانین ہوں گے۔ اور جب تک ہم وہاں نہ پہنچیں جب تک سرمایہ داریت اس مقام تک نہ پہنچ جائے اس کی بات فضول ہے۔ نہیں ہم معاشرتی تبدیلیوں کے شعبہ میں گفتگو کر رہے ہیں۔ یہاں اگر سرمایہ داریت ہمہ گیر بین الاقوامیت کی جانب رواں دواں ہے تو ہر اٹھنے والا قدم، سرمایہ دارانہ نظام کے

تحت اٹھنے والے گوناگوں اقدامات کی کل مجموعی تاثیر اسی بین الاقوامیت کو وسیع تر اور عمیق تر کر رہی ہوگی ۔ اس شعبہ میں جو بالآخر ہوگا وہ ہر لحظہ ہو رہا ہوتا ہے ۔ چنانچہ سرمایہ دارانہ نظام صرف اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ کر ہی بین الاقوامیت کی تحصیل نہیں کرتا، بلکہ اپنی ترقی و نشوونما کے ہر مرحلے پر بین الاقوامیت کو حقیقت پذیر کر رہا ہوتا ہے ۔ وہ ہمہ دم تمام محدودیت پسند، فرقہ وارانہ معاشرتی اور ثقافتی قوتوں سے دست و گریباں ہوتا ہے، اور انہیں مسلسل پسپا کرتا رہتا ہے ۔

سرمایہ دارانہ بین الاقوامیت ایک مسلم ترقی پسندانہ وصف ہے ۔ تاہم سرمایہ دار طبقہ اپنے اس وصف کو اپنے بنیادی وصف یعنی استحصال اور قدر زائد اور زیادہ سے زیادہ قدر زائد کی کشید کے ضمن میں ہی حقیقت پذیر کر سکتا ہے ۔ دراصل قدر زائد کی تحصیل سرمایہ داریت کا بنیادی حرکی قانون ہے ۔ اور بین الاقوامیت کی تحصیل اس بنیادی حرکی قانون کے ایک لازمی لاحقہ کے سوا کچھ نہیں ۔ نتیجے کے طور پر سرمایہ دار اس بین الاقوامیت کو جس انداز میں روبہ حقیقت کرتا ہے وہ بین الاقوامیت کی عمومی ترقی پسندانہ ماہیت سے لگا نہیں کھاتی ۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے کہ سرمایہ دارانہ بین الاقوامیت دوسری اقوام کے استحصال اور ، ، جبر پر مبنی ہوتی ہے ۔ چنانچہ ترقی یافتہ سرمایہ داریت نے نوآبادیات اور استعماریت کی شکل میں بین الاقوامیت کی تحصیل کی ۔ اور اس کی یہ شکل وصورت قوموں کی اس ترقی پسندانہ خواہش سے متصادم تھی جس کے تحت وہ ایک دوسرے کے ساتھ گہرے سے گہرے تر روابط قائم کرنے کے خواہاں ہیں ۔

محنت کش طبقے کے سامنے کوئی بھی ٹھوس حقیقی "قومی مسئلہ" ہمیشہ ہی اس سرمایہ دارانہ استحصالی بین الاقوامیت کی صورت میں پیش ہوتا ہے ۔ یعنی وہ ایسی بین الاقوامیت کی صورت میں سامنے آتا ہے جو خود تو استحصالی ہوتی ہے لیکن جو لوگوں کو قریب لا کر اور ان کی دوریاں ختم کر کے ان کے درمیان مفادات کے عدم تصادم پر مبنی روابط کے قیام کے لئے راہیں ہموار کرتی ہے ۔ محنت کش طبقہ جو بین الاقوامیت

پر یقین رکھتا ہے اس استحصالی بین الاقوامیت کے دباؤ تلے بین الاقوامیت کے اصول کو ہی رد نہیں کر سکتا اور نہ ہی وہ ان فرائض سے روگردانی کر سکتا ہے جو اس حقیقی بااصول بین الاقوامیت کی تحصیل کے لئے اُس پر عائد ہوتے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ محنت کش طبقہ ہی بین الاقوامیت کا کھرا اور سچا علمبردار ہے۔ اُس کا اقتدار ہی مختلف اقوام کے لوگوں کے مابین مفادات کے تصادم سے پاک بین الاقوامی روابط کی ترویج کر سکتا ہے۔ اس لئے وہ ان موقع پرستوں کے خلاف راست جدوجہد کرتا ہے جو سرمایہ داریت کی استحصالی بین الاقوامیت کے دونوں اوصاف کے جدلیاتی لازم و ملزوم ربط و تصادم کو سمجھے بغیر خود محنت کش طبقے کے بین الاقوامی اتحاد کو توڑنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

استحصال سرمایہ داریت کا لازمی وصف ہے۔ سرمایہ دار قدر زائد اور زیادہ سے زیادہ قدر زائد ہتھیانے کی حرص و ہوس میں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ چشمک کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑنے کے لئے کوئی ہتھکنڈہ ایسا نہیں جو وہ نہ آزماتے ہوں۔ بلیک میل، غنڈہ گردی، دھوکہ دہی، فراڈ، ایک دوسرے کے کاروباروں کو نذر آتش کرنا، قتل وہ کونسا ہتھکنڈہ ہے جو وہ ایک دوسرے پر نہ آزماتے ہوں۔ سبقت لے جانے کے لئے وہ باہمی گٹھ جوڑ بھی بناتے ہیں۔ اس گٹھ جوڑ کے لئے ہر قسم کی وابستگیاں جو انہیں اپنے معاشرہ کے مخصوص ٹھوس تاریخی حالات سے میسّر ہوں اُن کو وہ بروئے کار لاتے ہیں؛ میمن گجراتی، آغاخانی، کاٹھیاواڑی، دہلی سوداگر، چنیوٹی، شیعہ، سنّی، تبلیغی جماعت، مہاجر، پنجابی، پٹھان، سندھی، بلوچی، پاکستانی قومیت، مسلم قومیت وغیرہ۔

سرمایہ دار کے ابتدائی پیش رووں کے مختلف گروہ دوسروں کے خلاف اپنے مفادات کو سبقت دلانے کے لئے میمن، گجراتی، چنیوٹی، دہلی سوداگر جیسی روایتی اجتماعی اکائیوں کے تمام افراد کو گرماتے تھے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ کسی حد تک آج بھی سرمایہ داران اقسام کی برادریوں کو اکٹھا رکھتے ہوئے بقیہ آبادی سے کاٹ کر رکھتے ہیں۔ زچہ خانے سے لے کر مردہ خانے تک ان کے مدرسے، رہائشی جگہوں، اسپتال، کلب، دکانوں مساجد سب کو علیحدہ کر کے عین

جگ دیسی شہروں میں مسدود محلّے اور معاشرتی طور پر کٹی ہوئی بستیاں بناتے ہیں۔ ان اجتماعی اکائیوں کے بل پر طرح طرح کی چالبازیاں کرتے ہیں اور اپنے ہاتھ دکھاتے ہیں۔ اور فری میسن قسم کے خفیہ خاموش سمجھوتوں کے بل پر اپنے مقابل سرمایہ داروں کو شکست دینے کے درپئے رہتے ہیں۔ تاہم اس قسم کی خفیہ و نیم خفیہ تجارتی برادریاں اپنی ماہیت میں ... بل سرمایہ دارانہ ہیں گرچہ ان کے فاضل باقیات بے ضرورت دیر تک باقی رہ سکتے ہیں۔ یہ برادریاں دراصل معاندانہ جاگیردارانہ معاشرے میں سرمایہ داریت کے ابتدائی تخموں کو محفوظ رکھنے اور سہنے کا کام سرانجام دیتی ہیں۔ جدید سرمایہ داریت کے بڑے مہم جو کو وسیع تر اجتماعی اکائی "قوم" ضرورت ہے۔

بلاشبہ سرمایوں کی باہمی کشمکش کو نمٹانے کے لئے "قوم" سرمایہ دار کا سب سے بڑا اور مؤثر سیاسی ہتھیار ہے۔ چونکہ قوم وہ اجتماعی اکائی ہے جسمیں جان ڈال کر ارتعاش پیدا ہی اس نے کیا ہوتا ہے۔ قوم کے اوپر کوئی پرانا جاگیردارانہ سماج اور اس کے فرسودہ نظریوں کے کابوس سوار نہیں ہوتے جو اس کی راہ میں آڑے آئیں اور "اپنی قوم" ہی وہ اجتماعی اکائی ہے جس سے سرمایہ دار "اپنا" مفاد خلط ملط کر کے اپنے مفاد کو بیک وقت بڑھا بھی سکتا ہے اور اس کا ارتفاع کرنے کے علاوہ اس کی تصعید بھی کر سکتا ہے۔

سرمایہ دارانہ استحصالی بین الاقوامیت اور اس کی ہم پلّہ سرمایہ دارانہ استحصالی قوم پرستی کے جدلیاتی ربط و تناؤ کے احاطے کی انہی حدود کے اندر پاکستانی قوم اور دیگر قومیتوں کے ربط ضبط کی بظاہر ناقابل فہم منطق کا مدّوجزر عین منطقی ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ بین الاقوامیت اور سرمایہ دارانہ قوم پرستی کے ربط کا یہ علمی نظریہ ہی وہ نظری ڈھانچہ فراہم کرتا ہے جس میں ہم "پاکستانی قوم" کے شارحین اور دیگر "قومیتوں" کے شارحین کے اُن روّیوں کی فہم حاصل کر سکتے ہیں جس کے تحت وہ ایک لمحے ایک دوسرے پر انتہائی جارحانہ حملے کرتے نظر آتے ہیں، ایک دوسرے کے خلاف آگ و

خون اگل رہے ہوتے ہیں، لیکن دوسرے لمحے ایک دوسرے کے "پاؤں چھوتے" اور ایک دوسرے کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ ایک لمحہ ایک دوسرے کا بالکل الٹ اور مکمل تضاد نظر آتے ہیں، اور دوسرے لمحہ ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی شیر و شکر نظر آتے ہیں۔

ہم نے ابھی تک سرمایہ دارانہ قوم پرستی اور سرمایہ دارانہ بین الاقوامیت کی اساس کو علیحدہ علیحدہ سمجھا ہے آئیے ان کے اندرونی لازمی ربط و تعلق کو سمجھیں۔ سرمایہ دارانہ قوم پرستی کسی ایک قوم "اپنی قوم" کی محنت کے استحصال اور وسائل اور منڈی پر سرمایہ دار کے "اپنے" اجارے اور دوسروں کے اخراج کا نام ہے۔ لیکن چونکہ سرمایہ بڑھتا ہے اور وسیع تر منڈی، وسائل اور محنت کے استحصال کا متلاشی ہوتا ہے اس لئے اسی قوم پرستی کا لازمی اور ناگزیر تقاضا ہے کہ سرمایہ دار "اپنی قوم" کا نام روشن کرنے کے لئے، اس کی عظمتوں کو چار چاند لگانے کے لئے، دوسری اقوام کی محنت وسائل اور منڈی کو اپنے زیر استحصال لائے یعنی مخصوص اوصاف کی حامل سرمایہ دارانہ بین الاقوامیت پر عمل پیرا ہو۔ اور "اپنی قوم" کے مفادات کو بیان کرنے میں مبالغہ اور جارحیت سے کام لے۔ اور چونکہ سرمایہ مسلسل اپنے استحصال کے دائرے کو وسیع تر کرنے اور دوسری اقوام کی محنت اور منڈی اور وسائل کو اپنے زیر تصرف لانے کا خواہاں ہوتا ہے اسی لئے "اپنی قوم" کے مفادات کے بیان میں وہ جس قدر زیادہ مبالغہ کرے گا، دوسری اقوام کے تمسخر، اُن کی تذلیل و تحقیر میں جتنا آگے بڑھتا جائے گا اسی قدر "قوم پرست" کی اسناد زیادہ مصدقہ ہوتی جائیں گی۔ قوم پرستانہ جارحیت اور اس "اپنی قوم" کے مفادات کے بیان میں، جس کے ساتھ سرمائے نے اپنے مفاد کو "خلط ملط" کر لیا ہے، مبالغے کی مادی بنیادیں سرمائے کی اس خواہش میں ہی مضمر ہیں کہ وہ اپنا دائرہ استحصال مسلسل بڑھاتا جائے۔ سرمایہ دارانہ استحصالی بین الاقوامیت، سرمایہ دارانہ استحصالی قوم پرستی کا لازمی وصف ہے۔ "قومی مسئلہ" ہمیشہ اس استحصالی قوم پرستی اور استحصالی بین الاقوامیت

کی کشمکش کا شاخسانہ ہوتا ہے۔ ایک سرمایہ "اپنی" قوم کی منڈی پر اجارہ کا خواہشمند ہوتا ہے، اور چونکہ اس کی صفت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے استحصال کا دائرہ بڑھائے اس لئے وہ دوسروں کا استحصال کرنے کا آرزومند ہوتا ہے، دوسرے مزاحمت کرتے ہیں اور یوں "قومی" مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

پاکستانی ریاست کے سیاق میں "پاکستانی قومیت" اور اس سے بھی کہیں اعلیٰ وارفع "مسلم قومیت" "کثیر القومی" پاکستان کی حدود میں بین الاقوامیت پر نظریاتی غلاف اوڑھانے کا ایک فکری حربہ ہے۔ پاکستانی قومیت کا نظریہ "بین الاقوامی قومیت" کے ایک ایسے نظریے کے بطور پیش کیا جاتا ہے جو پاکستان میں مختلف قومیتوں کی نفی کرتا ہے اور ان سے متضاد و متصادم ہے۔ لیکن اس کا یہ ظاہر کھلا دھوکہ دیتا ہے۔ "پاکستانی قومیت" کا نظریہ فی الحقیقت خود اپنی ایک "قومیت" (یا قومیتیں) رکھتا ہے اور فی الحقیقت اس ایک قومیت (یا قومیتوں) کی استحصالی بین الاقوامیت کا ارتفاع کرتا ہے۔ ہر سرمایہ اور سرمایہ داروں کا ہر گروہ بالالتزام محنت اور اشیاء کی کسی ایک منڈی میں سرگرم ہوتا ہے اور اس منڈی کی وسعت اور تاریخی سماجی و اقتصادی عوامل کی کلیت کے پیش نظر ایک "اپنی قوم" کے مفادات کو اپنے استحصالی مفادات سے خلط ملط کر کے اس منڈی پر اپنے اجارے کو مستحکم کرنے کا بندوبست کرتا ہے لیکن سرمائے کی کارفرمائیوں کی حدود اس منڈی سے باہر پھیلتی ہیں۔ اس کو اس ورانیے میں بھی "اپنی قوم" کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اب یہ قوم "عظیم" ہو جاتی ہے۔ یہ عمل تیزی سے پھیلتا ہے۔ اس کی گرداب تیز تر ہوتی ہے۔ اور اپنے پیچھے پیچھے پن پکھ کے بطور ہزارہا اقسام کے بین الاقوامی اقتصادی، پیداواری، تجارتی، سماجی، اقتصادی، علمی و تکنیکی روابط کا جال چھوڑتی جاتی ہے۔ سرمایہ داروں کے دوسرے گروہ اپنی اپنی اقوام کے ڈھال تلے اس مداخلتِ سرمایہ کی مزاحمت کرتے ہیں۔ ان مزاحمتوں کے نتیجے میں اُن کو اپنایا بھی جاتا ہے، دبایا بھی جاتا، ان سے مصالحت بھی کی جاتی ہے، تصفیے بھی ہوتے ہیں۔ تصفیے ٹوٹے

بھی جاتے ہیں۔ کھینچ تان کے اسی عمل کے نتیجے میں قوم پرستانہ تحریکیں تیز ہوتی ہیں۔

کسی ایک یا ایک سے زائد سرمائے کی گرداب کی وسعت اور گھماؤ مزید تیز تر ہوتا ہے۔ اُس کی مزاحمتیں بڑھتی ہیں۔ اسی مسلسل بڑھتے ہوئے احاطے اور شدّت کے ایک مرحلے پر جب اس سرمائے کی راہ میں دیگر قومی سرماؤں کی مزاحمتیں تیز تر ہو جائیں اور دوسری اقوام میں اس سرمائے نے داخل ہو کر تضادات کو اتنا تیز کر دیا ہو کہ خود اس کے اپنے لئے سنگین حالات پیدا ہو گئے ہوں تو اسے "اپنی قوم کی" "مستعد و توانا" حمایت اور سرگرمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر بین الاقوامی سطح پر کار فرما اس سرمائے کی "قوم" مافوق البشر خصوصیات اور اعلیٰ اوصاف کی حامل ہو کر ممتاز ہو جاتی ہے۔ وہ "سفید فام برتر نسل" "آریائی برتر نسل"، "جنگجو نسل" یا "مارشل نسل" بن جاتی ہے۔ اس برتر نسل کے نظریے کی مادی ماہیت یہی ہے کہ اب قومی سرمائے کو "اپنی قوم" کی حدود سے باہر اپنے بین الاقوامی استحصال کے لئے "اپنی قوم" کے عوام کی زیادہ مستعد و سرگرم حمایت اور قربانیوں کی ضرورت ہے۔ اب وہ صرف اُن کے پسینے پر قناعت نہیں کر سکتا، اب وہ سرمائے کو ان کے خون سے بھی سیراب کرے گا۔

سرمائے کے پھیلاؤ کے اسی بڑھتے ہوئے عمل کے نقطۂ عروج کے لگ بھگ جب سرمایہ "کئی اقوام" میں مستحکم ہو چکا ہو، اور ان معاشروں کی زندگی کے تمام گوشوں کو ہم بستہ کر چکا ہو، اس کے پیدا کردہ اقتصادی، تجارتی، سماجی وغیرہ بندھن معاشرے کی کل مادی و روحانی زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے چکے ہوں تو اس مرحلے پر وہ "بین الاقوامی قومیت" کی نظریہ سازی کرتا ہے۔ بلاشبہ اس نظریے کے مادی تقاضے اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں جب تمام "قومی سرمائے" باہم مدغم ہو کر ناقابل شناخت ہو جائیں۔

جب کوئی ایک یا ایک سے زائد قومی سرمایہ دوسرے سرمایوں کی اقوام میں اپنے آزادانہ نفوذ اور کارفرمائیوں کو "بین الاقوامی قومیت" کے نظریے کا غلاف اوڑھانے کی کوشش

کرے گا تو یہ نظریہ اس ایک یا ایک سے زائد قومی سرمائے کی استحصالی بین الاقوامیت کی ملمع کاری کے سوا کسی اور حیثیت کا حامل نہیں ہو سکتا اور اس "بین الاقوامی قومیت" کے عقب میں سے اس ایک یا ایک سے زائد قومی سرمائے کی قومیت صاف جھانکتی رہے گی۔ چنانچہ عالمی استعمار کے نو آبادیاتی اور نیم نو آبادیاتی ادوار کے دورانیوں میں جب لبرل بورژوا نے عالمی حکومت، عالمی ثقافت، اور آفاقی انسان کے خواب پرستانہ نظریوں کی تشکیل و تشہیر کی تو یہ عالمی سرمائے کی بین الاقوامی لوٹ مار کو مخفی کرنے کے لئے چند پوپلے ڈھکوسلوں کے سوا کوئی اور حیثیت اختیار نہ کر سکے۔

پاکستانی ریاست کے سیاق میں "بین الاقوامی قومیت" پر مبنی "پاکستانی قومیت" اور "مسلم قومیت" کے دونوں نظریوں اور نعروں کی حیثیت بھی کچھ ایسی ہی ہے اس عظیم تر "پاکستانی قومیت" اور "مسلم قومیت" کی ایک یا چند چھوٹی قومیتیں بھی ہیں۔ جن کے ڈھٹائی سے کھلکھلاتے دانت ان نظریوں اور نعروں کے عقب سے صاف نظر آتے ہیں۔ بلاشبہ ان نعروں اور نظریوں کی نقاب اتنی باریک و نحیف ہے کہ سرمایہ داریت کے ریاستی کل پرزوں کی قومی ساخت میں اس "پاکستانی قومیت" کے نظریے کے عقب میں مخفی "قومیت" یا "قومیتیں" صاف نظر آجاتی ہیں۔ نیز پاکستانی قومیت کے عقب میں نظر آنے والی قومیت یا قومیتوں نے "اپنی قوم" کی تحلیل بھی نہیں کی ہے بلکہ ان کو کسی نہ کسی طور زندہ بھی رکھا ہوا ہے اور بوقت ضرورت انہیں جھاڑ پونچھ کر حیات نو دینے کے لئے اور تیز دوڑ لگانے کے لئے تیار کھڑا بھی کر دیا جاتا ہے۔ بالخصوص ہر اس موقع پر جب کہ "پاکستانی سرمائے" اور "قومی سرماؤں" کے درمیان کشمکش تیز ہو جاتی ہے اور قومی تحریک زوروں میں آتے ہوئے انتہائی جارح نظر آنے لگتی ہے۔ "پاکستانی قومیت" کے شارح بھی "اپنی" تاحال خفتہ قومیت (یا قومیتوں) کو جگا کر اسے لسی پلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور "پاکستانی قومیت" اور دیگر قومیتوں کی معاملہ کاری کے توازن کو موافق مطلب کرنے کے

لئے "عظیم تر پاکستانی قومیت" اور اس سے بھی عظیم تر اور اعلیٰ و ارفع "مسلم قومیت" کے پلڑے میں ایک اور قومیت یا قومیتوں کا اضافہ بھی کر لیتے ہیں۔ اور یوں ملک میں قومی مسئلہ سیاسی افق پر سب سے اہم مسئلہ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

"پاکستانی قومیت کی سب سے بڑی، اہم ترین اور صف اوّل کی پیرو کار ضیاء آمریت ہی ہے۔ جو پاکستان میں ترقی کی سرمایہ دارانہ راہ کی عالمی بینک اور محبوب الحق کی شرح و تفسیر کے مطابق عالمی استعمار کی "شریعت" کا نفاذ کر رہی ہے۔ ہم نے اس مضمون کی ابتدا میں ملکی امور و معاملات کو نمٹانے کے معاملے میں اس مطلق العنان پر شاہی کے جابرانہ و استبدادانہ طور طریقوں کی ممکنہ حد تک اختصار سے جائزہ لینے کی کوشش کی۔ پاکستان میں "قومی مسئلہ" سمیت تمام مسئلوں کے تجزیے و احاطے اور ان پر محنت کش طبقے کے موقف کا ناگزیر سیاق اسی مطلق العنانیت کی کارگزاریاں فراہم کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محنت کش طبقہ کسی بھی مسئلہ کو، اور "قومی مسئلہ" کو بھی اس مطلق العنانیت سے نجات حاصل کرنے کے "جمہوری مسئلہ" سے جدا کر کے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ جب بھی "قومی مسئلہ" اٹھاتا ہے اس کے سامنے پاکستانی "قومیت اور "مسلم" قومیت اور اس کی شارح مطلق العنانیت بھی ہوتی ہے۔ جو اس مطلق العنانیت کے پیش نظر سب سے خونخوار قومیت ہے۔ قومی مسئلہ کو جمہوری مسئلہ کے سیاق میں اٹھانے اور حل کرنے کا کیا مفہوم ہے؟ اس کے نظری، تدبیری، تنظیمی اور روزمرّہ سیاسی سرگرمیوں و حکمت عملی کے لئے کیا مضمرات مرتب ہوتے ہیں؟ ہم ان پر ذرا دیر بعد بحث کریں گے۔ ابھی ہم سرمایہ دارانہ قوم پرستی اور قومی تحریکوں کے اوصاف کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ قومی تحریکیں پہلے "قومی مسئلہ" اور پھر بعد میں "جمہوری مسئلہ" پہلے "قومی مسئلہ" اور پھر بعد میں "طبقاتی مسئلہ" کے اصولوں پر کاربند ہیں۔ اور اس پہلے اور بعد کی مرحلہ وار جدوجہد کی موقع پرستانہ راہ پر "روشن خیال" دانشوروں کے کچھ حلقے شامل ہو کر پیٹی بورژوا حلقوں کے علاوہ محنت کش عوام کو بھی شمولیت کی

دعوت دے رہے ہیں۔

جمہوری مسئلہ کو جدا کر کے محض "قومی مسئلہ" کو اٹھانے اور اسے پیش کرنے کے نتیجے میں "پاکستانی قومیت" اور "قومی تحریکوں" کے درمیان اور خود "قومی تحریکوں" کے مابین کشمکش کے قواعد وضوابط کیا ہیں؟ اس کے بظاہر کوئی قواعد وضوابط نہیں، اگر اس کے صرف خارجی اتار چڑھاؤ اور الٹ پلٹ کو دیکھا جائے تو اس کی کوئی سمت کوئی رجحان نظر نہیں آسکتا۔ ہر قومی تحریک دوسرے سے متصادم ہے۔ پختون قومی تحریک کے بلوچستان کے وسیع علاقوں پر دعوے ہیں، بلوچ قومی تحریک کے دریائے سندھ کے مغربی علاقوں کے وسیع علاقے پر اور کافی سرائیکی علاقے پر بھی، لیکن سندھی، بلوچ، پختون متحد بھی ہیں، بلوچ پختون فساد بھی ہوتا لیکن اسی قومی تحریک کے حوالے سے بلوچ پختون متحد بھی ہیں۔ مہاجر "پاکستانی قومیت" کے سب سے بڑے شارحوں میں سے بھی ہیں لیکن مہاجر قومی تحریک بھی ہے۔ پنجابی بھی پاکستانی قومیت کے صف اوّل کے پیروکار بھی ہیں اور پنجابی قومی تحریک کی کونپل بھی لگا رہے ہیں۔ مہاجر سندھی فساد بھی ہے لیکن مہاجر و سندھی قومی تحریکوں میں ربط ضبط بھی، بلکہ بڑا گہرا ربط۔ خون آشام مہاجر و پختون فساد بھی ہوتا ہے لیکن دونوں قومی تحریکوں کی قیادت میں اُنس کو گہرا کرنے کے لئے دعوتوں کے خطوط بھی رقم ہوتے ہیں۔ "پاکستانی قومیت" کی شارح افواج سندھ میں عوام کا قتل عام بھی کرتی ہیں لیکن ابھی یہ خون خشک بھی نہیں ہوتا کہ ضیاء سندھ کی قومی تحریک کے بانی کا پاؤں بھی چھوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کی تعریف میں قصائد پڑھتے ہیں۔ ابھی قصیدوں کی آواز ہمارے کان میں گونج ہی رہی ہوتی ہے کہ سندھ میں پھر خون بہتا ہے۔ کالا باغ اور پنوں عاقل چھاؤنی پر سندھ کی قومی تحریک "سینا" بنتی ہے، سندھ کا وسیع تر اتحاد سن میں قائم ہوتا ہے اور عین اس وقت جبکہ ہم سندھ میں "قومی تحریک" میں ایک نئے فیصلہ کن ابھار کی توقع باندھے بیٹھے تھے سن کانفرنس کے شرکا، ہارون،

سومرو، اور پاشا کھوڑو جی ایم سید کی برکت سے ضیاء مطلق العنانیت کے بندوبست میں شریک ہو کر "پاکستانی قومیت" کے ریاستی کل پرزوں کے جزو بن کر "پاکستانی قومیت" کا نفاذ کرنے لگے۔ بلوچ قومی تحریک پورے زور شور سے اٹھنے کے بعد پورے آمرانہ دور میں "پاکستانی قومیت" کے سب سے بھرپور اظہار کے دور میں، اب منظر سے غائب ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ وہ ناراض ہے اتنی ناراض کہ ناراضگی کا اظہار بھی نہیں کرے گی۔ پختون "قومی تحریک" کی دھواں دھاری بھی نظر نہیں آتی تشریح یہ ہے کہ اب وہ بھی پاکستانی قومیت، کے چھوٹے اور نئے شارح بن گئے ہیں۔ مہاجر قومی تحریک بھی "پاکستان کا مطلب کیا بھاڑ میں جائے ہم کو کیا" اور "اب مہاجر کسی اور کا قربانی کا بکرا نہیں بنے" کے نعروں کی دھند میں "پاکستانی قومیت" کے حکومتی بندوبست میں اپنے عناصر بھیج چکی ہے یا بھیجنے کے لئے کوشاں ہے، اور پاکستانی قومیت کے ذرائع ابلاغ پر اپنی قیادت کی "پاکستانی قومیت" کے ترجمان گورنر سے ملاقات پر نازاں ورقصاں ہے۔ ادھر "پاکستانی قومیت" کی شارح ضیاء آمریت کے طور طریقے بھی عجب ہیں۔ اس نے مختلف "قومی تحریکوں" کی قیادت سنبھالنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ فضل حق پختون قومیت کا مرد آہن بن گیا، نواز شریف پنجابی مافوق البشر نسل کا دیر بن گیا، غوث علی شاہ سندھ کے حقوق کے علمبردار ہو، پاکستانی قومیت نے اب اپنی گھریلو قومی تحریکیں بھی شروع کر دیں۔ اور اسی پر موقوف نہیں۔ یہ سب اپنی اپنی قوموں کے ان "قوم پرستوں" کی آنکھ کا تارا بھی ہیں۔ جو "پاکستانی قومیت" کے خلاف ہر لحظہ زہر اگلتے رہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

کیا یہ رویے قابل فہم ہیں؟ بظاہر نہیں۔ "پاکستانی قومیت" اور دیگر "قومیتوں" پنجابی، پختون، سندھی، بلوچ، مہاجر (اس بحث سے قطع نظر کہ مہاجر "قوم" کی کسی لغوی، تصوراتی تعریف پر پورے اترتے ہیں کہ نہیں۔ صرف "قوم پرستی" ہیں شرابور دانشوروں کے لئے ہی یہ مسئلہ صبح تا شام مناظرے کا سامان پیدا کر سکتا ہے۔ ہم یہاں صرف فی الحقیقت

موجودہ "قومی تحریکوں" کے اوصاف کا جائزہ لیتے ہوئے اُن کو محنت کشوں کے "قومی پروگرام" سے ممیز کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ سرائیکی قوموں کے درمیان کشمکش اور خود ان قومیتوں کے درمیان کشمکش کے گرگٹ کی مانند بدلتے ہوئے رنگ، ذرا میں تولہ میں ذرا میں ماشہ قسم کے رویے، ابھی اتنی جارحیت، اتنا غم وغصہ، اتنی مارکٹائی، اتنا آگ وخون، اور ابھی اتنی انسیت، اتنا ملاپ، اتنے شیر وشکر، یہ سب کچھ کسی کے بھی ذہن کو ماؤف کرنے کے لئے کافی ہے۔

فی الحقیقت قومی تحریکوں کے یہ تمام اوصاف "پاکستانی سرمائے" سمیت مختلف "قومی سرماؤں" اور سرمایہ داروں کے مختلف قومیتی گروہوں کی باہمی کشمکش کے آئینہ دار ہیں۔ قومی تحریکوں کی کشمکش نے اپنے تمام اوصاف سرماؤں کی اسی بے لگام، ہمہ گیر، غیر متزلزل لامتناہی، ناہنجار کشمکش سے مستعار ے ہیں، اور "قومی مسئلہ" پر قوم پرستوں کی روش کے تمام وقتی مدوجزر، تمام آتار چڑھاؤ، تمام پیش قدمیاں اور پسپائیاں، تمام تنازعے اور اتحاد اور محاذ لفظی بنیادی طور پر مختلف باہم متصادم قومی سرماؤں کی ناگہانی ضروریات کے تابع ہیں۔

تمام مختلف قومی تحریکیں باہم متصادم کیوں رہتی ہیں؟ اس لئے کہ تمام سرمایہ، تمام سرمایہ دار، سرمایہ داروں کے تمام گروہ اور ان کے تمام قومی گروہ باہم متصادم رہتے ہیں۔ ہر سرمایہ، ہر قومی سرمایہ "اپنی" قوم کے وسائل اور منڈی پر اپنے اجارے، اور اس سے دوسروں کو دور رکھنے، اور دوسری اقوام کے وسائل اور منڈی پر اپنے تجاوز کے لئے ہمہ وقت دوسرے سرماؤں سے دست وگریباں رہتا ہے۔ یہ کشمکش سرمائے کی بڑھوار کا لازمی وصف ہے۔

اور یہ ہر قومی تحریک اپنے مطالبات کے بیان میں مبالغہ کیوں کرتی ہے اور اپنے قومی مفادات کو بڑھا چڑھا کر کیوں بیان کرتی ہے؟ یہ کیونکہ کہ ہر قومی تحریک کے پاس عظیم تر سندھ، عظیم تر بلوچستان، عظیم تر پختونستان، عظیم تر پنجاب، عظیم تر سرائیکی

صوبہ، اور عظیم تر مہاجر صوبہ کا منصوبہ موجود ہے؟ اس لئے کہ سرمایہ اور سرمایہ دار طبقہ، ہر سرمایہ دار اور سرمایہ داروں کا ہر گٹھ جوڑ ہمیشہ ہی اپنے مطالبات بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ وہ اپنی اشیاء کے دام زیادہ لگا کر ہی ان پر اصرار کر کے اور اُن کے اوصاف کو بڑھا چڑھا کر ہی اپنی اشیاء کے لئے داموں کی ممکنہ حد تک زیادہ سے زیادہ سطح کی تحصیل کر سکتا ہے۔ اور پیٹی بورژوا دانشور پیشہ ور قصیدہ خواں "پاکستانی قومیت" سمیت پاکستانی ریاست کے اندر تمام "قومیتوں" کے اِن مبالغہ آمیز دعووں کی نظریہ سازی کے لئے کان پر قلم لگائے آن دھمکتے ہیں اور ماضی بعید کی تاریخ کی چھان پھٹک کر کے ہر "قومیت" (بشمول پاکستانی قومیت کے) کو نہلائے دھلائے تاریخی ہیرو فراہم کر دیتے ہیں۔ محنت کش طبقہ "پاکستانی قومیت" اور "مسلم قومیت" کے عقب میں مخفی "قومیتوں" کے مبالغہ آمیز دعووں کو بھی رد کرتا ہے اور وہ "اپنی" قومیت کے لئے مراعات و تحفظات کے حصول کے لئے دیگر "قومی تحریکوں" کے مطالبات کو بھی رد کرتا ہے۔ وہ مطالبہ کرتا ہے اور اس مطالبے کو اپنے منشور کا بنیادی جزو قرار دیتا ہے کہ پاکستان میں تمام گروہی اور قومی تحفظات کو منسوخ کیا جائے اور پاکستان کے دستور میں اس بات کی ضمانت فراہم کی جائے کہ کوئی پارلیمنٹ ایسا قانون نہ منظور کر سکے، کوئی انتظامی ادارہ ایسے قواعد و ضوابط اپنا کر اُن کا اطلاق نہ کر سکے جس سے کسی بھی قوم کیلئے کسی بھی قسم کے امتیازی تحفظات و مراعات کا بندوبست ہو۔

اور یہ ہر "قومی تحریک" دوسری اقوام کے مطالبات کی جانب منفی رویے کیوں اختیار کرتی ہے؟ ان کے مطالبات کی وقعت کیوں کم کرتی ہے اور اُن کو ناقابل توجہ گردانتے ہوئے اپنے مطالبات کے لئے ان کی سرگرمی و تحریک کی جانب بے مہری اور سرد مہری کیوں اختیار کرتی ہے؟ اس لئے کہ تمام سرمایہ دار اور سرمایہ داروں کے تمام گروہ بھاؤ تاؤ کے دوران دوسروں کے مطالبات کو بے وقعت گردان کر اُن کی

اشیاء کے اوصاف کی تخفیف کر کے اور دوسروں کو دل شکستہ و بددل کر کے ہی بھاؤ تاؤ کو ممکنہ حد تک اپنے حق میں فائدہ بخش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس سرمایہ دار طبقے کے بہیر پیٹی بورژوا دانشور بھی اپنی تمام تر کلبیت مجتمع کر کے، دوسری اقوام کی تاریخ کو جانچ پرکھ کر ان کی ثقافت، ان کے سورماؤں، ان کے تاریخی آدرشوں سب کا تمسخر اڑانے اور تحقیر کرنے کے لئے ایک بار پھر آن دھمکتے ہیں۔ معاف کیجئے محنت کش طبقہ اور مظلوم محنت کش، عوام جس نے صدیوں مختلف استحصالی طبقوں کے ہاتھوں تحقیر و تذلیل سہنی ہے اور جو انسانی تاریخ میں پہلی بار صف بند ہو رہا ہے کہ نہ صرف اپنی تحقیر و تذلیل کا حساب بے باق کر دے بلکہ اس امر کا تیقن بھی کرے کہ آئندہ بھی مستقبل میں کبھی بھی کوئی بھی شخص کوئی بھی اجتماعی گروہ اور قوم کسی دوسرے کے ہاتھوں تحقیر و تذلیل کا شکار نہ ہونے پائے اس کلبیت آمیز تمسخر و تحقیر کا شریک کار نہیں ہو سکتا۔

اور یہ ہر قومی تحریک ہر لحظہ ظلم کا رونا کیوں روتی رہتی ہے؟ یہ خود ترسی میں کیوں مبتلا رہتی ہے؟ یہ ہر قومی تحریک کے پاس "اپنی" قومیت کے ساتھ مظالم، زیادتیوں، استحصال کا "تقدمہ" کیوں ہمہ دم تیار رہتا ہے؟ اس لئے کہ ہر سرمایہ دار اور سرمایہ داروں کا ہر گروہ ہمہ دم گھاٹے کا واویلا کرتا رہتا ہے۔ اور گھاٹے کی اس سرمایہ دارانہ آہ و بکا کی منطق ہی ایسی ہے کہ یہ کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ سرمایہ دارانہ لغت میں گھاٹے کے معنی ہی کچھ اور ہیں۔ وہ کسی کاروبار میں واقعتاً اپنی اصل رقم کی کمی کو نقصان تو گردانتا ہی ہے لیکن وہ ہر کاروباری مہم میں نفع کی جو توقعات باندھتا ہے اس نفع میں کمی کو بھی وہ نقصان گردانتا ہے۔ نفع میں نقصان میں بھی اس کا نقصان ہے اور نفع میں نقصان کی یہ منطق وہ منطق ہے جس کی کوئی تھاہ نہیں۔ سرمایہ دار طبقہ اور اس کا ہر گروہ ہمیشہ نقصان نقصان کا واویلا کرتا رہتا ہے اور کرتا رہے گا اور "پاکستانی قومیت" "قومیت تمام" "قومی تحریکیں" اس سرمایہ دار کی مبالغہ آمیز توقعات کی نامرادیوں اور

ناتمامیوں کی نظری تسخیر کرکے ان کے نظری نجارات اڑا کر، سرمایہ دار کی ان نا ہنجار ناتمامیوں کو لطیف تر کرکے، انہیں "اپنی" قوم کی ناتمامیوں سے خلط ملط کرکے، اور قومی نظریوں کی تشکیل کرکے، اس نظری دھواں دھار میں ان نظری نجارات کو دوبارہ منجمد کرکے ان کے اصل جوہر، یعنی سرمایہ دارانہ مفادات کو آگے بڑھانے کا بندوبست کرتی رہیں گی۔ اور پیٹی بورژوا دانشوروں کے دستے اپنے قومی سرمایہ داروں کی ناتمام آرزوؤں کے نوحے لکھتے رہیں گے۔ تاہم محنت کش طبقہ جس کا گھاٹا ہی اصل گھاٹا ہے، جو اس گھاٹے کے تمام ذمہ داروں کو اچھی طرح پہچانتا ہے، اس واویلے پر کوئی کان نہ دھرے گا چاہے پیٹی بورژوا دانشور کتنا ہی کیوں نہ بلکیں اور کتنا ہی یہ شور کیوں نہ مچائیں کہ ہائے "قوم" کو احساس زیاں جاتا رہا۔ پاکستان کے محنت کش طبقے اور مظلوم اور کچلے ہوئے محنت کش عوام کو اپنے زیاں کا احساس ہے لیکن معاف کیجئے یہ سرمایہ دارانہ زیاں سے ہم وسعت نہیں۔

اور یہ تمام قومی تحریکیں اتنی جارح کیوں ہیں؟ "پاکستانی قومیت" سمیت تمام دیگر "قومی تحریکیں" پنجابی، مہاجر، سندھی، بلوچ، پختون وغیرہ ان سب کا لہجہ اتنا پرشور اور غضبناک کیوں ہے؟ اتنا غضبناک کہ دل بیٹھتا ہے! اتنا زور شور کیونکر کہ ان سے بات چھیڑتے دل ڈرتا ہے؟ یہ ہر کسی کو غدار اور رکالی بھیڑ کیوں قرار دیتی پھر رہی ہیں؟ ان کے ہر ابھار پر قتل و غارت گری کا بازار کیوں گرم ہوتا ہے؟ ایسی قتل و غارت گری کہ آج پاکستان میں انسانی سلامتی و تحفظ کا مسئلہ صف اوّل کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس لئے کہ سرمایہ اپنی فطرت میں جارح ہوتا ہے۔ یہ پیدا ہی لوٹ مار، دھوکہ دہی، فراڈ، بلیک میل اور قتل و خون کی گود میں ہوتا ہے اور اپنی پوری بڑھوار کے دوران اپنی ان مذموم حرکات کے دائرے میں وسیع سے وسیع تر انسانی گروہوں کو گھیر کر ان پر قتل و خون، چوری ڈاکہ، مسلط کرتا جاتا ہے۔ ہر سرمایہ بڑھوار کی طرف مائل ہوتا

ہے۔ اس کی خصلت ہی "استعماری" ہے۔ اس بڑھوار کے دوران وہ لازمی طور پر دوسرے سرمایوں سے متصادم ہوتا ہے جن کی اپنی خصلت بھی مختلف نہیں۔ چنانچہ ان کے ٹکراؤ کے ڈنگل کے خدوخال ان کی اپنی خصلتوں کے آئینے میں ہی مرتب ہوتے ہیں۔ سرمایہ دار اور سرمایہ داروں کے گروہ ایک دوسرے پر ٹوٹ کر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کا کباڑا نکالنے ایک دوسرے کو زمین بوس کرنے کے لئے کوئی ایسا حربہ نہیں جس سے یہ دریغ کر جائیں۔ اور "قومی تحریکیں" بشمول "پاکستانی قومیت" اسی سانچے میں ڈھلی ہیں۔ کسی بھی ایسے معاشرے میں جہاں سرمایہ داریت کا نفوذ تیز ہو جائے، داخلی و عالمی منڈی کے اتار چڑھاؤ، علمی و تکنیکی تبدیلیوں اور بے شمار دیگر بے ثقل تیز رفتار عوامل کی کارفرمائیوں کے باعث سرمایہ دارانہ گروہوں کے مفادات بدلتے رہتے ہیں اور ان کو نت نئی صف بندیوں کی ضرورت پڑتی ہے چنانچہ مختلف سرمایہ دار سرمایہ داروں کے گروہوں کے اس ہمہ جہتی تصادم میں صف بندیاں بدل بدل کر اسی قدر بدلتی ہوئی دیگر صف بندیوں پر حملہ آور ہوتے رہتے ہیں۔ نہیں پتہ کہ کون کس وقت پلٹ کر کس پر جھپٹ پڑے۔ چنانچہ آج کی صورت حال میں پاکستان کے عوام کو نہیں پتہ کہ صبح کونسی "قومی تحریک" کس "قومی تحریک" سے یا "پاکستانی قومیت" کس "قومی تحریک" سے اور کونسی "قومی تحریکیں" "پاکستانی قومیت" سے دست و گریباں ہوں گی۔ بلاشبہ اس ہمہ جہتی ڈنگل کے پیٹی بورژوا دانشور حاشیہ نشین بھی اس گہما گہمی میں اپنا کردار تلاش کریں گے۔ اور سرمایہ دارانہ میلے کے یہ بہیر "اپنی اپنی" قومیت کے رجز، ترانے، اور نعرہ ہائے جنگ منضبط کریں گے وہ مہاجر یا در پیر یا اور بھی کریں گے۔ اور "دمادم مست قلندر" بھی۔ تاہم محنت کش طبقہ اس دمادم مست قلندر میں نہ شریک ہو سکتا ہے نہ شریک ہوگا اور مصنوعی طریق پر کھڑی کی ہوئی ہر دمادم مست قلندریت کو اپنی بیکراں خموشی و بے اعتنائی سے ہی شکست دے دے گا۔ وہ بڑھتی ہوئی بین الاقوا

کا ادراک کر رہا ہے۔ آج اس کے سامنے محنت کشوں کی بین الاقوامی جدوجہد کے وسیع امکانات کھلتے جا رہے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ محنت کشوں کی بین الاقوامیت کسی ریاستی سرحدوں کی پابند نہیں۔ اگر قومیں کسی ایک ریاست کی سرحد کے اندر یکجا رہیں تو بھی اور اگر وہ علیحدہ ہو جائیں تب بھی یہ بین الاقوامیت حقیقت پذیر ہو گی۔ اور اس کی نظریاتی، وتدبیری، وتنظیمی اشکال بھی مرتب ہوں گی اور اس کی روزمرہ سیاسی حکمت عملی کی صورتیں بھی مہیا ہوں گی۔ چنانچہ وہ کسی ایسی دمادم مست قلندر کا شریک نہیں ہو سکتا، کسی ایک ایسی جارحیت کا مرتکب نہیں ہو سکتا جو محنت کش طبقہ اور محنت کش مظلوم عوام کی اس قریب الوقوع اور سر پر منڈلاتی بین الاقوامی سرگرمیوں پر اپنے نقوش چھوڑ کر اسے موخر کرنے کا باعث بنے۔ وہ قوموں کے پُر امن اشتراک اور ان کی پُر امن علیحدگی کے مطالبہ کو حقیقت پذیر کرنے کے لئے کوشاں رہے گا۔

اور اتنی جارحیت، آپس کے اتنے کشت وخون کے بعد "پاکستانی قومیت" اور دیگر "قومی تحریکوں" اور خود باہم متصادم اور ایک دوسرے کی جان کے درپے مختلف "قومی تحریکوں" میں باہم تصفیہ کیوں ہو جاتا ہے؟ یہ مل کیوں بیٹھتی ہیں؟ اور آپس میں اتنی شیر وشکر کیوں ہو جاتی ہیں؟ اس لئے کہ سرمایہ اور سرمایہ دار ہمیشہ آپس میں تصفیہ کرتے ہیں۔ وہ معاملہ فہم ہوتے ہیں اور ہر تباہ کن مسابقت، اور ہر کمر توڑ مقابلے کے بعد وہ بہر حال معاملہ کاری کرتے ہیں۔ سرمایہ اور سرمایہ دار، قبائلی اور جاگیردارانہ زوائد سے پاک ہوتے ہیں اور صرف ناک کی خاطر جنگ کو اس مقام تک نہیں لے جاتے جہاں وہ خود تباہ ہو جائیں۔ چنانچہ قیمتوں کی ہر جنگ کے بعد بھاؤ سبھا اور معاہدۂ تجارت جنم لیتے ہیں۔ ہر شدید و سنگین مقابلے و مسابقت کے بعد کچھ لو کچھ دو کے اصول پر گفت وشنید اور مفاہمت ہوتی ہے اور ایک توازن طے پاتا ہے، اور اسی سرمایہ دارانہ مفاہمت کے آئینے میں "قومی تحریکوں" کی لین دین ہوتی ہے، وزارتیں بٹتی ہیں، تبادلے

ہوتے ہیں، تقریریں ہوتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ امن کمیٹیاں بنتی ہیں، نئے نظریے اور نئے نعرے ڈھلتے ہیں۔ "پاکستان کے بنانے والے پاکستان کے مخالف کیوں کر ہو سکتے ہیں؟" "قومی قیادت" کے ہر راہنما کے ماضی کو چھان پھٹک کر پاکستان کے قیام میں اس کے مثبت کردار کو نکالا جاتا ہے۔ "سندھی مہاجر بھائی بھائی" "سندھیوں اور پختونوں میں مفادات کا کوئی ٹکراؤ نہیں" "مہاجروں اور پختونوں کے مفادات میں کوئی ٹکراؤ نہیں" وغیرہ وغیرہ۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ، تمام "قوموں" کے وفود تمام دوسری قوموں کو امن، دوستی و خیر سگالی کا پیغام پہنچاتے ہیں اور یوں ایک ہمہ گیر یکجہتی اور پیار و محبت اور احترام باہمی کا سماں بحال ہو جاتا ہے۔

اور پھر اچانک یہ یکجہتی ختم کیوں ہو جاتی اور جارحیت کیوں شروع ہو جاتی ہے؟ قومی تحریکوں میں نیا "اُبھار" کیوں آجاتا اور "قومی مسئلہ" ابھر کر پھر منظر پر سب سے اہم مسئلہ کیوں بن جاتا ہے؟ یہ "قومی تصفیے" یہ "معاہدے" اور "مصالحتیں" ایک دفعہ طے ہونے کے بعد قائم کیوں نہیں رہتیں اور بشمول "پاکستانی قومیت" کے "قومی تحریکیں" ان معاہدوں کی پابند کیوں نہیں رہتیں؟ اس لئے کہ سرمایہ بڑھنے اور دوسرے سرماؤں پر سبقت لے جانے کی اپنی خصلت نہیں چھوڑ سکتا۔ مختلف سرمائے تصفیہ ہوتے ہی دوسروں پر سبقت لے جانے کے لئے سرگرم و مستعد ہو جاتے ہیں۔ وہ مختلف رفتاروں سے جدید علمی و تکنیکی جدتوں کو متعارف کرا کر محنت کی شدت اور محنت کی پیداواریت کی مختلف مقداروں کا اضافہ کرتے ہیں۔ اُن کی قدرِ زائد کشید کرنے کی قوت میں مختلف رفتاروں سے کمی بیشی ہوتی ہے اور نتیجے کے طور پر مختلف سرمائے مختلف مقداروں میں مستحکم و مضبوط ہوتے ہیں۔ نیز نئے سرمائے بھی میدان میں داخل ہوتے ہیں اور کسی ایک یا دوسرے "قومی سرمائے" کے گٹھ جوڑ کی قوت بڑھتی گھٹتی رہتی ہے۔ نئی صف بندیاں بھی ہوتی ہیں۔ پھر ریاستی وسائل پر مختلف سرماؤں کی پہنچ بھی مختلف ہوتی ہے۔ منڈی کے بحران، اُس

کے اتار چڑھاؤ میں سرمایوں کی قوت پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اسی طرح بے شمار دیگر بے تعلق اور ناقابل پیش بینی اقتصادی و سیاسی عوامل پھر ایک ایسی صورت حال پیدا کر دیتے ہیں جس میں پرانا توازن اور معاہدہ بے عمل ہو جاتا ہے سرمایوں کی جنگ پھر چھڑ جاتی ہے اور وہ انتہائی جارحیت سے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ "قومی" تحریکیں بھی اسی تال پر اسی زیر و بم پر رقصاں رہتی ہیں۔ پرانے توازن کو بدلنے یا اس کو محفوظ رکھنے کے لئے ہر قومی سرمایہ "اپنی قوم" کو اس زیاں کی تلافی کے لئے آواز دیتا ہے۔ قومی تحریک میں پھر "ابھار" آجاتا ہے اور جارحانہ مبالغوں اور قصیدوں، قومی تحقیر و تمسخر، اور قومی نوحہ خوانی، کشت و خون کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ جارحیت ایک نئے توازن پر نتیجہ خیز ہو کر صلح جوئی، امن و آشتی و خیر سگالی کے ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے۔

"قومی تحریکوں" کی یہ جارحیت ایک اور اعتبار سے بھی فریب دیتی ہے۔ دراصل تمام "قومی" تحریکیں بشمول "پاکستانی" قومیت اپنی سیاسی ماہیت میں ایک دوسرے کی دوست اور ممد و معاون ہیں۔ ایک قومی تحریک جتنی "جارح" ہو گی، اپنے مطالبے دوسرے کے مقابلے میں جتنے مبالغے سے بیان کرے گی، دوسری قوم کی جتنی تحقیر کرے گی، اُسی قدر وہ دوسری "قومی" تحریک کی ممد و معاون ہو گی۔ اور اُس "قومی" تحریک کو اپنے عوام میں جڑیں بنانے میں مددگار و معاون ہو گی۔ فوجی آمریت کے دور میں قومی تحریکیں اسی باعث ایک نئی قوت و شان کے ساتھ ابھرتی ہیں۔ چونکہ فوجی آمریت ہی "پاکستانی" قومیت کی سب سے جارح شارح ہے چنانچہ اُس کے جارحانہ اقدامات "قومی" تحریکوں کے ممد و معاون ہوتے ہیں نہ کہ اس کے قاطع۔ اسی طرح "قومی" تحریکیں "پاکستانی" قومیت کے جارح ترین شارحین یعنی فوجی مطلق العنانیت کے حق اقتدار کو مضبوط و مستحکم کرتی ہیں۔ پاکستان کے مخصوص حالات میں تو فوجی مطلق العنانیت اور قومی تحریکوں نے اپنی اس "دوستانہ" سیاسی ماہیت کی شناخت بھی کر لی ہے اور ان کے روابط میں

اس کا برملا اظہار بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح مختلف "قومی" تحریکیں بھی چاہے وہ ایک دوسرے کے خلاف کتنا ہی زہر کیوں نہ اگلیں اور دوسری قومیتوں کے مقابل اپنے مطالبات میں کتنا ہی مبالغہ کیوں نہ کریں اپنی سیاسی ماہیت و اصلیت میں اپنی مخالف "قومی" تحریکوں کی مددگار و معاون ہیں۔ وہ انہیں تقویت پہنچاتی ہیں۔ چنانچہ خود "پاکستانی" قومیت کی اشتعال انگیزیوں سے برانگیختہ ہونے والی مہاجر قومی تحریک نے پنجابی پختون اتحاد کو جنم دیا، پنجابی پختون اتحاد کی جارحیت نے مہاجر قومی تحریک کو مضبوط کیا اور پھر دونوں ایک دوسرے کو مضبوط سے مضبوط تر کرتی رہیں۔ اور پھر گرچہ سندھ کی "قومی" تحریک ایک عرصے سے عوامی جڑوں کی پیاسی تھی، ان دونوں کے ابھار نے سندھ کی "قومی" تحریک کو دودھ پلا کر پہلے "سپنا" کو اور "سنا" کو مضبوط و مستحکم کیا۔ اپنے خارجی اوصاف، نعروں اور نظریوں سے قطع نظر "پاکستانی" قومیت بشمول تمام "قومی" تحریکوں کی اس اندرونی دوستانہ ماہیت کے پیش نظر کم از کم ایک ملکی رجحان نے اس عجیب الخلقت عجوبۂ فطرت تدبیر کو اپنا لیا ہے کہ سرائیکی سمیت مہاجر بغیر ہر قومیت کی تنظیم علیحدہ علیحدہ "قومی" بنیادوں پر اپنی آزادانہ سیاسی تشہیر و ابلاغ کرے گی۔ مفروضہ یہی ہے کہ ہر آزاد قومی شاخ کی جانب سے "اپنی" قومیت کے مطالبات کی مبالغہ آمیز تشہیر و ابلاغ اس "قوم" کے علاوہ دوسری "اقوام" میں بھی پوری تنظیم کی مقبولیت کو چار چاند لگائے۔ اس تصوّر کی سیاسی ماہیت کا تجزیہ ہمارے موضوع گفتگو کے تسلسل کو توڑ دے، اس لئے اس پر بحث پھر کبھی سہی۔ فی الحال ہم صرف دعا گو ہیں کہ اللہ اس عجوبۂ فطرت سیاسی و تنظیمی بچے کو صحت دے

ہندوستان کا بایاں بازو

آچن وانیک

ہندوستان کے بائیں بازو کے بڑے حصے کا تاریخی ریکارڈ نہایت متضاد رہا ہے
یہاں کی دونوں کمیونسٹ پارٹیاں (سی پی آئی اور سی پی ایم) سرمایہ دار ممالک میں اس لیے
منفرد ہیں کہ وہ نیم خود مختار علاقوں میں بڑے عرصے تک حکومت چلانے کا تجربہ رکھتی ہیں
ان کی مزدور تنظیمیں آزادی کے بعد مزدور تحریک میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہیں لیکن اس
کمیونسٹ بائیں بازو نے ہندوستانی عوام پر مسلط بورژوا سیاسی اقتدار کو ختم کرنے کی سنجیدہ
علامات کا اظہار نہیں کیا ہے۔ وہ اس حقیقت کے ادراک میں ناکام رہے ہیں کہ آزادی اپنے
ساتھ خواہ کتنی ہی اپاہج سہی مگر قومی اساس پر مبنی ایک ایسی سرمایہ داری کو بھی وجود میں لائی
ہے جو مغرب کے مقابلے میں خواہ کتنی ہی کمزور ہو مگر ۱۹۴۷ء سے وہ لازماً بورژوا جمہوریت
رہی ہے بائیں بازو کی نظریاتی نا اہلیاں قومی تحریک کے زمانہ تک پھیلی ہوئی ہیں جب کمیونسٹ
کانگریس تنظیم کی فطرت، قومی آزادی کے حصول کے لیے اس کی تدابیر مقامی سرمایہ داروں سے
اس کے تعلقات اور استعماری حکومت کو صحیح طریقے سے سمجھنے سے قاصر رہے تھے آج بھی
ہندوستانی کمیونسٹوں میں، جو باہمی فرق موجود ہے۔ وہ کانگریس کے کردار اور حکمران طبقے کے
ادراک سے تعلق رکھتا ہے۔

کمینٹرن روایات

ہندوستانی اور استعماری سرمایہ داروں کے باہمی تعلقات کی نوعیت دیگر استعماری محکوم ممالک کی بہ نسبت کہیں بہتر

رہی ہے یہ تعلقات محکوم ریاست کی حدود کے اندر ردّوبدل کا شکار رہے ہیں پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران دیسی سرمایہ داری کو کافی آزادی میسّر تھی جب کہ دورانِ جنگ اور اقتصادی زوال کے سالوں میں اس پر بہت سی پابندیاں عائد کی گئیں۔ ہندوستانی بورژوازی کافی ترقی یافتہ تھی اور برطانوی سرمائے سے اپنے بنیادی مفادات کے ٹکراؤ کا شعور رکھتی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے آپ کو مکمل آزادی کی جدوجہد کے لیے وقف کر دیا تھا۔ قومی آزادی کی جدوجہد کے دوران اسے مزدور طبقے سے اقتدار کے مسئلے پر سخت مقابلہ بھی نہیں کرنا پڑا تھا

یہ بھی حقیقت ہے کہ قومی آزادی کے لیے عوامی جدوجہد میں سماجی انقلاب کے لیے ایک مستقل تحرک بھی موجود رہتا ہے اور ہندوستان کی قومی تحریک اس سے مستثنیٰ نہیں تھی۔ لیکن گاندھی کی قیادت نے جو لائحہ عمل اختیار کیا وہ دیسی بورژوازی کی ضروریات کا خاطر خواہ دفاع کرتا رہا اور سماجی انقلاب کے لیے اُٹھنے والی تحریک کا سدِّباب کرنے میں کامیاب رہا۔ ایک طرف تو شہری نافرمانی اور عدمِ تعاون کی تحریک کا عوامی دباؤ استعماری حکومت کے خلاف استعمال کیا گیا اور دوسری جانب بورژوا قوم پرست سیھاشش چندر بوس کے بقول "مسلسل سمجھوتے" کے ذریعے اس عوامی عمل کو بڑی ہوشیاری سے قابو میں رکھا گیا تھا تاکہ برطانوی استعمار کے خلاف متبادل مسلح انقلابی جدوجہد شروع نہ ہو جائے۔

اوور اسٹریٹ اور ونڈملر نے اپنی مشہور تصنیف "ہندوستان میں کمیونزم" میں قومی جدوجہد کے دوران کمیونسٹوں کی تاریخ کا اجمال یہ پیش کیا ہے کہ وہ کبھی سرمایہ داری اور کبھی استعماریت کے خلاف جدوجہد میں لگے رہے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کمیونسٹ سرمایہ داری اور استعماریت دونوں کے خلاف بیک وقت جدوجہد کی ضرورت کے اصول کے ادراک میں ناکام

رہے تھے حالانکہ وہ لائحہ عمل (TACTICS) کی تبدیلی میں خاصے لچکدار رہے تھے ۔ وہ اپنے معاشرے کی طبقاتی ہیئت کو سمجھنے سے قاصر رہے وہ کانگریس کے بحیثیت جماعت اور تحریک دوغلے کردار کو اچھی طرح سمجھ نہ پائے اور اسی وجہ سے تحریک کے بارے میں ان کا رویّہ نامردانہ بحث اور غیر ناقدانہ اطاعت رہا تھا ۔

ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کانگریس ۱۹۲۵ء میں کانپور میں منعقد ہوئی ۔ کلکتہ مدراس بمبئی اور پنجاب کے کمیونسٹ وہاں جمع ہوئے اور ایک مرکزی کمیٹی کا انتخاب کیا گو کہ اُسے اب رسمی طور پر اس کی پیدائش کا وقت قرار دیا جاتا ہے مگر دراصل سی پی آئی ۱۹۲۰ء میں تاشقند کے مقام پر دوسری کمینٹرن انٹرنیشنل کانگریس کے بعد وجود میں آئی تھی ۔ آئندہ سالوں میں اس کے معروف قائد ایم این رائے کی رہنمائی میں اس کا اصل کام نشر و اشاعت اور فرداً فرداً رکنیت سازی تھا تاکہ پارٹی کی فلاحی و داخلی ہئیتوں کو مضبوط بنایا جائے لیکن ۱۹۲۰ء کے عشرے میں کمیونسٹوں کو شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور اس کے خلاف پشاور ۲۳-۱۹۲۲ء کانپور ۱۹۲۴ء اور میرٹھ ۳۳-۱۹۲۹ء متعدد سازشوں کے مقدمے قائم کئے گئے ۱۹۲۶ء میں پارٹی کے صرف ۵۰ ممبر تھے جب کہ اس وقت چین میں تیس ہزار اور ہند چینی میں تین ہزار پارٹی ممبر تھے جب ۱۹۲۸ء میں بمبئی میں کپڑے کی صنعت کے مزدوروں کی ہڑتال شروع ہوئی تو اس وقت تک کمیونسٹوں نے مزدور تحریک کی قیادت شروع کر دی تھی اور وہ مزدور کسان تنظیمیں اور خود کانگریس کے اندر ایک وسیع بایاں بازو بنا رہے تھے ۔

اس مرحلہ پر ۳۴-۱۹۳۰ء کے دوران جب شہری نافرمانی کا وسیع کانگریسی انقلابی اقدام اٹھایا جا چکا تھا ۔ کمینٹرن کے تیسرے مرحلے کا تباہ کن فرمودہ نازل ہوا جس نے سی پی آئی کو سنجیدہ عوامی سیاسی کام سے منع کر دیا تھا ۔ یہ وہ وقت تھا جب کانگریس کے بائیں بازو کے ساتھ مل کر ایک با اصول بائیں مشترکہ محاذ کے کام کرنے کے امکانات موجود تھے لیکن کمیونسٹوں نے نہرو اور انقلابی عناصر کی مذمت شروع کر دی اور ان پر استعماریت کے چہرے کا بایاں رُخ

ہونے کا الزام لگانا شروع کر دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے یورپی کمیونسٹوں نے سوشل ڈیموکریسی کو فاشزم کا بایاں رُخ قرار دے کر شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس موقع کا ضیاع ایک قیمتی نقصان ثابت ہوا اور گاندھی نے کانگریس کی قیادت کی لگام مضبوطی سے تھام کر انگریزوں کے خلاف عدم تعاون کی تحریک چلا دی۔ کمینٹرن نے ۱۹۳۲ء میں اپنی پالیسی پر نظر ثانی کے پہلے اقدام لیے اور یہ مشورہ دیا کہ سی پی آئی "تعاون" اور "تدخل" (INFILTECRATION) کے ذریعے کانگریس جیسی عوامی اصلاحی تنظیموں میں شامل ہو سکتی ہے۔ شاید اس تبدیلی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پہلے جیسے ایک چھوٹی پارٹی کی رکنیت مزید گھٹ گئی تھی۔ یہ صورت حال ۱۹۳۴ء تک جاری رہی جب کمیونسٹوں کی تعداد سال کے ابتدا میں بیس سے بڑھ کر اس کے آخر میں ڈیڑھ سو ہو گئی تھی۔

سی پی آئی کا استحکام۔

سی پی آئی ۴۷ - ۱۹۳۵ء کے عرصہ میں ایک بڑی سیاسی تنظیم بن گئی تھی۔ جب پی سی جوشی اس کے جنرل سیکریٹری تھے اور پارٹی نے مزدور، طلبا اور خواتین محاذوں پر عوامی کام شروع کر دیا تھا اور نشر و اشاعت و احتجاج کا نہایت چابکدست جال پھیلا دیا تھا ۱۹۳۵ء میں ساتویں کمینٹرن کانگریس نے "سامراج دشمن عوامی محاذ" کے قیام کے لیے اشارہ دیا جس کے مطابق کانگریس کے ساتھ رہتے ہوئے کمیونسٹوں کو کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے ساتھ بھی تعاون کرنا تھا جو جے پرکاش نرائن کی قیادت میں ۱۹۳۴ء میں کانگریس سے علیحدہ ہوئی تھی سوشلسٹوں کے ساتھ تعاون کی وجہ سے سی پی آئی کی تنظیم کو کافی تقویت ملی مغربی بنگال میں اُس کی بنیاد مضبوط ہوئی اور کیرالہ و مدراس میں اس نے استحکام حاصل کیا جہاں سے پہلے اس کی جڑیں بالکل موجود نہیں تھیں اب وہاں وہ ایک ٹھوس تنظیم بن چکی تھی ۱۹۳۹ء تک کیرالا کی تقریباً پوری کانگریس سوشلسٹ پارٹی کمیونسٹ پارٹی کا جزو بن گئی تھی اور آج بھی اس ریاست کے سب سے عظیم کمیونسٹ ہیں۔

سی پی آئی کی سیاست میں دائیں بازو کی کجروی نسبتاً زیادہ حیران کن ہے مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ یہ سب اس وقت ہوا جب خود کانگریس بھی دائیں طرف مڑ رہی تھی ۱۹۳۵ء میں نہرو گاندھی کے دباؤ میں آ کر ہمہ گیر آئین ساز اسمبلی کے مطالبے سے دستبردار ہو چکا تھا اور اس نے استعماری ریاست کے ڈھانچے میں رہتے ہوئے نیم خود مختار حکومت کا برطانوی منصوبہ قبول کر لیا تھا یہ فیصلہ کن موڑ سیاسی تنازعہ میں گاندھی کی فتح کا مظہر تھا لیکن سی پی آئی نے بھی سرمایہ دار مخالف جدوجہد رد کر دی تھی اور ترقی پسند بورژوازی اور اس کے سیاسی اداروں سے تعاون منظور کر لیا تھا خود گاندھی کے بارے میں بھی نہایت اچھی رائے قائم کی گئی یہاں تک کہ ۱۹۳۹ء میں جب گاندھی نے بائیں بازو کے اصلاح پسند رہنماؤں کے ماتحت کانگریس ورکنگ کمیٹی میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ سی پی آئی نے کانگریس سوشلسٹ پارٹی کا راستہ کاٹ کر گاندھی کے گروہ کی بھرپور حمایت کی جس کی انہیں اشد ضرورت تھی قیادت کی سطح پر یہ تعاون نچلی سطح پر متبادل طبقاتی سیاست کی نفی کی صورت میں ظاہر ہوا جس کے لیے جدوجہد کے آزاد ادارے بنانے کی ضرورت تھی اس کے برخلاف سی پی آئی کے ارکان اور حمائتیوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ ٹریڈ یونین تنظیموں کے غیر کمیونسٹ قائدین سے کسی تنازعہ میں ملوث نہ ہوں

۱۹۴۲ء میں سی پی آئی سے انگریز مخالف "ہندوستان سے نکل جاؤ" تحریک کی مخالفت کی شکل میں عظیم ترین حماقت سرزد ہوئی تھی۔ جس کی قیادت کانگریس کے ہاتھ میں تھی۔ سی پی آئی کمنیٹرن کی ان ہدایات پر عمل کر رہی تھی کہ سوویت یونین کے دفاع اور جنگ کے اتحاد کے لیے ہر چیز وقف کر دی جائے۔ اس نئی حاصل شدہ قانونیت سے پارٹی کا سرمایہ ضرور بڑھا تھا جب اس کی رکنیت ۱۹۴۲ء میں پانچ ہزار سے بڑھ کر ۱۹۴۵ء میں تیس ہزار اور ۱۹۴۷ء میں ساٹھ ہزار ہو گئی تھی جبکہ کانگریسی قیادت اور کارکن تشدد کا نشانہ بنائے جا رہے تھے سی پی آئی کو اس اقدام کی بہت بڑی سیاسی قیمت ادا کرنی پڑی۔

چینی اور ویت نامی کمیونسٹوں کے مقابلے میں سی پی آئی اپنی ابتدائی کمزوریوں کی وجہ

سے بلاشبہ کمنٹرن اور برطانوی کمیونسٹ پارٹی دونوں کے دباؤ کا شکار رہی لیکن یہ بڑی نادانی کی بات ہوگی کہ اسے محض کمنٹرن کی کٹھ پتلی کا درجہ دے دیا جائے اکثر مختلف نقطۂ آغاز سے ایک جیسے نتائج تک پہنچا گیا اور قائل کرنے کی سمت بھی ہمیشہ یکطرفہ نہیں رہی تھی مثلاً شروع میں سی پی آئی ایم نے ماسکو کو اس بات کا قائل کر دیا تھا کہ وہ ماؤنٹ بیٹن کے منصوبہ آزادی کو قبول کرے لیکن جب اسٹالن نے نہرو کی کانگریس کی جانب گرم جوشی اختیار کرنی شروع کی تو وہ اس سے مایوس ہو چکی تھی اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان کی سماجی تشکیل اور کانگریس کی فطرت کے بارے میں دونوں غیر واضح تھے۔

آزادی کے موقعہ پر ہندوستانی کیمونزم۔ بمبئی، کلکتہ اور مدراس جیسے بڑے شہروں کے علاوہ لازماً مغربی بنگال، کیرالا، بہار، تامل ناڈو اور آندھرا پردیش میں علاقائی قوت کے طور پر موجود تھی اور اس کی قیادت پر اہل شمال اور بنگالی حاوی تھے سی پی آئی کی صحیح سماجی تشکیل ابھی تک اندیشہ و گمان کا موضوع ہے لیکن ۱۹۴۳ء میں اس کے سولہ ہزار ارکین میں سے ۲۹ فی صد مزدور ۳۶ فی صد کسان ۱۱ فی صد طلباء اور بقیہ متوسط طبقے اور دانشوروں سے تعلق رکھتے تھے (قیادت میں دانشوروں کی تعداد زیادہ تھی) خواتین ممبرشپ کی کل تعداد کا صرف پانچ فی صد تھیں۔ چونکہ چینی اور ویت نامی پارٹیوں کے مقابلے میں سی پی آئی دیر سے ایک مرکزی تنظیم کے طور پر ابھری تھی اس لیے اس میں اسٹالن اور ٹراٹسکی کے تنازعہ کا بہت کم اثر پڑا تھا۔ گو کہ یہ ابتداء ہی سے اسٹالن کی حامی تھی مگر اس کے باوجود وہ ٹھوس اندرونی قیادت کی تشکیل میں ناکام رہی تھی پارٹی کی زندگی میں دھڑے بندی امتیازی خصوصیت رہی ہے جسے ہندوستان کی پیچیدہ سماجی، علاقائی ہیئت اور پارٹی کے عوامی محاذوں کی قیادت کی تشکیل میں کارفرما مخصوص مفادات نے مزید الجھا دیا تھا۔

دائیں اور بائیں بازو کی قلابازیاں

۱۹۴۸ء میں سی پی آئی نے اپنے نئے سیکرٹری رانا دیوے کی قیادت میں انتہائی

بائیں بازو کا گمراہ کن راستہ اختیار کر کے کانگریسی حکومت کے خلاف عام ہڑتالوں اور شہری شورشوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ نتیجتاً" کانگریس نے اس کا جواب پارٹی کارکنوں کی گرفتاریوں اور اس کے کام میں متعدد رکاوٹیں کھڑی کر کے دیا۔ اس نئی لائن نے سابقہ حیدرآباد کی نوابی ریاست تلنگانہ میں متضاد کردار ادا کیا جہاں سی پی آئی ۱۹۴۶ء سے غریب کسانوں کی عوامی تحریک کی قیادت کر رہی تھی جو انتہائی ظالم نیم جاگیردارانہ سماج تھا اور زرعی لوٹ کھسوٹ پر مبنی تھا اس تحریک سے چوالیس ہزار مربع میل کا رقبہ اور پینتیس لاکھ عوام متاثر تھے جو مسلح انقلاب پر آمادہ تھے۔ سیکڑوں دیہات میں سوویٹیں قائم ہو چکی تھیں اور کافی بڑی تعداد میں زمیندار اور نظام حیدرآباد کے کارندے نکال باہر کئے گئے تھے یا قتل کر دیئے گئے تھے اس مسئلہ پر ابتدائی دور میں سی پی آئی اور کانگریس کے مابین کوئی دشمنی نہیں تھی۔ کیونکہ کانگریس بھی ہندوستانی اتحاد (یونین) میں حیدرآباد کی شمولیت چاہتی تھی لیکن ۱۹۴۸ء کے بعد تلنگانہ کے کمیونسٹوں نے اپنی چھاپہ مار کارروائی کا ہدف نظام حیدرآباد کی بجائے آزاد ہندوستان کی نئی کانگریس حکومت کو بنا ڈالا۔ ایک سطح پر تو یہ تحریک رانادیوے کی انتہائی بائیں بازو کی لائن سے مطابقت رکھتی تھی لیکن دوسری سطح پر یہ اس شہری انقلابی تحریک سے ٹکراؤ میں بھی آئی جس پر کمیونسٹ قیادت زیادہ زور دیتی تھی۔ ان لوگوں نے روسی انقلاب کی بجائے چینی انقلاب سے تحریک حاصل کی اور اس طرح اس سے بہت پہلے کہ پیکنگ ماسکو کے مقابلے میں اپنا خود ساختہ مارکسی لینن نظریہ قائم کرتا۔ ہندوستان کے اس حصّے میں جو اب آندھرا پردیش کہلاتا ہے، نوزائیدہ ماؤازم جڑیں پکڑ رہا تھا۔

"تلنگانہ کے کمیونسٹوں کی یہ لائن کسانوں سے اُن کے بُعد کا سبب بن گئی۔ یہ کسان کانگریس کو جو حال ہی میں قومی تحریک کی فاتح بن کر نمودار ہوئی تھی۔ قابل نفرین نظام حیدرآباد کے برابر یا اس سے بھی بڑا دشمن سمجھنے کو تیار نہیں تھے جس تحریک کی ابتداء جاگیردار دشمنی سے ہوئی تھی ۱۹۴۸ء میں ہندوستانی ریاست کی فوجی مداخلت کی وجہ سے اس کی نوعیت ہی بدل کر رہ گئی۔

اتنی بڑی اور نسبتاً مقبول طاقت کے خلاف مسلح جدوجہد جاری رکھ سکتے۔ تلنگانہ کے چھاپہ مار گوریلا محض دہشت گرد بن کر رہ گئے تھے نتیجتاً سی پی آئی کی آندھرا شاخ کی رکنیت ۱۹۴۸ میں اکیس ہزار سے کم ہو کر ۱۹۵۰ میں سات ہزار رہ گئی تھی جو قومی سطح پر اس کے زوال کا عکس بھی تھا۔ کیونکہ اسی دور میں پارٹی کی کل رکنیت نواسی ہزار سے گر کر صرف بیس ہزار رہ گئی تھی۔

۱۹۵۱ء میں جب ہندوستان کی آزادی کے بارے میں شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی بالآخر سی پی آئی نے گزشتہ تین سالوں میں اختیار کردہ بائیں بازو کی مہم جو اور SECTARIAN لائن رد کردی اور اس طرح کانگریس کی جانب زیادہ حقیقت پسندانہ اور مثبت رویہ اختیار کرنے کے لیے راہ ہموار کی۔ لہذا پانچویں عشرے میں جب نہرو حکومت سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے دیگر ممالک کی مدد سے ملک کے اقتصادی شعبے کی تعمیر کر رہی تھی اور غیر جانبدار سیاست پر عمل کر رہی تھی تو پہلے تو سی پی آئی اسے سمجھ نہیں پائی اور پھر ان اقدامات کی پرجوش حمایت میں لگ گئی۔ لیکن ان تمام باتوں سے قطع نظر پارٹی اپنی مزدور نوجوان خواتین اور ثقافتی تنظیموں کے ساتھ تبدریج ایک متحد اور کافی بڑی حزب اختلاف بن کر نمودار ہوئی آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس جو رانا دیوے لائن کی وجہ سے مفلوج ہو کر رہ گئی تھی اور مسلسل کانگریس کی ٹریڈ یونین فیڈریشن سے شکست کھا رہی تھی ۱۹۵۶ء میں بحال ہونے لگی اور ۱۹۵۹ء میں اس کی رکنیت چار لاکھ بائیس ہزار سے پانچ لاکھ سینتیس ہزار تک پہنچ گئی گو کہ بعد ازاں وہ اپنی حالت مزید بہتر بنانے میں ناکام رہی۔

۱۹۵۷ء میں ریاست کیرالہ کی اسمبلی کے انتخابات میں سی پی آئی مکمل اکثریت حاصل کر کے بین الاقوامی اخباری شہ سرخیوں کا عنوان بن گئی تھی۔ یہ واقعہ پارٹی کو ایک خالص آئین بردار "تنظیم بنانے کی طرف ایک اہم قدم تھا یہ نئی سوچ آئندہ سال نئے پارٹی آئین اور پروگرام میں ابھر کر سامنے آئی اور ستائیس ماہ بعد بھی متزلزل نہیں ہوئی۔ جب نہرو کے فیصلے پر کیرالہ کی کمیونسٹ حکومت معزول کر کے وہاں صدر راج نافذ کر دیا گیا بسبب یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ

سیکولر تعلیمی اصلاحات کے خلاف مزاحمت کی وجہ سے وہاں امن و امان کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا مگر کمیونسٹوں کا سب سے ممتاز اور دائمی کارنامہ زرعی اصلاحات کا قانون تھا جس نے ایک ایسے علاقے میں مزارعوں کے مفادات کو تحفظ دیا جہاں کے مزارعوں پر ہندوستان کا سب سے پیچیدہ نظام مسلّط تھا۔

۱۹۶۴ء کی تفریق

چھٹے عشرے کے دوران کانگریس کے بارے میں واضح پالیسی کی تعریف کے مسئلہ کے دباؤ سے ۱۹۶۴ء میں جو دراڑیں پڑیں ان کی وجہ سے سی پی آئی کی اکثریت اور طاقت نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا مارکسسٹ کی بنیاد ڈالی۔ حقیقت میں یہ تفریق مقابلتاً زیادہ اہم اختلافات کی وجہ سے نمودار ہوئی تھی جو کہ علاقائی اور سماجی نوعیت کے نہ تھے گو کہ یہ تقسیم بمعہ پارٹی کے مرکز کی کمزوریوں کے ہندوستانی کمیونزم میں مسلسل تفرقہ کی فضا قائم رکھتی رہی۔ مگر آخری دراڑ واضح طور پر عمودی کردار رکھتی تھی۔ اور سیاسی نظریاتی اختلافات سے نمودار ہوئی تھی یہ صحیح ہے کہ اصل تفریق روسی چینی جھگڑے کی وجہ سے وجود میں آئی اور سی پی آئی کا ایک دھڑا ۱۹۶۲ء کی ہندوستانی چینی جنگ کے دوران قومی شاونزم میں بہہ گیا تھا لیکن سی پی آئی ایم کے زعماء گو کہ اس قسم کے رجحانات کی مزاحمت کرتے رہے تھے مگر انہوں نے اپنے آپ کو پیکنگ کی عمومی حیثیت سے دور رکھا تھا اور چینی کمیونسٹ پارٹی جلد ہی مایوس ہو کر نکسلائٹ تحریک کی حمایت کرنے لگی۔ چینی روسی جھگڑے کی اصل اہمیت یہ ہے کہ بین الاقوامی طور پر اسٹالن کا سخت گیر مرکزیت کا رجحان کمزور پڑ گیا اور سی پی آئی ایم ماسکو کی تسلیم نہ کئے جانے کے خوف سے آزاد ہو گئی۔

ہندوستانی مناقشہ میں اصل جھگڑا سیاست کے آلاتی نظریہ (INSTRUMENTAVST CONCEPTION OF POLITICS) پر اتفاق کرتے ہوئے متحدہ محاذوں کا سوال تھا سی پی آئی ایم کانگریس کو بورژوا اور زمیندار طبقاتی حکومت کا نمائندہ سمجھتی تھی جس کی قیادت

قومی بورژوازی بیرونی سرمایے کی مدد سے کررہی تھی جب کہ سی پی آئی کی اکثریت اسے مکمل طور پر قومی بورژوازی سمجھتی تھی جس پہ بڑی بورژوازی کا زیادہ اثر تھا مگر اس کے معنی یہ نہ تھے۔ کہ وہ لازماً اس کی قیادت بھی کررہی تھی۔ یہ کہنا پڑتا ہے کہ موخر الذکر تجزیہ ہندوستانی بورژوازی کی قومی اور آزاد حیثیت کا مقابلتاً زیادہ حقیقی شعور پیش کرتا ہے۔ دوسری طرف سی پی ایم کا موقف انجیس اس بات کی زیادہ آزادی فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنی ضروریات کے مطابق بورژوازی کے ایک خاص حلقے کو ترقی پسند قرار دے سکے کبھی چھوٹی بورژوازی کو کے ایک خاص حصّے کو ترقی پسند قرار دے سکے۔ کبھی چھوٹی بورژوازی کو اور کبھی علاقائی بورژوازی کو اس طرح کانگریس کے علاوہ دوسری بورژوا جماعتوں سے اتحاد کی بنیاد ہموار کی گئی۔ اس انتخابی قدم کی مدد سے سی پی ایم نے بعض ریاستوں (کیرالہ۔ مغربی بنگال) میں اقتدار حاصل کیا اور دیگر علاقوں میں اپنے اثر و نفوذ میں اضافہ کیا اور نئی دہلی سے براہ راست مقابلے سے اجتناب کیا۔ جب کہ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۷ء تک سی پی آئی کانگریس کی بھرپور حمایت کی تدبیر پہ گامزن رہی جسے وہ جن سنگھی فرقہ پرستوں، اجارہ دار بورژوازی کی سوانتر اپارٹی اور خود کانگریس میں رجعتی قوتوں کے مقابلے میں ترقی پسند محاذ کا جوہر قرار دیتی تھی۔ اس کے برعکس سی پی ایم نے اپنی مخالفت کی پالیسی جاری رکھی سوائے بعض مراحل (۱۹۶۹-۷۰ء) کے جب اس نے عمل میں اپنی بعض پالیسیوں کو نرم رکھا ۱۹۷۵ء میں دونوں پارٹیوں کو مسز اندرا گاندھی کی جانب سے ہنگامی حالات کے اعلان سے سخت دھچکہ لگا اور دونوں کانگریس کے اس دوسالہ دورِ حکومت میں کوئی ممتاز کارنامہ سرانجام نہ دے سکیں لیکن اس سے پہلے کہ ہم سی پی آئی اور سی پی ایم کے بعد کے ارتقاء پر بحث کریں۔ خصوصاً علاقائی اقتدار کے بارے میں ہمیں بائیں بازو کی ایک اور دراڑ کو بھی دیکھنا ہوگا جو اگیری چھٹے عشرے میں اپنے ساتھ سی پی ایم کا ایک بڑا حصّہ اپنے ساتھ بہا کرے گی۔

نکسلائٹ تحریک کا عروج اور زوال

۱۹۶۷-۷۲ء کے دوران نکسلائٹ تحریک کی پیدائش کے پیچھے بہت سے عناصر کارفرما

تھے چھٹے عشرے کے وسط میں ملکی معیشت کا زوال، اجتماعی ہنگاموں کا سر اٹھانا، پارٹی کی ضرورت سے زیادہ مصالحانہ روش کارکنوں کا عدم اطمینان، دنیا بھر میں نوجوانوں میں انقلابی ابھار، چینی روسی جھگڑا، چین کا عالمی انقلاب کے زیادہ ریڈیکل مرکز ہونے کا تصور جسے ثقافتی انقلاب کے بارے میں عمومی غلط فہمیوں سے زیادہ تقویت ملی تھی۔ مغربی بنگال میں نکسل باڑی قبائلی شورش جس سے تحریک کو یہ نام ملا تھا آئندہ تین سالوں میں کئی دیہاتی علاقوں خصوصاً آندھرا پردیش میں سری کاکلام تک پھیل گئی تھی جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ آندھرا پردیش میں ایک قسم کی ماؤسٹ وراثت موجود تھی اور اسی لیے یہ ہرگز تعجب انگیز نہیں ہے کہ صرف ۱۹۶۸ء میں اس ریاست کے سولہ ہزار سی پی ایم ارکان میں سے تین ہزار پارٹی چھوڑ کر نکسل باڑیوں سے جا ملے تھے جب کہ چار ہزار ارکان کچھ عرصہ تک اپنی وفاداریوں کے بارے میں متذبذب رہے۔ مغربی بنگال کے علاوہ یہ تحریک کہیں اور اپنی جڑیں نہیں گاڑ سکی تھی۔ اتر پردیش۔ بہار، پنجاب اور کشمیر جہاں سی پی ایم خود ہی کمزور تھی۔ پارٹی چھوڑنے والوں کی وجہ سے پارٹی پر زیادہ اثر ہوا تھا کشمیر میں سی پی ایم کا یونٹ بالکل ختم ہو گیا تھا کیرالا میں نکسلائٹ گروہ نمودار ہو گئے تھے لیکن وہ زیادہ مؤثر نہیں ہو سکے تھے۔

ان یونٹوں میں سے بہت سے آج تک اپنی جداگانہ پہچان اور لائحہ عمل قائم رکھنے میں کامیاب رہے تھے مگر ۱۹۶۹ء کے وسط تک کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا مارکسسٹ لیننسٹ کے قیام کا اعلان کر دیا گیا جسے چین کی رسمی حمایت حاصل تھی اور یہ کرشمہ چارو موجمدار اس کے قائد تھے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ سی پی آئی (ایم ایل) جسے بجا طور پر پارٹی کی بجائے ایک تحریک قرار دیا جا سکتا ہے اور یہ کہ موجمدار کی ذاتی قیادت اور تنظیمی عمل کو زیادہ پذیرائی نصیب نہیں ہوئی ان کی سیاسی لائن کہ "طبقاتی دشمنوں کو ختم کر دو" نے اس تحریک پر فیصلہ کن اثر چھوڑا ہے اس لائن کے پس منظر میں یہ تجربہ کارفرما تھا کہ ہندوستانی معیشت نیم جاگیردارانہ اور نیم استعماری ہے اور یہ کہ ہندوستانی ریاست بڑے زمینداروں، جاگیرداروں، راجاؤں اور نوکر شاہی دلال بورژوازی

کی آلہ کار ہے معیشت کا مستقل بحران از خود ایک ایسے سماجی بحران کو جنم دیتا ہے جو انقلابی صورتحال کا پیش خیمہ ہے جس کے نتیجے میں عوام میں اعلیٰ درجے کا انقلابی شعور وجود میں آتا ہے جسے صرف اُوپر لانے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ موجودہ ریاست کسی بھی معنی میں ہرگز لوڑ وا جمہوریت اور پھر ۱۹۷۰ء میں اس نے اپنی توجہ کلکتہ کے شہری تشدد پر مرکوز کردی ابتداء کے متوسط اور اعلیٰ متوسط انقلابی طلباء کے لشکر کی بجائے اب کنگلے آوارہ (لمپن پرولتاریہ) لوگوں میں سے نئی صفیں نمودار ہوئیں جن کی وجہ سے شہری متوسط میں نکسل پارٹیوں کی رہی سہی حمایت بھی ختم ہو کر رہ گئی ۱۹۷۲ء تک تحریک خود اپنے تضادات اور مغربی بنگال میں سی پی ایم حکومت کے بوجھ تلے دب کر ختم ہو چکی تھی، جو خود کو ایک "ذمہ دار" پارٹی کے روپ میں پیش کرنے کے لیے بےچین تھی

آج نکسل باڑی وراثت کے بارے میں بہت ابہام پایا جاتا ہے ۱۹۸۳ء کی ایک خفیہ حکومتی رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں ابھی تک ۳۵ سے ۴۰ ایسے گروہ موجود ہیں جو خود کو ایم ایل روایات کا پابند قرار دیتے ہیں ان گروہوں سے تقریباً ۳۵ ہزار افراد منسلک ہیں اس مجموعی تعداد کا ۷۵ فی صد حصّہ ان آٹھ گروہوں سے وابستہ ہے جو آندھرا پردیش، مغربی بنگال اور بہار میں سرگرم عمل ہیں، جبکہ دیگر گروہ مہاراشٹر کے قبائلی علاقے، مدھیا پردیش اور اڑیسہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاہم معاشی ترقی اور ماؤ ازم کی بین الاقوامی لہر کے غیر شاندار طریقہ سے زائل ہونے کی وجہ سے ان مراکز کی تجدید کا امکان بہت کم ہے جو کہ خود بھی "ناقابل اتحاد" "انتخابی" عوامی جدوجہد اور نیچی چھپی چھاپہ مار لڑائیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

بایاں بازو اقتدار میں

۱۹۶۴ء میں اصل کمیونسٹ دھارے کی دو پارٹیوں میں سے سی پی آئی بڑی پارٹی کی شکل میں نمودار ہوئی ماضی کے عوامی محاذوں اور تنظیموں میں بھی اکثریت اس کے ساتھ تھی لیکن ۱۹۶۷ء میں دونوں پارٹیوں نے اپنے آپ کو مغربی بنگال اور کیرالہ کی حکومت کے جھولے میں جُتا ہوا پایا جب آٹھ ریاستوں میں غیر کانگریسی حکومتیں برسرِ اقتدار آگئیں یہ ڈانواں ڈول اتحاد زیادہ عرصہ تک قائم

نہ رہ سکا ۱۹۶۹ء کے آخر میں یہ اتحاد ختم ہوگیا کیرالہ میں سی پی آئی کانگریس کی مدد سے اقتدار میں باقی رہی جب کہ مغربی بنگال میں سی پی آئی مختلف مخلوط حکومتوں میں کبھی بھی ایک چھوٹے اور زوال پذیر حلیف سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی درحقیقت مارچ سے نومبر ۱۹۶۷ء تک سی پی ایم کی پہلی حکومت ایک اتحاد تھا جس میں سی پی آئی اور بائیں بازو کے دیگر چھوٹے گروہوں کے ساتھ بنگال کی کانگریس بھی شامل تھی جو ریاستی اسمبلی میں سی پی ایم کی ۴۳ نشستوں کے مقابلے میں ۳۴ نشستیں رکھتی تھی بنگال کی کانگریس نے اس حکومت کی حمایت سے دستبردار ہوکر ایک مدت کے لیے یہاں صدر راج بھی نافذ کروادیا تھا۔ ۱۹۶۹ء میں نئے انتخابات منعقد ہوئے جس کے نتیجہ میں سی پی ایم کو جسے صرف ۱۹.۰۶ فی صد ووٹ ملے تھے ۸۰ نشستیں حاصل ہوگئیں جب کہ کانگریس جسے ۴۰.۴ فی صد ووٹ ملے تھے صرف ۵۵ نشستیں حاصل کر پائی مکمل وزارتوں کی شورش اور پارلیمانی جماعتوں کے درمیان شدید اختلافات کی وجہ سے ۱۹۷۰ء میں مزید دو سال کے لیے صدر راج نافذ کر دیا گیا۔ جب ۱۹۷۲ء میں انتخابات ہوئے تو پاکستانی فوج کی بنگلہ دیش میں شکست پر مبنی قومی جوش وخروش کی وجہ سے کانگریس کو ۴۹ فی صد ووٹ حاصل کرنے میں مدد ملی تھی اور اُسے ۲۱۶ نشستیں حاصل ہوگئی تھیں۔ لیکن سی پی ایم کے ووٹوں کی تعداد بھی تیزی سے بڑھ کر ۲۷.۵ فی صد ہوگئی جس کے نتیجے میں اس ریاست میں دو جماعتوں کے غلبے کی کیفیت نمودار ہوئی جو ابھی تک موجود ہے۔ ۱۹۷۷ء میں ایمرجنسی کے خاتمے پر کانگریس کا زوال سی پی ایم کو دوبارہ پہلی پوزیشن میں لے گیا جو ہندوستان کے باقی علاقوں میں اس کی صورت حال کے برعکس ابھی تک برقرار ہے حالانکہ ۱۹۸۲ء میں کانگریس ۳۶ فی صد ووٹ لے کر بڑے شاندار طریقے سے دوبارہ نمودار ہوئی ہے لیکن اُسے ۲۹۶ نشستوں کی ریاستی اسمبلی میں صرف ۴۹ نشستیں مل پائی ہیں جب کہ سی پی ایم ۳۸ فی صد ووٹ لے کر ۱۷۴ نشستوں کی مکمل اکثریت حاصل کر کے میدان میں ڈٹی ہوئی ہے بقیہ ہندوستان کے مقابلے میں اس بڑی مختلف نوعیت کے رجحان کی توضیح لازمی ہو جاتی ہے۔

سیلیگ ہیریسن کی رائے میں سی پی ایم اور سی پی آئی جہاں علاقائی قوم پرست سیاست کی امین ہو کر سامنے آئی ہیں وہیں وہ اپنی جڑیں کاٹنے میں کامیاب رہے ہیں۔ جہاں چینی اور ویت نامی کمیونسٹ قومی تحریک آزادی کو بہت نامور اور عوام میں تسلیم شدہ رہنما مہیا کرتے نہیں ہے اس لیے اس کی عوامی حمایت کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ مسلح جدوجہد، آزاد شدہ علاقہ اور دیہی علاقوں کی جانب سے شہروں کا گھیراؤ آج کا اولین تقاضہ بن چکے ہیں۔

موجمدار کی چن چن کر قتل کرنے کی پالیسی چنگاری بن کر جنگل کی آگ میں تبدیل ہو گئی جس کے دوران یہ ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی کہ اس سے کچھ وقتی اقدام اور نعرے بھی منسلک کیے جائیں زمین کے سوال پر دیہاتی عوام کو شعور دیا جائے اور انھیں جنگ میں شریک کیا جائے اس کے برعکس خفیہ ٹولوں کے تشدد نے عوام میں صبر کے ساتھ انقلابی کام اور باقاعدہ ہراول تنظیم کے سیاسی عمل کی جگہ لے لی تھی جہاں تک کہ وہ نکسلائٹ جو کسانوں اور قبائلی لوگوں کے مسائل سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے وہ بھی موجمدار کا سامنا نہ کر سکے کیونکہ اس کا لائحہ عمل ان تمام گروہوں کے عمومی شعور کی منطقیت سے مطابقت رکھتا تھا۔

چین اور ویت نام جو موجمدار کے لیے ماڈل کی حیثیت رکھتے تھے میں کمیونسٹوں کو ایک ایسے مرکزی سیاسی اقتدار اور جبر و تشدد کے اداروں کا سامنا کرنا پڑا تھا جو ہندوستان کے مقابلے میں بہت کمزور تھے اس کے علاوہ یہ کمیونسٹ پارٹیاں دوسری عالمی جنگ کے دوران اپنی طبقاتی اور قومی جدوجہد کو جوڑتے ہوئے سیاسی طور پر بہت طاقت ور ہو چکی تھیں اور انہوں نے بجا طور پر اپنی قوم کی قیادت حاصل کر لی تھی جب کہ ان کے ہندوستانی ساتھی کانگریس سے ایسی قیادت چھین لینے کے صرف خواب ہی دیکھ سکتے تھے۔ علاوہ ازیں چین اور ویت نام میں شہری آبادی بہت کم تھی زراعت پسماندہ تھی اور اس حقیقت نے ان کے مخصوص راستہ کے تعین کا فیصلہ کیا تھا جب کہ ہندوستانی زراعت کی تیز رفتار ترقی بالکل مختلف حالات پیدا کر رہی تھی جہاں صنعت اور شہری معیشت مقابلتاً زیادہ مرکزی کردار ادا کر رہے تھے اگر دیہاتی اور شہری

پرولتاریہ کی طاقت کو زیادہ سیاسی اظہار کا موقع فراہم کیا جاتا تو ایک ایسی حکمت عملی اپنائی جا سکتی تھی جس کی بنیاد مزدور طبقے کی جدوجہد اور تنظیم سازی کے طریقوں پر ہوتی۔ حالت یہ تھی کہ ایک "انقلابی ملکرٹی" بکمیونزم کے اصل دھارے سے کٹ کر پہلے وہی چھاپہ مار سرگرمیوں میں گم ہو گئے میں کامیاب رہے وہیں ہندوستانی کمیونسٹ استعمار مخالف تحریک کو صحیح موقع پر اپنے ہاتھوں میں لینے میں ناکام رہے اور انہوں نے پہل بورژوا قائدین نہرو اور گاندھی کے قدموں میں ڈال دی تھی اسی وجہ سے انہیں علاقائی ذیلی سیاست پر قناعت کرنی پڑی تھی تاکہ وہ اپنے اصل اڈوں میں مسلسل موجود رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کیرالا اور آندھرا میں تلگو اور ملیالم بولنے والے علاقوں کی حمایت میں سی پی آئی کے ابتدائی کردار کی وجہ سے کثیر الطبقاتی جدوجہد میں اس کی مقبولیت بلاشبہ بڑھ گئی تھی لیکن ان دونوں ریاستوں میں بعد کے ارتقاء سے ظاہر ہوا کہ دوسرے عناصر بھی وہاں ہندوستانی کمیونزم کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے کارفرما تھے اس طرح آندھرا میں سی پی آئی کو دو طاقتور مالک کسان ذاتوں میں سے ایک یعنی کما کی کافی حمایت حاصل ہو گئی تھی لیکن بعد میں اسے سماجی سوال کو پس پشت ڈالنے کی قیمت ادا کرنی پڑی جب اس کی مقامی مقبولیت پر کنگوار تلگو ریشم نے قبضہ کر لیا جب کہ کیرالہ میں نچلی ذات اور نچلے طبقے کے غذوا لوگوں میں کمیونسٹ حمایت قائم رہی اور یہاں ریاستوں کی لسانی تقسیم کے بعد بھی پی سی آئی اور پی سی ایم کا مرکز قائم رہا تھا۔ تامل ناڈو، مہاراشٹر، کرناٹکا اور گجرات جو سب غیر ہندی علاقے ہیں کی مثال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صرف مخصوص علاقائیت کی عمومی حمایت کی پالیسی کمیونسٹ ترقی کی ہرگز ضمانت نہیں دے سکتی۔

درحقیقت مغربی بنگال اور کیرالہ کئی فیصلہ کن مشترک مماثلتیں رکھتے ہیں جو انہیں ہندوستان کی دیگر ریاستوں سے ممتاز کرتے ہیں دونوں ریاستیں انتہائی گنجان آباد ہیں اور یہاں کا زرعی ڈھانچہ اور طبقاتی تفریق انتہائی پیچیدہ شکل میں موجود ہیں۔ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ حقوق مزارعہ کو مضبوط کرانے میں کمیونسٹوں کی کامیابی سے ذات پات کو تحریک ملی جس سے

فرقہ واریت میں ابھار واقع ہوا اور بالآخر سی پی آئی، سی پی ایم اور کانگریس کی غالب حیثیت کو اس ریاست میں دھچکہ پہنچا تھا۔ مغربی بنگال میں برطانیہ کے قائم کردہ بندوبست استمراری (PERMANENT SETTLEMENT) نے ملکیت زمین کے متعدد درمیان والے پرت

قائم کر دیئے تھے یہ صورت حال متعدد بار تقسیم صوبہ، قحط پڑنے اور موجودہ بنگلہ دیش سے ہجرت کی وجہ سے مزید پیچیدہ ہو گئی ہے۔

دونوں ریاستوں میں تعلیم یافتہ عوام کی بڑی تعداد اور بڑے پیمانے پر سند یافتہ بیروزگاروں کی موجودگی نے علاقائی شناخت کا گہرا احساس پیدا کر دیا ہے علاوہ ازیں بنگال میں برطانوی اثر سب سے پہلے اور سب سے زیادہ گہرائی تک نفوذ کر چکا تھا اور یہاں برہمنی ہندومت کو تین قومی مذاہب۔ بدھ مت، اسلام اور عیسائیت کے علاوہ ہندومت کے غیر قدامت پسند دھاروں سے مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ جنہوں نے ممتاز بنگالی ثقافت، ادب اور اخلاق کی تشکیل کی تھی خصوصاً مغربی بنگال میں مقامی شکایات کی ایک لمبی تاریخ ہے یہاں ثقافتی اقتصادی اور سیاسی زوال متقابلتاً کچھ زیادہ ہی اذیت ناک محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ انیسویں اور بیسویں صدی کے ابتدائی عرصہ میں یہ ثقافتی لحاظ سے بہت ترقی یافتہ اور تحریک آزادی کی قیادت میں متقابلتاً بہت آگے تھا یہاں تک کہ گاندھی نے تحریک آزادی کا مرکز ثقل شمال کو منتقل کر دیا تھا جب گاندھی نے ہندی زبان کو قومی تحریک کے اتحاد کا ذریعہ قرار دیا تو بنگالیوں کی ناراضگی کو اس قدر تقویت ملی کہ اس کے اثرات خود کانگریس تک پہنچ گئے بنگالی سیاسی زندگی کی غالب صفت احتجاج رہا ہے جس کا اظہار دہشت پسندی کی طاقت ور روایت بالادستی کو انقلابیوں کی طرح رد کرنا اور الیکشن میں مزاحمت سے ہوتا ہے کمیونزم مغربی بنگال کی نظریاتی اور ثقافتی خود شناختی کے اظہار کا ذریعہ رہا ہے اس کو چلانے والی طاقت منتشر، غیر مطمئن شہروں میں رہنے والے تعلیم یافتہ اور متوسط طبقے کے لوگ ہیں۔

ہندومت کی نئی تعریف

اگر ہم ہندوستان کی سیاست میں وسیع پیمانہ پر ہندومت کے اثر کا مطالعہ کریں۔ تو بنگالی اور کیرالوی کمیونزم کا علاقائی جڑیں پکڑنا مزید واضح ہوجاتا ہے بلاشبہ ہندومت "تمدن ساز" اعمال کا ایک قدیم سلسلہ ہے لیکن "ہندو" کی اصطلاح پہلی مرتبہ انگریزوں کی جانب سے استعمال کی گئی۔ ہندومت کا اصل امتیاز ہمیشہ سے قدیم ذات پات کا نظام تقسیم ہے یہ ایک ایسی مجموعاتی اور قبول کرنے والی ہیئت ہے جو دباؤ کے نتیجے میں بہت سی ذاتوں اور ذیلی ذاتوں کو اپنے اندر پنپنے دیتی ہے اور ذات پات کے کٹر مجموعے ہیں تحرک کو کافی حد تک برداشت کرتی ہے اس طرح یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ اپنی ثقافتی اور شہری زندگی کو قائم رکھنے والے اتحاد کی کمزوری کے خدشے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سیاسی میدان بہت سے حملہ آوروں کے لیے خالی کردیا گیا۔ جن میں مرکزی مغل اقتدار بھی شامل تھا یہ بات ہرگز تعجب انگیز نہیں ہے کہ روایتی طور پر ہندومت علامتی خداؤں کے وسیع تر ہونے والے مندر کا مالک ہے اور یہ ایک ایسا غیرمادی فلسفہ ہے۔ جو اس قدر ڈھیلا ڈھالا ہے کہ اس کی ترتیب و تدوین کی تمام کوششیں ناکام رہتی ہیں برطانوی استعماری راج کی جانب سے ہندومت کی "تجدید" سے اس کی تمدن ساز بے ہوشی کو پہلی مرتبہ ہلاکت خیز خطرہ درپیش ہوا تھا جس نے ہندو شناخت اور ہندومت کی ایسی نئی تعریف کا سلسلہ کھڑا کردیا۔ جو بھگوت گیتا جیسے نوشتوں کے گرد قائم ہوا اور ایک ایسا کٹر مذہبی نظریہ بنے اور سیاسی قوم پرستی کی خدمت گذاری کرسکے بلاشبہ گاندھی پہلا شخص نہیں تھا جس نے اس طاقت کو سمجھ لیا تھا۔ لیکن اس نے ایک ایسی قوم پرستی کو ابھارنے میں مدد دی جس پر شمالی ہندوستان کی چھاپ تھی۔ بڑے لمبے عرصے تک کانگریس آئیڈیالوجی نے اس ہندو مرکز کے اردگرد بہت سے متضاد نظریات کو سمیٹے رکھا جس میں مقبول عام فلاح و بہبود لبرل روشن خیالی اور مسلم ملائیت کے رجحانات تک موجود رہیں ہیں اقلیتی مرکز اور برہمن کے درمیان یہ اتحاد اس غیرمعمولی مذہبی نظریاتی مکڑی کے جالے کا پرتو تھا جس نے کانگریسی

حکومت کے اقتدار کو اصل بنیاد فراہم کردی تھی یہاں تک کہ درمیانی ذاتوں اور فرقوں نے سر اٹھا کر ان تشکیلی تانوں بانوں پر بوجھ ڈالنا شروع کر دیا۔ اس طرح کانگریس اور دائیں بازو کی جن سنگھ جیسی تنظیموں نے ہندی پٹی کو اپنی نظریاتی جدوجہد کا میدان بنا ڈالا لیکن ایک ایسا بایاں بازو جو انتخابی مقابلوں کی حکمت عملی سے بندھ چکا ہو اور تعداد کے اعتبار سے اہم درمیانی ذاتوں کی سپردگی میں جانے کے لیے تیار ہو اپنے مارکسی نظریے کی وجہ سے اپاہج ہو کر رہ جاتا ہے بے شک اس نے اس نظریے کو کتنا ہی مسخ کیوں نہ کر ڈالا ہو۔

غیر ہندی پٹی میں ہندو مت کی گاندھی کی جانب سے کی جانے والی توجیہ زیادہ پذیرائی حاصل نہ کر پائی اور علاقائی شناختوں نے ہندی زبان کے مقابلے میں اپنے آپ کو مزید طاقتور بنا لیا۔ کیرالہ میں تو چالیس فی صد آبادی مسلمان یا عیسائی ہے جب کہ مغربی بنگال میں ہندوؤں کا مذہبی لگاؤ اس حقیقت کی وجہ سے کم ہو گیا تھا کہ بنگالیوں کی اکثریت بحیثیت لسانی ثقافتی اکائی کے مسلمان ہے یہ باتیں اس وضاحت میں مدد دیتی ہیں کہ غیر ہندی پٹی میں یہ دو کمیونسٹ پارٹیاں کیوں کر مقابلتاً محفوظ بنیاد قائم کرنے میں کامیاب ہیں کیرالہ میں جس کی آبادی ۱۹۸۱ء میں دو کروڑ پچپن لاکھ تھی اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ازھاوا جو نایہ، عیسائی اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر اکثریت رکھتا ہے اور کمیونسٹوں کی حمایت کی بنیاد ہے ایک زمانہ میں ازھاوا کو سب سے نچلی سیڑھی پہ روک لیا جاتا تھا اور وہ تاڑی جمع کرنے کے علاوہ زرعی اور صنعتی مزدور تھے مگر آزادی کے بعد انہوں نے اقتصادی اور سیاسی فائدے حاصل کر لیے ہیں اب تعداد میں کافی بڑا ازھاوا متوسط طبقہ موجود ہے۔ جو دوسرے مظلوم طبقوں کے ساتھ سی پی آئی اور سی پی ایم کے حمایتی ہیں۔ اسی طرح مغربی بنگال میں سی پی ایم کا اصل ------
مرکز بھدرالوک اور سابقہ مشرقی پاکستان کے اوپر آنے والے مہاجرین ہیں نہ کہ مزدور اور بے زمین کسانوں میں مجموعی طور پر سی پی ایم دیہی علاقوں میں مضبوط ہو رہی ہے اور شہری علاقوں میں اس کا اثر نسبتاً کم ہو رہا ہے۔ سی پی ایم کی قیادت میں بائیں بازو کے محاذ کی حکومت نے سرکاری ملازمین اور پولیس کو بھی ٹریڈ یونین بنانے کا اختیار دے دیا ہے جو اس کی خود کو

طاقتور حکومتی مشینری بنانے کے ہدف سے مطابقت رکھتا ہے ۔ لیکن وہ شہری ٹرانسپورٹ
توانائی اور طبی سہولتوں وغیرہ کی حالت بہتر بنانے میں ناکام رہی ہے ۔ دیہی علاقوں
میں اس کے زرعی پروگرام کی وجہ سے وہ اب تک خوشحال مالک کسان (Kulak)
کی سطح پر حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے لیکن اُس نے وہاں ابھی تک کوئی
سنجیدہ طبقاتی ٹکراؤ یا قطبیت (Polarisation) کی صورتحال پیدا نہیں
کی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بے زمین مزدوروں کے لئے کم از کم اُجرت متعین نہیں
کی ہے ۔ اور نہ ہی زرعی ٹیکس عائد کیا ہے جس سے کام کے بدلے خوراک کے پروگرام کا
خرچ نکالا جا سکے اور نہ ہی اس نے زرعی اور نیم زرعی علاقوں میں مدارس کے قیام کے
لئے کوئی رقم خرچ کی ہے ۔ ۸۱ - ۱۹۷۷ء کی مدت میں اسکی سب سے مثبت کامیابی
وہ تھی جب اس نے بیس لاکھ برگرداروں یا بٹائی پر فصل اگانے والے کاشتکاروں میں
سے پچاس فیصد کو زمین پر مالکانہ حقوق دینے کا فیصلہ کیا تھا ۔ لیکن یہ پروگرام بھی
روکنا پڑ گیا جب دیہاتی امیر کسانوں کی مخالفت اتنی شدت اختیار کر گئی تھی کہ اسے
نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ دوسری ریاستوں کی مایوس کن پالیسی کے مقابلے میں
مغربی بنگال کی صورتحال کتنی بھی بہتر کیوں نہ ہو لیکن سی پی ایم کی حکومت یہاں زرعی
پالیسی میں ہیئتی تبدیلی نہیں لانا چاہتی بلکہ اسکی زرعی بنیاد کو بلا امتیاز بڑھانا چاہتی
ہے اور اسے مالی امداد ، بیج کھاد ، اور دوسری ضروریات فراہم کر رہی ہے ۔

سی پی ایم کی چار کروڑ عوام پر حکومت ظاہر ہے بلدیاتی یا علاقائی سوشلزم
جو لندن یا ایمیلیا رومانا میں قائم ہوا ، سے مختلف ہے لیکن بعض باتوں کا موازنہ
مفید ہوگا ۔ ان میں سب سے نمایاں مشترک بات یہ ہے کہ سی پی ایم بھی مالی خودمختاری
بڑھانے کے لئے مزید آئینی اختیارات حاصل کرنا چاہتی ہے تاکہ وہ خود ریونیو جمع
کر پائے ۔ سی پی ایم کو دیہی آبادی کے بڑے ہجوم کا سامنا ہے اور وہ یہ چاہتی

ہے کہ اسکو عوام کی اتنی بڑی طبقاتی حمایت، حاصل ہوسکتی ہے ہوجائے۔ وہ یہ کام اُسی طریقے سے کر رہی ہے جیسے پی سی آئی یا لونگسٹون کی جی ایل سی کا ہدف رہا ہے تاکہ مزدوروں اور "نئے متوسط طبقے" کی حمایت حاصل رہے اور اس لئے مہنگی بجٹ پالیسی کے ذریعے مرکز سے مسلسل تنازعہ چلتا رہے۔ دوسری طرف سی پی ایم جس میں نوکر شاہانہ طور طریقے بڑھتے جا رہے ہیں۔ یورپی کمیونسٹ (یورو کمیونسٹ) "ترقی یافتہ جمہوریت" کے تخیلات میں بھی شریک نہیں ہے، جو اسے سوشلزم کے لئے پل کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں نہ ہی سی پی ایم نچلی ترین سطح (
پر جمہوریت یا متبادل اداروں کے قیام سے اتفاق رکھتی ہے۔ اُس نے اپنے پدر شاہی د) رویہ کے مطابق ۱۹۷۷ء میں فوراً پنچایت کا انتظامی طریقہ اپنا لیا تھا جس کے ذریعے دیہات کی حکمران اقلیت کا مزید تعاون حاصل کیا جا سکے۔

جس طرح بعض بائیں بازو والے اسے چلی کے متحد عوام (یونی داد پاپولر) سے تشبیہ دیتے ہیں قطعی نامناسب ہے۔ آلینڈے کی حکومت اور پارٹی طبقاتی جدوجہد کے بارے میں بہت مخلص تھے اور ایسی اصلاحات کے پروگرام پر عمل کر رہے تھے جس کی وجہ سے مظلوموں میں انکی حمایت مزید گہری ہوجاتی۔ وہ اس لئے ناکام ہوئے تھے کہ انہوں نے چلی کی ریاست اور معاشرے میں انقلاب کے فوری بعد شروع ہونے والے فیصلہ کن مقابلے کے لئے کافی تیاری نہیں کی تھی۔ جبکہ اسکے مقابلے میں سی پی ایم اتنی مخلص نہیں ہے۔ وہ تو یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ وہ کانگریس کے مقابلے میں علاقائی مفادات کی بہتر نگرانی کر سکتی ہے۔ یہ بات ہرگز حیرت انگیز نہیں ہے کہ اُس نے اپنے انتخابی وعدوں سے غداری کرتے ہوئے مغربی بنگال کی مزدور طاقت پر کڑی گرفت نافذ کردی ہے جو اسکی حکومتی اور نجی (بشمول عالمی)

علاقائی سرمایہ کاری کی کوشش کا حصہ ہے۔ چلی کی سوشلسٹ پارٹی کے برخلاف جس کی ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۳ء کے درمیان پرولتاری حمایت میں اضافہ ہوگیا تھا حالیہ عرصے میں سی پی ایم کانگریس کے مقابلہ میں خصوصاً شہروں کے مزدور اکثریتی علاقوں میں اپنی حمایت کھو رہی ہے۔

ہندوستانی کمیونزم کا مستقبل

آج ہندوستانی بائیں بازو میں سی پی ایم سب زیادہ طاقتور ہے۔ اسکی موجودہ رکنیت ۳۶۷,۰۰۰ ہے لیکن اس کا ۷۰ فیصد مغربی بنگال اور کیرالہ میں مرکوز ہے، جہاں ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۵ء تک اس کی رکنیت ۴۳,۳۰۰ سے ۱۳۶,۹۸۰ ہو گئی تھی۔ جبکہ پوری ہندی پٹی میں اسکی رکنیت صرف ۲۵,۰۰۰ ہے اور آجکل ہر دس نئے اراکین میں سے سات بنگالی ہوتے ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں سی پی آئی عددی اعتبار سے مضبوط تھی مگر اب اسکی رکنیت تیزی سے روبہ زوال ہے۔ ہندوستان میں ایمرجنسی کے دوران یہ ۵۴۷,۰۰۰ سے کم ہوکر ۱۹۸۳ء میں ۴۶۴,۴۲۹ رہ گئی اور یہ رجحان جاری ہے۔ دونوں جماعتیں اور اُن سے متعلقہ مزدور یونینیں کانگریس کے مقابلہ میں صنعتی مزدوروں کے میدان میں پسپا ہو رہی ہیں اور وہ بھی کھاتے پیتے کسان اور درمیانی ذاتوں کے اجتماعی دباؤ کا اُسی طرح شکار ہیں جیسا کہ بورژوا جماعتیں اپنے طبقہ کی اسیر ہیں۔

پروگرام کی سطح پر سی پی ایم اور سی پی آئی میں اب کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے اور اُنکی انتخابی تدابیر "وسیع بائیں اور جمہوری" تخیل سے جڑی ہوئی ہیں یا جیسا کہ سی پی ایم اُسے "بائیں اور سیکولر" محاذ کہنا پسند کرتی ہے جبکہ اختلافات صرف ثانوی معاملات میں ہیں دوسری طرف ہنگامی حالات کے تجربات نے سی پی آئی کی اکثریت کو کانگریس مخالف رویہ اپنانے پر مجبور کر دیا تھا جنہوں نے ڈانگے

کی شکل میں دائیں بازو کے بوجھ کو اپنے اوپر سے اُتار کر پھینک دیا ہے۔ کانگریس کے بقیہ حامی عناصر جنکی قیادت مہیت سنگھ کر رہے تھے۔ راجیو راج کی کھلم کھلا سوشلسٹ دشمن اقتصادی و اجتماعی پالیسیوں کی وجہ سے مزید کمزور ہو گئے ہیں۔

دوسری جانب سی پی ایم بھی غیر پارلیمانی جدوجہد کو بتدریج رد کرتی رہی ہے جس کی وہ پہلے دعویدار تھی تاکہ اپنے مغربی بنگال کے علاقہ کو مرکز کے عدم استحکام سے بچا سکے اور ایک ایسا نیا نظام گفت و شنید سے قائم کر سکے جسمیں مرکز۔ علاقہ تعلقات اُس نوع کے ہوں کہ جو ریاستوں کو مزید خود مختاری، طاقت اور مرکزی حکومت کے وسائل مہیا کر سکیں۔ خارجہ پالیسی میں سی پی ایم ماسکو کی حمایت کی روائیتی پوزیشن اختیار کر رہی ہے۔ دونوں کمیونسٹ پارٹیاں لازمی طور پر ہندوستانی حکومت کی غیر جانبدار خارجہ پالیسی کی حمایت کرتی ہیں۔

کئی نقاط پر تیزی سے ہم آہنگی کے باوجود سی پی آئی اور سی پی ایم نے اتحاد کے بارے میں بات چیت صرف آٹھویں عشرے میں شروع کی ہے۔ درحقیقت یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ اب یہ لازماً دونوں پارٹیوں کی نوکر شاہانہ قیادت کے خود غرضانہ مفادات ہی ہیں جو اس ملاپ کا راستہ روکے ہوئے ہیں جس سے ہندوستان میں انقلابی تبدیلی کے امکانات میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ یہ ملاحظہ رہے کہ سی پی آئی کی تیرھویں کانگریس جو وسط مارچ ۱۹۸۶ء میں بہار میں منعقد ہوئی تھی۔ وہاں پارٹی کی نچلی اور درمیانی سطح کے کارکنوں کے نمائندہ مندوبین اعلیٰ قیادت کے مقابلے میں سی پی ایم سے مدغم ہونے پر زور دے رہے تھے۔ تفرقہ کی موجودہ حالت میں بھی سی پی ایم اور سی پی آئی کو راجیو کانگریس کے اُبھار کیوجہ سے ایک حد تک اطمینان ہونا چاہیئے کیونکہ اسوجہ سے دوسری بورژوا مخالف جماعتیں بائیں بازو کے مقابلے میں زیادہ متاثر ہوئی ہیں اور یہ کہ مغربی بنگال کے

حالیہ انتخابات میں بائیں بازو کی فتوحات سے اس ریاست میں دوسری قوتوں کا مزید تدخل رک گیا ہے جبکہ کیرالہ میں اقتدار گنوا دینے سے ہندوستان میں مغربی بنگال اب بائیں بازو کا تنہا مرکز ہے۔ سی پی آئی اور سی پی ایم اپنے مخالفین کے مقابلے میں ابھی تک ہراول (کیڈر) پارٹیاں ہیں جنکے پاس مقابلتاً زیادہ معقول پروگرام موجود ہے اور جب راجیو کانگریس کے اقتدار سے مایوسی جنم دے گی تو بایاں بازو چند علاقوں میں دوبارہ نمودار ہو سکتا ہے۔

ہندوستان کے مارکسیوں کی پہلی نسل قومی جدوجہد سے نکلی تھی، جو قوم پرستی اور کمیونزم دونوں کے زیر اثر انقلابی بنے تھے۔ دوسری نسل بڑی حد تک ماؤ کے نظریات سے متاثر تھی۔ اب ان دونوں روایات کا رنگ بہت ماند پڑ گیا ہے۔ سی پی آئی اور سی پی ایم دونوں کی قیادت بلاشبہ بڑی مستعدی سے اپنے نوجوان اور طالب علم محاذوں پر قیادتی کیڈر کو ترقی دیتے رہے ہیں تاکہ ان کا اندرونی تسلسل جاری رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستقبل میں ان کی کامل سیاسی عدم تحریک کو مفروض نہیں کیا جا سکتا۔ اب حالت یہ ہے کہ نیا مقابلتاً زیادہ تعلیم یافتہ اور لحاظ سے زیادہ بڑا کا مزدور طبقہ موجود ہے، جس کو مقابلتاً پسماندہ اور جامد مارکسی نظریے اور عمل کا سامنا ہے اور جو اس سے اپنے آپکو بیگانہ محسوس کرنے لگا ہے۔

نئی تحریکیں

گذشتہ عشرے میں نوجوانوں میں ریڈیکل فکر نے خاصا فروغ پایا ہے جو کہ روایتی بائیں بازو کے زیر اثر نہیں ہے۔ صحت اور ماحول Empowerment کے میدان میں نئی تنظیمیں اور گروہ پیدا ہو گئے ہیں جنہیں بھوپال کے المیئے نے مزید تحریک دی ہے۔ عورتوں پر جبر و استحصال کے مسائل، غیر رسمی تعلیم کا میدان (عوام کے لئے سائنس کے پروگرام، اہل دانش کی تنظیمیں جو پیروں فقیروں اور ان کے کرشموں

کا بھانڈہ پھوڑ رہی ہیں وغیرہ) قبائلی برادریوں میں مسیحی ریڈیکلز، شہروں میں رہائش کے مسائل، غریب بستیوں، بیڑیوں کے مکین اور غریب کرایہ دار اپنے مسائل کے حل کے لئے لگے مورچوں پر ڈٹے ہیں اور تقریباً تمام ملکی زبانوں میں ادبی تحریک زوروں پر ہے۔

ان نئی تحریکوں کے بارے میں اعداد و شمار اور دوسرا مواد ابھی جمع نہیں کیا گیا۔ لیکن ان میں سب سے قابل ذکر عوام میں فروغ علم (سائنس) کے لئے گروپ ہیں جنمیں پندرہ سے بیس ہزار کارکن پورے ملک میں سرگرم ہیں اور عورتوں کی فعال تحریک ہے۔ اوّل الذکر خصوصاً کیرالہ میں سرگرم ہیں، جہاں کیرالہ شاستر ساھتیا پریشیا (کے ایس ایس پی) خالصتاً عوامی تحریک ہے جس میں سی پی ایم کا بڑا اثر ہوتا جا رہا ہے۔ دسمبر ۱۹۸۵ء میں آزاد خواتین تنظیموں کی عظیم ترین کانفرنس بمبئی میں منعقد ہوئی تھی جسمیں ۸۹ تنظیموں کے ۳۵۰ مندوبین پورے ملک سے جمع ہوئیں تھیں۔ ان میں بعض میں مٹھی بھر جبکہ دوسری تنظیموں میں ہزاروں اراکین ہیں۔

ایک حد تک وہ سرگرم کارکن جو قبائلیوں اور ماحولیات پر کام کر رہے ہیں کا کام ایک دوسرے سے مل جاتا ہے کیونکہ قبائلی بہبود اور جنگلات کا تحفظ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ تقریباً دو سو گروپ ہندی، مرہٹی، بنگالی، ملیالم اور تیلگو زبانوں میں مستعدی سے کام کر رہے ہیں جن میں سے پچاس کو نمایاں عوامی حمایت حاصل ہے۔ ان تنظیموں میں مرہٹی کرانتھالی مصنفین کی کیرالہ کوآپریٹیو اور شمال میں ترقی پسند مصنفین کی تنظیم شامل ہیں۔ انکا بنیادی مقصد بحث مباحثے کے حلقوں کا قیام اشاعت کتب، جرائد اور کتابچے ہیں حالانکہ باقاعدہ پابندی سے شائع ہونے والے جرائد موجود نہیں ہیں۔ ان ادبی تحریکوں کی توسیع کی وجہ آزادی کے زمانے میں تعلیم کا عام ہو جانا ہے یعنی عموماً متوسط کسان، قبائلی اور شہری متوسط طبقہ

ان تحریکوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان تحریکوں میں غالب رجحان روشن خیالی اور مارکسیت کا ہے جو ہندی پٹی میں زیادہ حاوی ہے جہاں روایتاً منظم کمیونزم بڑے پیمانے پر موجود نہیں ہے۔

سرمایہ داری کے آخری زمانہ میں جب پوری دنیا میں ماحول اور عورتوں پر ظلم کے مسائل کا ادراک بڑھ رہا ہے۔ ہندوستان کی "مجموعی اور غیر ہموار ترقی" نے متعدد ایسے مسائل کو نمایاں کر دیا ہے جنہیں روایتی بایاں بازو وقتی یا بہت کم توجہ دیتا تھا۔ ہندوستان کی "اقتصادی حقیقت" یہ ہے کہ عوام طبقات میں بٹے ہوئے ہیں، جبکہ "سماجی حقیقت" یہ ہے کہ وہ جاتی (ذات) جنس، مذہب، زبان، علاقہ وغیرہ کے بندھن میں جکڑے ہوئے ہیں اسکی "سیاسی حقیقت" یہ ہے کہ وہ بورژوا جمہوری حکومت کے شہری ہیں جنکا یہ عقیدہ ہے کہ وہ خود مختار ہیں، اگر کبھی وہ اپنی اقتصادی و سماجی کمتری کا احساس کرتے بھی ہیں تو وہ بھی محض داخلیت کا حصہ ہوتا ہے۔ ہندوستانی مارکسی اکثر یہ رویہ اختیار کرتے ہیں کہ صرف اقتصادیات تنہا اور بلا تخصیص سب سے اہم حقیقت ہے یہی وجہ ہے کہ آزاد دلت تنظیم یا عورتوں کی جدوجہد کو قبولیت عطا نہیں کی جاتی۔ بائیں بازو کے کارکن عام طور پر انکی طرف سرپرستانہ رویہ اختیار کرتے ہیں بلکہ بعض حالات میں انہیں صرف قابل استعمال چیز سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے تعجب نہیں کہ نئی تحریکوں میں حصہ لینے والے بھی انہیں بدلہ میں شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جبکہ دوسری طرف صورتحال اب یہ ہے کہ بائیں بازو اور انتہائی بائیں بازو کے شکر کے نئے رنگروٹ بھی اب بحث اختیار کر رہے ہیں اور انقلابی بحث کا رخ اب خود مختار کارروائی کی طرف ہو چکا ہے۔

ان اجتماعی جدوجہدوں کا زندہ حصہ بننے کے لئے جن میں سے بعض (مثلاً مغربی ہندوستان کی جاتی جدوجہد) کی اپنی تاریخ ہے، صرف یہی کافی نہیں کہ "صحیح مداخلت"

کی باہر سے تشریح کی جائے یا یہ کہ اپنے کارکن مختلف محاذوں پر بھیج دیئے جائیں۔
اس سلسلے میں بائیں بازو کی گاندھی کی زیر قیادت چلنے والی قومی تحریک سے کچھ نہ کچھ
ضرور سیکھنا ہوگا جس نے سماجی تحریکوں کے کافی بڑے حصہ (خصوصاً ذات پات اور
عورتوں کے ساتھ نابرابری اور ظلم) کو بڑی کامیابی سے سیاسی آزادی کی جدوجہد کا
حصہ بنالیا تھا۔

گاندھی کا پورا زور بورژوا اصولوں کی ٹھوس بنیادوں پر تھا جو مساوات اور
قانونیت پر مبنی تھیں۔ ہندوستان کی سماجی زندگی کے سیاق وسباق میں یہ کوئی غیر
اہم ترقی نہ تھی۔ اب بائیں بازو کو بھی ہندوستانی معاشرہ کی رگوں میں داخل
ہونے کے بارے میں سوچنا پڑیگا۔ خصوصاً انہیں متبادل ثقافت بنانی پڑیگی اور
منفعلانہ انداز میں نئی سماجی تحریکوں کی تماش بینی ختم کرنی پڑیگی۔ مغربی جمہوریتوں
کے مقابلے میں ہندوستان میں زندگی سیاست کے مقابلہ میں ثقافت کے گرد
زیادہ گردش کرتی ہے۔ مختلف سیاسی سطحوں پر انتشار یا احتجاج ازخود زندگی کے
تجربہ میں سرایت نہیں کرتا ہے گو کہ ایک حد تک عوامی سیاست اور بورژوا جمہوری
ریاست کی پہنچ کی وجہ سے اسکی کچھ ابتدا ہو رہی ہے۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ متعصب
فرقہ وار تنظیمیں جیسے آر ایس ایس اور شیوسینا بائیں بازو کی بہ نسبت بستیوں
میں اپنی تنظیموں کا جال زیادہ پھیلا کر اپنے ارکان اور حامیوں کی روزمرہ زندگی کے
مسائل کے حوالہ سے کام کر رہی تھیں۔

اس طرح ریاستی سطح پر بھی اعلےٰ سطح کا شعور اور عمل دخل درکار ہے۔ آزادی
کے بعد سے پیداواری اقتصادیات اور سماجی بہبود کے بارے میں حکومت کا بڑے پیمانے
پر عمل دخل تسلیم کیا جا چکا ہے۔ لیکن بایاں بازو عوام میں بہت زیادہ مقبول مطالبات
کے لئے جدوجہد سے عاری رہا ہے۔ مثلاً یہ مطالبہ کہ حکومت بڑے پیمانہ پر طبی سہولتیں

فراہم کرے، تعلیم کا معقول انتظام کرے، مفت انصاف مہیا ہو، روزگار فراہم کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ اس جانب ہر کامیاب قدم حکومتی فلاح و بہبود کے اداروں کو مزید مضبوط کرتا ہے اور حکومت کے لئے ان اعمال سے پسپائی اختیار کرنا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے اُسے اپنی عوامی حمایت کھو دینے کا ڈر ہوتا ہے۔

سوشلزم اور ریڈیکل فعالیت

نئی سماجی تحریکوں میں فعال کردار ادا کرنے والے لوگوں میں بائیں بازو کی بڑی پارٹیوں کے مقابلے میں ایک خامی نظر آتی ہے۔ ان لوگوں کو بائیں بازو کا نام دینے کی بجائے ریڈیکل کہنا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ انکی بنیادی دلچسپی خاص نوعیت کی تنظیموں سے وابستہ ہوتی ہے جو اپنے پس منظر، نظریے اور طبقاتی مفادات کے لحاظ سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ ان تنظیموں میں موجود سوشلسٹ رجحان کے لوگ اپنی کم تعداد کی وجہ سے خود کو پیش قدمی سے روکے رکھتے ہیں اور مزدور تحریک سے وابستہ ہونے سے گھبراتے ہیں کیونکہ انہیں تنظیم یا گروپ کے ٹوٹنے کا خوف لاحق رہتا ہے۔ درحقیقت یہ لوگ بھی ان تحریکوں کی عمومی کمزوری کا شکار ہیں جو ہندوستانی ریاست کی طاقت اور پہنچ کو کم سمجھتے ہیں اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ ریاستی طاقت سے براہ راست ٹکرائے بغیر اپنے مخصوص میدان میں بنیادی تبدیلیاں لا سکتے ہیں اور انہیں مزدور طبقہ کی تنظیموں سے اتحاد کرکے باقاعدہ تبدیلی کے منصوبہ کے لحاظ سے جدوجہد کا خیال بھی نہیں آتا۔ مگر یہ بات ماننی پڑیگی کہ ان خود مختار تنظیموں کی جملہ مساعی کو مضبوط کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے جو کافی مدت تک چھوٹی چھوٹی تنظیموں میں بکھری رہیں گی۔ لیکن انکی اندھا دھند حمایت بھی نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ یہ خدشہ ہمیشہ موجود رہے گا کہ حکومت اور بیرونی طاقتوں کا بھی ان تنظیموں کے پیچھے ہاتھ ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت ہند نے ساتویں ترقیاتی منصوبہ میں "غیر حکومتی تنظیموں کی حمایت اور

انکو مالی مدد دینے کی اہمیت پر زور دیا ہے اور یہ پالیسی اختیار کی ہے کہ میدان صحت میں نجی کاروبار بڑھے اور بنیادی دیکھ بھال خیراتی اداروں کی بنیادی ذمہ داری ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ ایسے رجعتی سازشانہ منصوبوں اور "خالص مفادات" کے حامی گروہوں کے درمیان امتیاز کرنا پڑیگا جو مظلوموں سے سچا رشتہ رکھتے ہیں۔ آخرالذکر سے بات چیت کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیئے اور ان کی سرگرمی کو مشترکہ انقلابی تبدیلی کے لئے مزدور طبقہ کی جدوجہد سے جوڑنا بائیں بازو کے مطمع نظر اور عظیم کارکردگی کا حصہ ہونا چاہیئے۔ ہندوستان میں "بنیادی" طبقاتی اتحاد کے لئے دیہی مزدوروں کو شہری و دیہی غریبوں سے رشتہ جوڑنا نہایت اہم ہے جو کہ صحت کی دیکھ بھال، رہائش تعلیم، ماحول کی آلودگی کے سنگین مسائل سے دوچار ہیں۔ اسی طرح نفاذ اشتراکیت کے کسی بھی منصوبہ کو ذات پات اور فرقہ واریت کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ مسائل پنجاب میں خصوصاً ہولناک پیمانہ پر نمودار ہو چکے ہیں۔ ان بنیادوں پر ظلم بھی طبقاتی تقسیم سے باہر نہیں ہوتا ہے اور وہ ان تقسیموں کو ایکا ایکی ختم نہیں کر سکتا۔ یہ ایسے حقائق ہیں جو عوامی اور بتدریج تبدیلی کے نظریہ کے تحت فراموش نہیں کئے جا سکتے۔

نئی تحریکوں اور مزدور طبقہ کے درمیان پل دونوں میں سے کوئی ایک یکدم فراہم نہیں کریگا بلکہ اسے وہ تنظیمیں بنائیں گی جنکی ٹھوس جڑیں دونوں میں موجود ہوں گی اور وہ اس رابطہ کی ضرورت کا شعور بھی رکھتی ہیں۔ بائیں بازو کا اصل دھارا نئی تحریکوں کو اپنا مخالف سمجھتا ہے نہ کہ اپنا حلیف۔ اس لئے تاریخی عمل کو سرانجام دینے کی کم صلاحیت رکھتا ہے۔ مثلاً سی پی ایم نے ان تحریکوں کے خلاف ایک بڑی نظریاتی مہم شروع کر دی ہے اور ایک اصلاح پسند نظریاتی پسپائی کا شکار ہے جو منظم مزدور طبقہ میں بائیں بازو کی مضبوط بنیاد بنانے میں رکاوٹ ہے۔

پڑھے لکھے ثقافتی لوگ

نئی سماجی تحریکوں کو اسی قسم کے مسائل درپیش ہیں جیسے فنی تخلیق کے میدان میں ہوتے ہیں۔ ۶۰ء کے عشرے کے وسط تک ثقافتی میدان میں ہونے والی سرگرمیاں سی پی آئی کے تنظیمی مفادات اور سرگرمیوں سے متعلق تھیں اور مزدور طبقہ میں اُس کے کام سے جڑی ہوئی تھیں۔ مثلاً اس صدی کی تیسری دہائی میں انڈین تھیٹر ایسوسی ایشن نے حقیقی معنوں میں اسٹیج اور فلم کے نمایاں اداکاروں، مصنفین اور شعراء کی خدمات حاصل کر لی تھیں مثلاً بلراج ساہنی، خواجہ احمد عباس یا کیفی اعظمی۔ اس لئے یہ بات کہنی حق بجانب ہے کہ اپٹا بڑے سرمائے سے چلنے والے تجارتی ناٹک اور فلم سازی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مقبول اور موثر تخلیقات پیش کرتا تھا۔ مگر آج یہ ابتدائی کمیونسٹ کامیابی بہت کمزور ہو کر رہ گئی ہے اور خود اس سیاسی تحریک کے ضعف کا چھوٹا سا عکس ہے۔ جہاں ابتدائی دور کے بہت سے اسلوب مثلاً نغمہ و رقص، ناٹک اور فلم، مطبوعات اور مباحث گزشتہ دو عشروں میں کسی نہ کسی طرح باقی تو ہے لیکن انکا مزاج زیادہ تر خود مختار اور عدم مرکزیت پسند ہوتا جارہا ہے۔ گلیوں بازاروں میں ناٹک کی پیشکش جو کمیونسٹ مظاہرات کا نہایت نمایاں خاصہ تھی اب صرف آزاد اور خود مختار گروہوں کے ہاتھ میں ہے جو ایک دوسرے سے کٹے ہوئے ہیں۔

آخر کیا وجہ ہے کہ گزشتہ پچیس سالوں میں سی پی آئی اور سی پی ایم با تخلیق فنکاروں اور اہلِ علم کو اپنی طرف مائل کرنے میں پہلے کی بہ نسبت ناکام رہے ہیں۔ ایک حد تک اس سوال کا جواب سوویت اور چینی تجربات سے مایوسی کا عمل ہے جس نے بہت سے دوسرے میدانوں میں بھی اپنی بھینٹ لی ہے۔ غالباً ۶۰ء کے عشرے کا آخر ان دونوں دھاروں کی علیحدگی کا مرحلہ تھا۔ اسوقت بازاری ناٹک ٹولیوں

کی تحریک (خصوصاً مغربی بنگال میں) نکسل وادیوں کے پیدا کردہ جوش کا نتیجہ تھی۔ گو کہ بعد میں بھی بازاری ناٹک کا زوال تو نہیں ہوا لیکن اس کی ترقی کی رفتار کم ہو گئی اور ناٹک کسی بھی سیاسی گروہ کی جکڑ بندی سے آزاد ہو گیا۔

معاصر انتہا پسند ثقافت کی نظریاتی غیر یقینی اور ثقافتی تعیّن کا ایک ناقابل انکار موضوعاتی اثر بھی نمایاں ہوا ہے۔ آزادی سے قبل اور بعد میں چھٹے عشرے تک سب سے زیادہ خصوصی موضوعات برطانوی استعمار کی ناانصافی جس کے نتیجے میں ہندوستانی انسانی صفات سے محروم ہو رہے تھے، مزدور طبقہ کا اتحاد اور محنت کی عظمت شعور اور مختلف مظاہر کو سمجھنے میں مارکسزم کا کلیدی کردار، سیاسی تنظیم کی اہمیت ہندوستان میں غربت کی عمومی صورتحال میں مفلس پارٹی لیڈر کی مثالیت، سوویت یونین اور بعد میں چین کی ترقی کی اہمیت کو اُجاگر کرنا، انقلاب پر ایمان اور اسکی جانب راہ کی درستگی پر یقین خاص طور پر نمایاں تھے۔ اب صورتحال کافی بدل گئی ہے اور موضوعات کا کینوس زیادہ وسیع ہو گیا ہے جس میں سماجی اور ماحولی مسائل کا وسیع سلسلہ زیادہ نمایاں ہے۔ دالت اور عورتوں کی تنظیموں کا ثقافتی اقرار کیا جانے لگا ہے۔ اس عمل میں اسٹالینی فکر کا کٹر پن کم ہو گیا ہے اور بلاشبہ یہ بہت مثبت تبدیلیاں ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ سوشلزم کی طبقاتی تعریف کی بجائے پاپولسٹ تعریف نئے معیار کے طور پر اُبھر رہی ہے۔ چین میں ثقافتی انقلاب سے شروع ہو کر اسٹیج، طبقات کی بجائے عوام نے لے لیا ہے، طبقاتی جدوجہد کی جگہ عوامی جدوجہد اور استحصال کی جگہ ظلم نے لے لی ہے۔

شہری پرولتاریہ

تیزی سے بدلتی ہوئی یہ فکر ہماری معیشت اور معاشرے میں پرولتاریہ کی معروضی حیثیت کے حقیقی رجحان کی آئینہ دار ہے۔ اس مضمون میں دیہی پرولتاریہ کے ڈھانچے

اور اسکی اُبھرتی ہوئی جدوجہد جسکی بازگشت عام طور پر صرف مقامی سطح پر ہوتی ہے ۔ کے بارے میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہے ۔ شہر اور دیہات کے مابین یہ لازمی تعلق جسے ابھی ظاہر ہونا ہے بہرحال شہری مزدور طاقت کے بل پر قائم ہوگا ۔

ہندوستان میں صنعت کاری کی خصوصی وضع نے حالیہ عشروں میں ایک عظیم مگر تین سطحی شہری مزدور طاقت کو پیدا کیا ہے ۔ سب سے نچلی سطح پر چھوٹے پیمانے کی صنعت میں تیزی سے نمودار ہونے والا مزدور طبقہ ہے جو ٹریڈ یونین کی سطح پر بھی منظم نہیں ہے ۔ اور صنعتی مزدوروں کے چوالیس فیصد حصے پر مشتمل ہے ۔ ان مزدوروں کے حالات بدترین ہیں ، یہاں منافع کم ہے ، اُجرت بھی کم ہے اور پیداوار بھی کم ہے ۔ صنعت ، خدمات ، نقل و حمل ، تجارت ، صحت ، تحقیقاتی اداروں ، عدلیہ کی نچلی سطح ، انتظامیہ یہانتک کہ پولیس اور سیکیورٹی فورسز تک میں مزدور تنظیمیں چھوٹی صنعت کے مزدوروں کے مقابلے میں زیادہ عمل دخل رکھتی ہیں ۔ گو کہ بعض حالات میں چھوٹے پیمانہ والی صنعتوں میں کامیاب ہڑتالیں ضرور نمایاں ہوئی ہیں مگر انکی وجہ سے یہ مستقلاً بند کردی گئی ہے ۔

دوسری طرف ادویات ، موٹر گاڑیوں ، کیمیاوی ، مصنوعاتی اور انجنیئرنگ کے کارخانوں پر مشتمل جدید شعبہ ہے جہاں اعلیٰ تنخواہ یافتہ ، تعلیم یافتہ اور ماہر کارکنوں کی طاقت ہے جو اپنی ٹریڈ یونینوں کی خود دیکھ بھال کرسکتے ہیں ، چاہے انکی رسمی سیاسی وفاداریاں کسی بھی جماعت یا مزدور فیڈریشن سے وابستہ ہوں ۔ یہ شعبہ کثیر پیداوار کثیر منافع اور کثیر اجرت کا حامل ہے لیکن یہاں پر نوکری کے مواقع بہت کم ہیں ۔ یہاں پر ریلوے اور ایئر لائنز کی طرح کارخانہ کی سطح پر ٹریڈ یونین بنانے کا رجحان ہے جو ماضی کی کسی ایک شعبے سے وابستہ کارخانوں کی جنرل یونین کی جگہ لے رہا ہے ۔ ۱۹۷۹ء سے اسکا ایک فطری نتیجہ یہ ظاہر ہوا ہے کہ عام پیمانہ کی ہڑتال میں کمی واقع ہوئی ہے ۔

یہ رجحان مزدوروں کی مقامی معاملات سے نمٹنے کی صلاحیت چاہے کتنی بڑھائے مگر اسکی وجہ سے با مہارت اور بے مہارت مزدوروں میں مزید بعد پیدا ہوا ہے اور تنظیمی روابط کا امکان کم تر ہوتا جارہا ہے۔

وسطی صنعتوں (بندرگاہ، ریلوے، ٹیکسٹائیلز اور ریاستی شعبے کی بعض صنعتوں) میں مزدور طاقت روزگار اور کم ہوتی ہوئی اجرتوں کی وجہ سے بڑھتے ہوئے عدم تحفظ سے دوچار ہیں جس کی بڑی وجہ ان صنعتوں میں جزوی طور پر جدید ٹیکنالوجی کا روشناس کروایا جانا ہے۔ یہاں روایتی تنظیموں کو "باہر کے لوگ" چلاتے ہیں جنکا تعلق سیاسی جماعتوں سے ہے یا جنہیں ڈاکٹر دتہ سامانت جیسے بدمعاش لوگ چلاتے ہیں۔

اسوقت میدان صنعت میں صرف پچاس فیصد مزدور اور کل لیبر فورس کا تیس فیصد مزدور تنظیموں سے وابستہ ہے۔ رجسٹرڈ یونینوں کی تعداد پینتیس ہزار ہے مگر اوسط حجم کم رہا ہے اور وہ ہر سال مزید مالی عدم استحکام کا شکار ہو رہے ہیں بلاکسی تفریق کے بیشتر ہڑتالیں مہاراشٹر، مغربی بنگال، تامل ناڈو (تین اہم ترین ریاستیں) آندھرا پردیش اور بہار میں واقع ہوتی ہیں۔ گزشتہ دس سالوں کے دوران ہڑتالوں کی تعداد میں کمی واقع ہوئی ہے لیکن نچلے درجے کے صنعتی اختلافات میں ۷۰ء کے عشرے میں پچپن فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ اسی مدت میں صنعتی روزگار میں ۱۴،۰۳ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۷۴ء سے مالکان کی جانب سے تالہ بندی میں اضافہ ہوا ہے اور اسطرح مزدور تنظیموں کو زبردست ہزیمت اٹھانی پڑی ہے۔

نمایاں اقتصادی و صنعتی توسیع کے زمانہ میں نچلی دو سطحوں کو عمومی طور پر بنیادی دفاعی جدوجہد تک محدود کر دیا گیا ہے، جبکہ اونچی سطح کے مزدور بہت فائدہ میں رہے ہیں مگر اس وجہ سے ان کی معاشی مفاد پرستی میں اضافہ ہوا ہے اور وہ بقیہ مزدور تحریک سے کٹ گئے ہیں۔

ہندوستان کی موجودہ ٹریڈ یونین تحریک یہاں کی سیاسی پارٹیوں کی ہیئت سے مطابقت رکھتی ہے۔ آئی این ٹی یو سی جو کانگریس (آئی) سے مضبوط بندھن رکھتی ہے۔ ابھی تک مزدور یونینوں کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ ۱۹۶۸ء میں اس کی رکنیت ۱۰۳۲۶۰۱۵۲ تھی جو ۱۹۸۰ء میں بڑھ کر ۲۰۲۳۶۰۰۰ ہو گئی ہے۔ بی این ایس جسے ہندو قوم پرست جن سنگھ نے ۱۹۵۵ء میں قائم کیا تھا، ۱۹۷۷ء میں جنتا اتحاد کے اقتدار کے دوران تیزی سے بڑھنی شروع ہو گئی تھی۔ ۱۹۸۰ء میں اسکی کل رکنیت ۱۰۲۱۱۰۰۰ جو کہ آئی این ٹی یو سی کے بعد دوسرے درجہ پر تھی جنتا کے زوال کے باوجود اسکی طاقت میں اضافہ ہنوز جاری ہے۔ بائیں بازو کے زیر اثر یونینوں میں ہند مزدور سبھا (۷۰۳۵۰۰۰) جو کہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی نے قائم کی تھی اور اب اُسکی مختلف شاخوں کے زیر اثر ہے، لینن سارانی کی یونائیٹڈ ٹریڈ یونین کانگریس (۶۲۰۰۰۰) جو بنگال کے سوشلسٹ یونٹی سینٹر کے زیر اثر ہے، سی پی آئی لوازآل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس (۳۴۴۰۰۰) اور سی پی آئی ایم لواز سینٹر آف انڈین ٹریڈ یونینز (۱۰۳۳۰۰۰) جو ۱۹۷۰ء میں اے آئی ٹی یو سی سے الگ ہوئی تھی شامل ہیں۔

یہ تمام ٹریڈ یونین فیڈریشنز خواہ بائیں ہوں یا دائیں، تجارت اور صنعت کے جملہ میدانوں میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتی رہتی ہیں۔ ویسے بھی سرکاری شعبہ میں آئی این ٹی یو سی غالب رہتی ہے جبکہ تاریخی وجوہ کی بنیاد پر ایچ ایم ایس کلیدی حکومتی شعبہ صنعت، نقل وحمل یعنی بندرگاہوں (بمبئی، مدراس، کلکتہ) اور ریلوے میں غالب ہے، جہاں ۱۹۷۴ء کی ہڑتال کی قیادت سوشلسٹ لیڈر جارج فرنانڈیز نے کی تھی۔ اے آئی ٹی یو سی بمبئی میں ٹیکسٹائل کی صنعت میں بہت طاقت رکھتی تھی جسے کسی زمانے میں ہندوستانی مزدور طبقہ کا ہراول سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ساتویں عشرے میں شیوسینا کے بازاری غنڈوں نے مالکان کی شہ پر اے آئی ٹی یو سی اور سی پی آئی

کے ارکان کیخلاف دہشت گردی کی کاروائیوں سے بالآخر اسے توڑ کر رکھدیا تھا۔ ویسے بھی پورے ملک میں اے آئی ٹی یو سی کا ستارہ گلنا جاری ہے۔ بنگال کے علاوہ یہی حال سی آئی ٹی یو کا بھی ہے۔

ہندوستانی ٹریڈ یونین کے شدید "سیاسی" کردار کے مدنظر نجی اور حکومتی شعبوں میں اسکے خلاف ہونے والے حالیہ حملوں کا مقابلہ کرنے میں اسکی ناکامی موجودہ بائیں بازو کی پارٹیوں پر بہت بڑی غفلت کا الزام ثابت کرتی ہے۔ علاوہ ازیں نسلیں بدل رہی ہیں اور یونین کی مرکزی قیادت جدید مزدور طاقت کے مسائل کے بارے میں بیحس ہوتی جا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے آزاد مزدور تنظیمیں نمودار ہو رہی ہیں جو کسی مرکزی قومی تنظیم سے چاہے رسمًا منسلک ہوں بھی مگر اپنے عمل میں وہ کافی حد تک خودمختار ہیں، متوسط سطح کی صنعتوں میں یہ تنظیمیں غنڈہ مزدور قائدین کی طرف کھینچتی جا رہی ہے جو یا تو امریکی طرز کے پیشہ ور تجارتی ناظم (آر جے مہتہ) ہیں یا پھر قانون کے دائرے سے باہر سرگرمیاں کرنے والے خطرناک مہم جو ہیں جنہیں مزدوروں کے مسئلے پر طویل عرصہ کی جدوجہد کی کوئی فکر نہیں ہے اور جنکی حرکتیں مزدوروں کو بہت مہنگی پڑتی ہیں (مثلاً سامانت)۔ وفاداریوں کی تبدیلیوں کا سلسلہ سامانت پر ختم نہیں ہو جاتا۔ مہاراشٹر میں بورژوازی کے زیر اثر دیگر مزدور تنظیمیں اب اسکا اثر بھی ختم کرتی جا رہی ہیں۔

ریاستی شعبہ کی مزدور تنظیموں کا فیصلہ کن روایتی کردار خصوصًا آٹھویں عشرے میں اندرا اور راجیو گاندھی کی حکومتوں کی خصوصی توجہ کا باعث رہا ہے۔ اس سیاسی تعلق کا ایک اثر یہ ہے کہ ایک ایسے ملک کے لئے جہاں مزدور تنظیمیں صرف ساٹھ سال پرانی ہیں۔ مزدوروں کے بارے میں قانون سازی نہایت ترقی یافتہ ہے۔ دوسرا اثر یہ ہے کہ ریاستی شعبہ کی مزدور تنظیمیں ایک طرح کی مثالی یونینیں ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں منظم شعبہ میں کام کرنے والے ۲۳٫۵۵ ملین مزدوروں میں سے ۱۵٫۹۴ ملین

یا ۶۸، ۶۷ فیصد ریاستی شعبہ میں ملازم تھے، جنکا سب سے بڑا حصہ ۳۶، ۸ ملین یا ۳۸، ۵۲ فیصد شعبہ خدمات میں ملازم ہے۔ ریاستی شعبہ میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ مرکزی تنظیم موجود ہے جسے معروضی ذریعہ مستقبل میں مزدور طبقہ کی متحدہ جدوجہد کی حکمت عملی کے لحاظ سے امتیازی حیثیت حاصل ہے، حکومت کو اس طاقت کا علم ہے اور وہ شعوری طور پر اسے دبانے کی کوشش کرتی ہے۔ دوسری جانب بیورو آف پبلک انٹرپرائزز (بی پی ای) ریاستی شعبہ کے گرانٹس مثلاً لائف انشورنس کارپوریشن آف پاکستان کو منقسم کر رہی ہے اور بعض کو نجی سرمایہ داروں کے ہاتھ بیچ رہی ہے۔ اس عمل سے صنعتی تعلقات نجی نوعیت کے ہوجائیں گے اور اس وجہ سے برطرفیوں کا سلسلہ، لالچ اور پیداواریت کے معاہدے وغیرہ نمودار ہوں گے اور آزادی کے وقت سے مزدوروں کو جو رعائتیں حاصل ہوگئی ہیں وہ ختم ہوجائیں گی۔ دوسری طرف بی پی ای اُن اداروں کو آپس میں مدغم کر رہی ہے جو ریاستی ملکیت میں رہ جائیں گے۔ اسوجہ سے بی پی ای میں مزید مرکزیت ہوجائے گی، جبکہ اس کے مقابلے میں ریاستی شعبہ کی مزدور تنظیموں میں معلومات اور اختیارات کی مرکزیت کی طرف کوئی ترقی نہیں ہو رہی ہے۔

اگر بائیں بازو کی تنظیمیں مزدور طاقت کے انتشار کے مسئلہ کا ضروری احساس رکھتیں خود کو جمہوری وتخلیقی، مجاہرانہ مگر ذمہ دار اعمال کی تشکیل میں مصروف رکھتیں تو وہ اپنے آپکو دوسری سیاسی قوتوں کے مقابلہ میں ممتاز کرکے مزدور اتحاد کی تحریک کی قیادت کرسکتی تھیں۔ مگر وہ اپنے محدود فرقہ پرست مقاصد کی حدود سے باہر نہیں آتیں۔ مثلاً ۸۲ - ۱۹۸۱ء میں کپڑے کے کارخانوں کی ہڑتال کے دوران وہ سامانت کی ذاتی قیادت پر حملہ میں پھنسی ہوئی تھیں جو کہ مہاراشٹر میں ان کے مرکز کے لئے خطرہ تھا اور مزدور اتحاد کو بحال بناکر ہڑتال کو کامیاب بنانے سے قاصر

تھیں۔ ان حرکتوں کا نتیجہ انہوں نے ۱۹۸۳ء میں واضح طور پر دیکھ لیا تھا جب مغربی بنگال میں ہڑتالوں کی بجائے تالہ بندی کے دوران مقابلتاً زیادہ ایام کار ضائع ہوئے تھے۔

طبقاتی اتحاد کا لائحہ عمل

ہندوستان میں مزدور ٹریڈ یونین کے اتحاد و تنظیم کے منتشر ہونے کے باوجود بعض ایسے نکات ہے جو مزدور طبقہ کا بنیادی اتحاد قائم کرنے کے لیے لازمی ہیں۔ جب مختلف سطحوں پر متحدہ عمل شروع ہوگا جس میں مختلف مزدور تنظیمیں وفاق اور مراکز از خود ایک متحد مسئلہ کے لیے رابطہ کمیٹیاں تشکیل دیں گے۔ لیکن ایک متحد و مشترک اعلان مطالبات کی لازمی طور پر ضرورت ہے جس میں مزدوروں کے جمہوری حق تنظیم و اتحاد کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے سلسلے کو ختم کرنے کا مطالبہ شامل ہونا اشد ضروری ہے، جیسے لازمی خدمات کے اجرار کے قانون اور قومی دفاعی قانون وغیرہ جیسے ہتھکنڈوں کے ذریعے ختم کیا جارہا ہے۔ شہروں اور دیہات دونوں جگہ معقول معاش کی ضمانت ہونی چاہیئے نجی اور سرکاری دونوں شعبوں میں اجتماعی ضروریات کے مطابق مزدوری میں اضافہ بشمول مزید پینشن، رہائش، علاج کی سہولتوں کے مطالبات شامل ہونے چاہئیں۔ موجودہ مزدوروں کے لیے قومی سطح پر ان کی بنیادی ضروریات کے مطابق کم از کم منصفانہ مزدوری کا یقین کرتے رہنا چاہیئے۔ فرقہ واریت سے ذات پات تک اگر تمام مسائل پر اتفاق نہ ہو سکے تو بھی اس کی کوئی وجہ نہیں کہ بائیں بازو کے زیر اثر مزدور تنظیمیں ایک متواتر نظریاتی جدوجہد اپنے مزدور خبرناموں اور مطبوعات کے ذریعے کیوں نہیں شروع کرتیں اور جاری جدوجہد کو آگے بڑھانے کے لیے میدان میں کیوں نہیں آتیں۔

جبکہ سرمایہ دارانہ طرز پیداوار کے ساتھ ساتھ مزدور طبقہ کا معروضی وزن بھی اسی تناسب سے بڑھتا جارہا ہے، بائیں بازو کی ترقی کے مواقع میں ناکامی نہایت سنگین ہوتی جارہی ہے۔ سرمایہ اور مزدور کے درمیان عدم توازن ہمیشہ ایک جیسا نہیں

رہ سکتا پہلے ہی سے ہندوستانی ریاست بورژوا سیاسی قیادت کے بحران کی وجہ سے متواتر کمزور ہوتی جا رہی ہے اور وہ اپنے آپ پر مختلف قسم کے طاقتور دباؤ کا مقابلہ کرنے کی اہلیت کھوتی جا رہی ہے۔ اس وجہ سے طبقاتی اور ریاستی طاقت کے براہ راست فیصلہ کن سوالوں پر مزدور طبقہ کی وسیع بنیاد پر اس سے مقابلہ کے امکانات پر عمل ضروری ہوتا جا رہا ہے۔ مزدور طبقہ کے لیے یہ لازمی ہوتا جا رہا ہے کہ وہ ایک مربوط اور منظم ہراول تنظیم سامنے لائے جو کہ فعال سیاسی پہل کرنے والی اور واضح منزل کی سمت مسلسل جد وجہد کرنے والی ہو۔

آخر میں ہندوستان میں انقلابی حکمت عملی کو مرتب کرتے ہوئے پورے ملک میں بورژوا حکومت کے عدم استحکام کا ٹھوس جائزہ لیا جانا چاہیئے۔

ہندوستانی ریاست کا طویل المعیاد منصوبہ پورے برصغیر پر بالادستی کا حصول ہے جسے ہندوستانی شکر ے "فطری غلبہ" قرار دیتے ہیں اور بنگلہ دیش میں ہندوستانی فوج کی مداخلت اسی سمت میں ایک اہم قدم تھا۔ بنگلہ دیش کی قومی آزادی کی جد وجہد الگ سوال ہے اور اس کا اس نقطہ سے تعلق نہیں ہے۔ بنگلہ دیشی مزاحمت کے ایک اہم رہنما کرنل ابوطاہر اس حقیقت کو واضح طور پر سمجھ گئے تھے کہ ہندوستانی مداخلت کی ایک وجہ بنگلہ دیش کی دیسی سیاسی قوتوں کی ترقی میں رخنہ ڈالنا تھا اور ایک ایسی حکومت قائم کرنی تھی جو شیخ مجیب الرحمٰن کی زیر قیادت ہو اور بہت لمبے عرصے تک بھارت پر انحصار کرتی رہے۔ مگر اس بات میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس اقدام کا اصل سبب برصغیر میں اپنے اصل حلیف کو اپاہج کرنا تھا۔ ہندوستان کی مسلح افواج کی اس کامیابی کے بعد ۱۹۷۴ء میں پوکھران میں کامیاب جوہری بم کا دھماکہ کیا گیا، ۱۹۷۵ء میں نہایت بے غیرتی سے غیر آئینی طور پر سکم پر قبضہ کیا گیا اور بنگلہ دیش میں شیخ مجیب کے خاتمہ کے بعد متواتر فوجی بغاوتوں میں واضح طور پر

اس کا ہاتھ دکھائی دیتا ہے ۔۔۔ نیپال کو "علاقہ امن" قرار دینے کے اعلان کے خلاف ہندوستانی حکومت نہایت ڈھٹائی سے ڈٹی ہوئی ہے۔ ناگالینڈ اور میزورم کی جدوجہد آزادی کو وحشیانہ طور پر کچلتی ہے۔ اور مادی و مالی رشوتوں کے ذریعہ اسے دبانے کے لیے وہاں اس نے غدار مراعات یافتہ طبقہ بھی پیدا کر دیا ہے۔ سری لنکا میں نسلی گھلاؤ کے بحران کی آڑ میں اس نے کولمبو حکومت کے خلاف جارحانہ سفارتی سلسلہ شروع ہوا ہے۔

گذشتہ پندرہ سال کی علاقائی تاریخ یہ واضح کرتی ہے کہ بورژوا اقتدار کا "نحیف سلسلہ" اب بھارت سے باہر ہے، جو ساتویں عشرے میں بنگلہ دیش، اور آٹھویں عشرے میں سری لنکا اور پاکستان، منتقل ہوتا رہا ہے، جہاں سندھی اور بلوچ قوم پرستی کی اپنی خصوصی اہمیت ہے۔ ان پڑوسی ممالک کی بورژوازی اپنی ریاستی تشکیلات میں ہندوستان کی بہ نسبت کم لچکدار ہے۔ وہاں پر اپنے مقابل طبقاتی مخالفین کے خلاف توازن بھی ہندوستان کی بہ نسبت ابھی اُن کے حق میں نہیں ہے۔ حالانکہ ہندوستان کی سرحدوں کے پار جو عوامی تحریکیں ظاہر ہو رہی ہیں، وہ قلعہ بند طبقاتی حکمرانوں کے لیے مقابلتاً زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہیں گو وہ زیادہ وقفوں کے ساتھ واقع ہوتی ہیں اور مقابلتاً اُن کی مزدوروں میں کم جڑیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مستقبل میں ہم ہندوستان کی طرف سے وہاں مقابلتاً زیادہ ننگی مداخلت کی توقع کرتے ہیں جو سرحد پار "عدم استحکام" کی وجہ سے لاحق ہوں گی۔ اس امکان کی وجہ سے ہندوستان کے بائیں بازو پر ایک خاص ذمہ داری یہ عائد ہوتی ہے۔ کہ وہ قومی عصبیت (شاونزم) اور ایک بڑی طاقت بننے کے لیے خود اندرون ملک جو رجحانات پائے جاتے ہیں اُن کا مقابلہ کریں اور ایک مربوط تدبیر پر عمل پیرا ہوں جو پورے برصغیر کی ہمہ گیر انقلابی تبدیلیوں کی طاقتوں سے ہم آہنگ ہو۔

پاکستان میں قومی سوال

سید رشید احمد

ایک سیاسی فلسفہ کی حیثیت سے پاکستان میں قومی مسئلہ پچھلی دہائی کے دور میں ایک خصوصی اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ یہ نہیں کہ یہ مسئلہ اس دور سے پہلے وجود میں نہیں تھا۔ یہ مسئلہ تو پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ہی منظر عام پر آنا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن چونکہ اس کے حل کی کوئی حقیقی اور سیاسی کوشش نہیں کی گئی بلکہ اکثر اس کے وجود سے انکار کیا گیا اس لئے یہ سیاسی اسٹیج کے بند کمروں میں شدت پکڑتا گیا یہاں تک کہ اس کی شدت نے اس میں ایک نئی کیفیت پیدا کر دی اور ہمارے دیکھتے دیکھتے یہ سیاسی اسٹیج کے مرکز میں اپنی جگہ بنا چکا ہے۔ بہت سے ان رجحانات کی طرح جو پامالی اور جبر سے ابھرتے ہیں۔ قومی رجحان بھی بہت کچھ اس لئے ابھرا ہے کہ اسے جبراً کچلنے کی کوشش کی گئی۔

بات یہ ہے کہ کوئی بھی رجحان یا مسئلہ بغیر اپنی لازمی بنیاد کے نہ کبھی وجود میں آسکتا ہے اور نہ ابھر سکتا ہے۔ رجحانات ہواؤں میں جنم نہیں لیتے بلکہ وہ دھرتی پر ایک ٹھوس بنیاد کی تحقیقی نفسیاتی اور نظریاتی عمارتیں ہوتی ہیں اور یہ عمارتیں ڈھائی نہیں جا سکتیں جب تک کہ ان کی ٹھوس ارضی بنیاد موجود ہے۔ کسی درخت کی شاخیں کاٹ دو۔ مگر وہ پھر کچھ دنوں میں ہری بھری ہو جائیں گی اگر اس درخت کی جڑ زمین کے اندر مضبوطی

سے قائم ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قومیت کا مسئلہ قومی جبر و استحصال اور قومی بے انصافی و نا برابری سے ابھرا۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اگر قومی جبر و استحصال اس شدت سے نہ ہوتا تو قومی مسئلہ وجود ہی میں نہ آتا۔ اس لئے کہ قومی رجحانات محض ایک ردعمل نہیں ہیں بلکہ اپنی ایک سماجی بنیاد رکھتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ان رجحانات میں شدت اور مبالغہ قومی استحصال اور بے انصافی کے مرہون منت ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ ان رجحانات کی مقدار میں اضافہ کر سکتے ہیں لیکن ان کے وجود کا سبب نہیں بن سکتے۔

پاکستان ایک کثیر القومی ملک ہے۔ اس میں بنیادی طور پر چار قومیتیں اپنی زبان، تہذیب، تمدن، مشترک تاریخ، نفسیاتی ساخت اور جغرافیائی وحدت کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ قومیتیں جڑ کر ایک قوم بننے سے قاصر رہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کا معاشی اور اقتصادی ڈھانچہ بنیادی طور پر جاگیردارانہ یا ماقبل جاگیردارانہ رہا۔ اس قسم کے سماجی نظام میں گروہی طور پر قوم کی تشکیل ممکن نہیں۔ قوم کی تشکیل کے لئے سماجی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کی ضرورت ہے۔ جو جاگیرداری کی بہ نسبت جدید تر اقتصادیات سے مربوط ہے لیکن جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے یہاں آزادی کے بعد سے ایک گماشتہ سرمایہ دار طبقہ ضرور پیدا ہوا جو سامراجی صنعتی ممالک کی گماشتگی اور ان کے ایما پر ان کے مفاد کے لئے خام مال اور نیم خام مال کی پیداوار کا فرض انجام دیتا ہے۔ لیکن جاگیردار اور گماشتہ سرمایہ دار کے اس مجموعی سماجی ڈھانچہ میں صحیح معنوں میں ایک قوم کی تشکیل ممکن نہ تھی۔ اور نہ اس نظام میں سرمایہ دار معاشرہ کے بنیادی طبقات مستحکم طور پر وجود میں آسکے یعنی سرمایہ دار اور مزدور طبقے۔ جن کی کشمکش پر موجودہ دور کی سرمایہ دار دنیا کی نشوونما کا انحصار ہے۔

لیکن ان سماجی خامیوں کے باوجود پاکستان میں ابھرتے ہوئے گماشتہ سرمایہ داروں نے پاکستان کی قومی وحدت کو جبراً عائد کرنے کی کوشش کی۔ دو قومی نظریہ اور نظریۂ پاکستان

پر زیادہ سے زیادہ زور دیا گیا۔ ایک واحد قومی زبان، مشترکہ تہذیب اور مذہب پر خاصا مبالغہ کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ حکومت پر یہی طبقہ جاگیردار طبقہ کے ساتھ بقائے باہم کی بنیاد پر قابض تھا۔ یہ وحدت بالخصوص ایک مشترکہ زبان کی وحدت سرمایہ دار طبقہ کے واحد بازار کے تصور کا ایک عکس ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ خریدار اور فروشندہ ایک زبان میں بات کر سکیں اور ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔

بہر حال قومی وحدت کا یہ سارا فلسفہ پاکستان کی ابھرتی ہوئی قومیتوں کا بھرپور استحصال تھا۔ اور استحصال کا شکار ہونے والی قومیتیں بہت جلد اپنے تجربہ سے سمجھ گئیں کہ مذہب و تہذیب کی وحدت کا یہ فلسفہ قومی استحصال اور بے انصافی کے لئے ایک نقاب کا کام کرتا ہے۔ اس لئے کہ ایک طرف تو وحدت و اخوت کا درس دیا جا رہا تھا دوسری طرف اقلیتی قومیتوں کے وسائل پر ناجائز قبضہ کیا جا رہا تھا۔ اس فریب کاری کی بدولت اکثریتی قومیت کے استحصالی طبقہ نے بے پورے ملک کی اقلیتی قومیتوں کے حقوق غصب کرنا شروع کئے۔ اور اس طرح پورا ملک ایک مالیتی گروہی اقتدار کا غلام بن گیا۔ یہ گروہ جو اکثریتی صوبہ سے تعلق رکھتا تھا یعنی پنجاب سے سندھ اور بلوچستان کی زمینوں معدنی دولت اور کچے مال پر قابض ہو گیا۔ اور اس نے سرحد سے بھی قیمتی معدنیات اور قیمتی معدنیات اور قیمتی پتھر حاصل کئے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس نے ان صوبوں میں مقامی سرمایہ کاری بالکل نہ ہونے دی۔ یہ نہیں کہ صنعتی سرمایہ کاری سے پہلے پاکستان میں کوئی قومی استحصال نہیں تھا۔ چونکہ مختلف صوبوں میں سماجی اقتصادی نابرابری تھی اس لئے ان میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ صوبہ پنجاب اپنے تجارتی سرمایہ اور زرعی پیداوار میں جنسی ردوالبط کو لیکر پہلے ہی آگے بڑھ چکا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سندھ اور بلوچستان میں اپنی نوآبادیاں بنالی تھیں۔ بنگال کی زرعی پیداوار خصوصاً پٹ سن اور چائے مغربی پاکستان کے برآمدی تاجروں نے ہتھیالی تھیں۔ اسی تجارتی

سرمایہ کے گروہ نے بلوچستان کی معدنیات اور سوات کے زمرد بھی اپنے قابو میں کر لئے تھے۔ تاہم یہ استحصال اپنے پھیلاؤ اور شدت کے لحاظ سے محدود تھا لیکن گماشتہ صنعتی سرمایہ کی تخلیق اور انکار کی بدولت یہ قومی استحصال لامحدود اور شدید تر ہو گیا۔ جس کی نوعیت آمرانہ نو آبادکارانہ تھی۔ اس بنیادی قومی استحصال کا عکس سیاسی صورت حال پر بھی پڑا۔ چنانچہ سیاسی اقتدار اس استحصالی گروہ کے ہاتھ میں رہا۔ بدلتی ہوئی حکومتیں اس اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے بنائی گئیں اور مختلف ادوار میں جب بھی اس اقتدار کے لئے خطرہ پیدا ہوا تو مارشل لا نافذ کر کے اور سیاسی و شہری حقوق سلب کر کے اسے مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی۔ فوج اور نوکر شاہی جو در اصل سامراج کی محکوم اور اطاعت گذار تھی اور اس استحصالی گروہ کی ممد و معاون تھی اور اسی باعث ہر چھوٹے صوبے میں وہاں کے عوام کے لئے تجارت، ملازمت اور تعلیم کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ اور مقامی زبان و تہذیب کا گلا گھونٹا گیا۔ غضب تو یہ ہے کہ اس جبر و بے انصافی کو ہی مذہب اور نظریہٗ پاکستان کا لیبل چسپاں کیا گیا اور رجعت پسند سیاست دانوں اور مذہبی علماء نے سیاسی اور مذہبی اسلحہ سے اس استحصال کی حمایت کی۔

بنگال کی علیحدگی کے بعد یہ جبر و تشدد کم نہیں ہوا۔ بلکہ اور بڑھ گیا اس لئے کہ استحصالی طبقہ کی شکارگاہ مختصر ہو گئی۔ اس لئے اب اس کے پاس جو باقی بچا تھا اس کے عوام کا زیادہ سے زیادہ خون نچوڑنے کی کوشش کی گئی۔

اس شدید قومی جبر کا ردعمل قدرتی تھا۔ چنانچہ چھوٹے صوبوں اور محکوم و مظلوم قومیتوں میں قومی رجحان شدت اختیار کر گیا۔ حتیٰ کہ ان قومیتوں کے سیاسی عناصر نے اس استحصال کی سیاسی اور نظریاتی بنیاد یعنی مذہب اور وحدت پاکستان حتیٰ کہ سالمیت پاکستان کے خلاف بھی بغاوت کا اعلان کر دیا۔ جس سے نہ صرف استحصالی طبقہ بلکہ پاکستان کے اکثر غیر سیاسی اور حقیقت حال سے ناواقف حضرات کو بہت دکھ پہنچا اور

اکثریتی قومیت کے شاونیت پسند ترجمانوں اور ان کے ادب وصحافت نے تو اس پر اچھا خاصا واویلا مچایا۔ اور اب بھی مچا رہے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتے یا اس سوچ کو ظاہر نہیں کرتے کہ اگر وحدت و سالمیت پاکستان ایک جبر و بے انصافی بن جائے تو وہ مظلوم قوموں کے لئے ہمیشہ ایک خطرہ اور دشمنی کا مظہر بن جائے گا۔ اور اس سے حب الوطنی کے بجائے ملک دشمنی کے جذبات جنم لیں گے۔ اس ملک کو وطن سمجھنا اور اس سے محبت کرنا مشکل ہے جو مظلوم قوموں اور قومیتوں کا قید خانہ بن جائے اس لئے کہ قید خانہ سے کسی قیدی کو محبت نہیں ہوتی۔

بہرحال ہمیں اس کے ساتھ ساتھ مظلوم قومیتوں کے قومی رجحانات اور قومی تحریکوں کا جائزہ بھی لینا ہوگا۔ بحیثیت مجموعی قومی تنظیموں کی قیادت ادنیٰ سرمایہ دار جاگیردار طبقہ کی قیادت میں ہے اور اسمیں شہری درمیانہ طبقہ چھوٹے زمیندار، دانشور طالب علم اور نوکر شاہی کے عناصر شامل ہیں۔ ان تنظیموں اور تحریکوں کی اکثر حالات میں جمہوری اور انقلابی نہیں بلکہ نوکر شاہانہ اور رجعت پسندانہ ہے اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ان قومی تحریکوں کی قیادت ایک غیر ترقی یافتہ اور پسماندہ سرمایہ دار اور جاگیردار، وڈیروں خوانین اور سرداروں کے ہاتھوں میں ہے جو زیادہ تر سامراج کی جانب جھکتا ہے اور جو سامراجی طاقتوں سے پاکستان کا استحصال کرنے والے اجارہ داروں کے سروں کے اوپر علیحدہ معاملات طے کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح ان قومی تحریکوں میں ایک واضح اور غیر مبہم جمہوری (جاگیردار مخالف) اور قومی (سامراج مخالف) مافیہہ موجود نہیں ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان میں کہیں کہیں علیحدگی، انتشار، بیگانگی عوام کے درمیان تفرقہ پسندی حتیٰ کہ نسل پرستی کا آہنگ غالب ہے پھر قدرتی طور پر عوام سے خوفزدہ ہونے کی وجہ سے ان تحریکوں کے بالائی سطح کے لیڈر عوامی تحریک کے بجائے سودے بازی میں زیادہ یقین رکھتے ہیں بالخصوص وہ ان میں کسانوں کی

شمولیت کے بالکل قائل نہیں ہیں حالانکہ لازماً ہر سو قومی تحریک کی ریڑھ کی ہڈی کسان ہوتے ہیں ان تحریکوں کی قیادت میں اہم قومی جمہوری تبدیلیوں، سماجی اقتصادی اصلاحات بیرونی اور گماشتہ سرمایہ کا خاتمہ صنعت و معیشت کی سوشلسٹ طرز پہ نشوونما، اصلاح آراضی، بنیادی حقوق اور سیاسی و سماجی آزادی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس لئے ان تبدیلیوں سے خود ان کے مخصوص مفادات پر ضرب پڑتی ہے۔ پھر دوسری بات یہ ہے کہ یہ قومی تحریکیں پورے طور پر سامراج کے خلاف عالمی تحریک سے بالکل بیگانہ ہیں اور اس طرح یہ دنیا کے ترقی پسند اور سامراج مخالف انقلابی قوتوں کے سرچشمہ سے منقطع ہیں۔ جس سے قومی استحصال کے خلاف ان کی جدوجہد کمزور اور گم کردہ راہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ہر ترقی پسند اور جمہوری قومی تحریک کو اپنے نظریہ کے اعتبار سے بین الاقوامی اور سامراج مخالف ہونا چاہیئے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا نوع کی قومی تحریک کے قائد اکثر مختلف قومیتوں کے محنت کش عوام میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ اس کی قیادت کا رجعت پسندانہ طبقاتی پہلو ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکتے کہ قومی استحصال کرنے والے عناصر ایک مٹھی بھر مخصوص مفادات رکھنے والا ٹولہ ہے۔ استحصال کرنے والی قومیت کے سارے عوام نہیں ہیں مثلاً ہم سارے پنجابی عوام کو چھوٹی قومیتوں کا دشمن نہیں سمجھ سکتے۔ جبکہ وہ عوام بالخصوص محنت کش عوام خود اسی استحصالی طبقہ کے ظلم و استحصال کا شکار ہیں۔ وہ اس بات سے انحراف کرتے ہیں کہ قومی استحصال طبقاتی استحصال کا ایک حصہ اور اس کا ایک پرتو ہے۔ اس لئے قومی جدوجہد کو طبقاتی جدوجہد کے شانہ بشانہ چلنا چاہیئے۔ اور اسے محنت کش طبقہ کی قیادت میں چلنا چاہیئے نیز اس میں محنت کشوں کی بھرپور شمولیت ہونی چاہیئے یہ امر واضح ہے کہ جب پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے محنت کش عوام کے دشمن مشترک ہیں تو انہیں اپنی آزادی کی تحریک بھی متحد اور

مشترک ہو کر چلانا چاہیئے۔ اس نظریۂ سے دیکھا جائے تو ہمیں سندھ کے وڈیروں، بلوچستان کے سرداروں اور سرحد کے خوانین کی بہ نسبت پنجاب کے محنت کش عوام اور ترقی پسند عناصر میں معیاری اور مقداری اعتبار سے زیادہ دوست ملیں گے جس سے جبر وظلم، بے انصافی اور استحصال کے خلاف لڑنے والا لشکر زیادہ وسیع اور زیادہ مضبوط ہوگا۔ اس لئے مظلوم قوموں کی تحریک میں تفرقہ پردازی نسل پرستی اور شاونیت کی گنجائش نہ ہونا چاہیئے۔

متذکرہ بالا نکات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمیں ہر قومی جبر، نابرابری، بے انصافی اور استحصال کے خلاف پرزور جدوجہد جاری رکھنا چاہیئے۔ قومی جبر کے خلاف جدوجہد نہ صرف اپنی مافیہہ میں جمہوری ہے بلکہ یہ محنت کش طبقہ کے اتحاد اور انقلابی تحریک کے لئے ضروری ہے۔ ہمیں یہ مطالبہ کرنا چاہیئے کہ پاکستان جیسے کثیر القومی ملک میں ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کے علاوہ اور کسی قسم کے طرز حکومت کی گنجائش ایک ایسا وفاق جس میں تین یا چار سے زیادہ محکمے نہ ہوں اور جس کے تحت باقیماندہ تمام محکمے اور اختیارات وفاق میں شامل ہونے والی وحدتوں کے پاس ہوں یہ بھی ضروری ہے کہ وفاق میں وحدتوں کی شمولیت رضا کارانہ ہو کیونکہ جبر محض محکومی اور بے اعتمادی کی تخلیق کرتا ہے۔ حقیقی اتحاد کو جنم نہیں دیتا۔ نقشہ پر بنی ہوئی ہر ملک کے حدود اربعہ کی لکیروں کو اس ملک کے عوام کے دلوں سے گذرنا چاہیئے۔ ان لکیروں کو کسی حالت میں زنجیروں کی شکل اختیار نہ کرنا چاہیئے۔

ہاں یہ بات پھر دہراتا ہوں کہ قومی تحریک کو عوامی اتحاد اور عوامی شمولیت کا مظہر ہونا چاہیئے اور جس کا رخ سامراج مخالف اور قومی جمہوری ہدف کی جانب ہونا چاہیئے۔

سید جعفر احمد

کنفیڈریشن کیوں!

ایک تجزیہ

پاکستان کی صبح آزادی کو طلوع ہوئے تقریباً چار عشرے ہو رہے ہیں۔ صدیوں پر محیط تاریخی عمل کے تناظر میں یہ مدت بہت مختصر ہونے کے باوجود ایک مملکت کے لئے بنیادی امور پر اتفاق رائے، حکمت عملی کے تعین اور متعینہ مقاصد کی طرف ابتدائی مگر مربوط و منضبط پیش قدمی کے نقطۂ نظر سے اتنی مختصر بھی نہیں، مگر پاکستانی امور کے کسی بھی ناظر کے لئے یہ امر باعث حیرت ہوگا کہ آزادی کے بعد سے اب تک کا یہ دور مذکورہ حوالوں سے ایک عرصۂ رائیگاں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ جن بنیادی امور پر آغازِ سفر ہی میں اتفاقِ رائے ہو جانا چاہیئے تھا ان پر اہلِ سیاست ہمیشہ منتشر الخیالی کا شکار رہے ہیں جس کے نتیجے میں ملک سیاسی بحرانوں کی آماجگاہ بنا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہر بحران کے بطن سے نئے بحران جنم لیتے رہے ہیں اور ہر نیا بحران پچھلے بحران کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ اور کثیر الجہات ثابت ہوا ہے۔ بحرانوں کے اس تسلسل نے ہمارے قومی وجود کے اطراف خدشات اور اندیشہ ہائے دور و دراز کے مضبوط حصار کھینچ دیئے ہیں جن میں سے امید کی کوئی کرن اندر داخل نہیں ہو پاتی۔ ایک عام شہری غیر یقینی کی کیفیت سے دوچار ہے جس نے ملکی اداروں کے اوپر اس کے اعتماد کو تقریباً ختم کر دیا ہے، وہ اپنے حالات اور گرد و پیش میں ہونے والے واقعات سے بڑی حد تک لاتعلق ہو کر بیٹھ گیا ہے اور روایتی اور مروجہ سیاست میں اس کی دلچسپی بظاہر ماند پڑ گئی ہے۔

پاکستان سے محبت رکھنے والے ہر باشعور شخص کے لئے اس صورت حال پر غور کرنا ناگزیر ہو چکا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آج تک ہم جن سیاسی بحرانوں کے گرداب میں پھنسے رہے ہیں ان کے اسباب کیا تھے۔ ان سے کس صورت میں بچا جا سکتا تھا اور آج ملک کو سیاسی بحران کی تہہ سے نکالنے کے

کیا ذرائع ہو سکتے ہیں۔

سیاسی دائرۂ کار میں پاکستان کو بنیادی طور پر دو قسم کے مسائل کا سامنا رہا ہے۔ ایک تو وہ مسائل جو وقتی حالات اور معروضی صورت حال کا نتیجہ تھے اور دوسرے وہ جو مستقل اہمیت کے حامل تھے اور ایک تسلسل کے ساتھ جاری رہے۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو مسائل کی اول الذکر قسم بھی بڑی حد تک مستقل نوعیت کے مسائل ہی کا نتیجہ تھی۔ مستقل نوعیت کے مسائل میں جو ہر سیاسی بحران کی پشت پر کار فرما نظر آتے ہیں سر فہرست صوبائی خود مختاری یعنی مرکز اور صوبوں کے دائرۂ کار کے تعین اور ان کے باہمی تعلقات کی نوعیت کا مسئلہ ہے۔ بغور دیکھا جائے تو یہ مسئلہ قیام پاکستان کے بعد سے ہی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے۔ یہ اس مسئلے کو خوش اسلوبی کے ساتھ حل کرنے میں ہمارے سیاسی اکابرین کی ناکامی ہی تھی جس کے نتیجے میں سابقہ مشرقی پاکستان کی ملک سے علیحدگی کا المیہ پیش آیا تھا جس میں لاکھوں جانوں کا اتلاف ہوا تھا اور اقوام عالم میں ملک عزیز کی نیک نامی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا تھا۔ المیہ مشرقی پاکستان کے بعد گو کہ صوبائی خود مختاری کے مسئلے کو حل کرنے کی سمت میں کچھ پیش رفت بھی ہوئی اور اس عمل میں ۱۹۷۳ء کے متفقہ دستور نے خاطر خواہ کردار بھی ادا کیا مگر مختلف وجوہ کی بنا پر یہ عمل جاری نہ رہ سکا۔ اور آج صوبائی خود مختاری کا مسئلہ ایک مرتبہ پھر ہماری سیاسی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ بن کر ابھر رہا ہے اور اُن لوگوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے جو مرکز کے وسیع اختیارات اور ملک کے ایک صوبے کے سیاسی، اقتصادی، انتظامی و فوجی میدانوں میں دوسرے صوبوں پر تفوق کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ کل تک جو شکایت صرف مشرقی پاکستان یا مغربی حصے کے بعض مخصوص سیاستدانوں اور اکا دکا سیاسی جماعتوں کو تھیں انہیں کی تکرار آج بیشتر سیاستدانوں کے بیانات اور سیاسی جماعتوں کی قرار دادوں اور دیگر دستاویزات میں نظر آتی ہے۔ بقول فیض احمد فیض ؎

جو گذرتے تھے داغ پر صدمے
اب وہی کیفیت سبھی کی ہے

یہی نہیں بلکہ اب مسئلہ صوبائی خود مختاری تک محدود نہیں رہا ہے بلکہ اب قومیتوں کی خود مختاری کا موضوع اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے اور سیاسی شعور رکھنے والا کوئی بھی شخص اس حقیقت کا ادراک کر سکتا ہے کہ مستقبل میں یہی مسائل ہماری ملکی سیاست کا محور بنیں گے۔ ان مسائل کو کس انداز میں حل کیا جاتا ہے

اور ارباب اختیار ان کی جانب کس نوع کے رویے کا مظاہرہ کرتے ہیں، یہ مستقبل کے حوالے سے غالباً سب سے اہم سوالات ہیں مسائل کو طاقت کے استعمال یا مصنوعی طریقوں یا ترغیب وتحریص کے ذریعے حل کرنے کے نتائج شاید اس سے مختلف نہیں ہوں گے جو مشرقی پاکستان کے معاملے میں سامنے آئے تھے۔ دوسرا طریقہ مسائل کو سائنٹفک انداز میں حل کرنے کا ہے اور یہی سیاسی دانشوروں، سیاسی اکابرین اور صائب الرائے حضرات کا کام ہے کہ وہ اس ضمن میں قوم کی راہنمائی کریں۔

کنفیڈریشن کے مسئلے کو بھی اسی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ کنفیڈریشن کی اصطلاح پہلی مرتبہ ہماری سیاسی لغت میں شامل نہیں ہوئی ہے۔ ماضی میں بھی مختلف اوقات میں یہ اصطلاح اخبارات میں شائع ہوتی رہی ہے اور خان عبد الغفار خان، جی۔ ایم۔ سید، نواب اکبر بگٹی کے حوالے سے کنفیڈریشن کے مختلف تصورات زیر بحث رہے ہیں۔ حال ہی میں صوبہ سرحد کے سیاستدان اور موجودہ وفاقی وزیر اسلم خٹک کا یہ بیان بھی اخبارات میں شائع ہوا ہے کہ اسکندر مرزا کے زمانے میں پاکستان اور افغانستان کی کنفیڈریشن کی تجویز بعض حلقوں کے زیر غور رہی تھی۔ غرض کنفیڈریشن کی اصطلاح پاکستانی قارئین کے لئے نامانوس نہیں ہے۔ البتہ ۱۹۸۵ء میں اس اصطلاح نے اس وقت غیر معمولی تشہیر حاصل کی جب لندن میں مقیم پاکستان کے چند اہم سیاسی رہنماؤں نے نہ صرف کنفیڈریشن کا پروگرام پیش کیا بلکہ اس کے حصول کے لئے ایک فرنٹ یا محاذ بھی تشکیل دیا نیز مجوزہ کنفیڈریشن کے آئینی خاکے کے بنیادی نکات بھی شائع کر دیئے۔ اس لحاظ سے کنفیڈریشن کا تازہ ترین خیال ماضی میں اس موضوع پر پیش کردہ خیالات کے برخلاف نہ تو محض نعرے کی حیثیت رکھتا ہے اور نہ ہی اسے کسی فرد واحد کی موشگافی کہہ کر ایک طرف رکھا جا سکتا ہے۔ تازہ ترین کاوش کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ اس کے پیچھے ایک سے زیادہ سیاسی لیڈر موجود ہیں بلکہ فرنٹ میں شامل سیاسی قائدین کسی ایک صوبے سے نہیں بلکہ ملک کے تین صوبوں یعنی سندھ، بلوچستان اور سرحد سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ اس ضمن میں بڑی حد تک مربوط انداز میں کام کرنے کا مظاہرہ بھی کر رہے ہیں۔ ماضی میں پیش کئے جانے والے تصورات کنفیڈریشن اور حالیہ خاکے میں ایک بنیادی نوعی فرق بھی پایا جاتا ہے۔ ماضی میں پیش ہونے والے تصورات گو کہ ایک دوسرے سے مختلف تھے مگر ان کی قدر مشترک یہ تھی کہ ان میں پاکستان کا کسی دوسرے ملک یا ممالک کے ساتھ کنفیڈرل نوع کا معاہدہ پیش نظر تھا جبکہ حالیہ تصور کے مطابق ملک کے موجودہ چار صوبوں ہی کے درمیان کنفیڈریشن کا قیام مقصود

ہے۔ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو اس نوعی فرق ہی نے حالیہ تصور کو ماضی کے تصورات سے مقابلے میں زیادہ قابلِ بحث بنایا ہے۔

ہماری دانست میں کنفیڈریشن کے مسئلے کا پوری تفصیل کے ساتھ تجزیہ ہونا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض حلقے اس موضوع پر تنقید کو بھی مسئلے کو ہوا دینے کے مترادف خیال کرتے ہوں۔ خود ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ بعض صورتوں میں اور بعض مواقع پر کسی چیز پر کی جانے والی تنقید بھی اس کی تشہیر کا باعث بن سکتی ہے اور اہلِ سیاست اسے حکمت عملی (Tactics) کی غلطی شمار کرتے ہیں لیکن تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ عموماً مسائل پر گفتگو سے احتراز بھی اُن کی پیچیدگی میں اضافے کا سبب بن جاتا ہے۔ وہ سیاسی معاشرے جو اپنے استحکام اور روشن مستقبل کی جانب پیش قدمی کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ وہ ہر مرحلے پر اپنی ذہنی و عملی تطہیر پر آمادہ اور غلطیوں کی تلافی پر تیار رہتے ہیں۔ اس ضمن میں بھی سابقہ مشرقی پاکستان ہی کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ ۱۹۶۶ء میں جب عوامی لیگ نے اپنے مشہور زمانہ چھ نکات پیش کیئے تھے تو اُن پر سنجیدہ بحث و مباحثے کے مقابلے میں الزام تراشیوں اور جوابی الزامات کا رجحان زیادہ نمایاں تھا۔ اس طرزِ عمل کا نتیجہ جلد ہی ہمارے سامنے آگیا اور بہت جلد ہی چھ نکات جن کی بنیاد پر عوامی لیگ نے متحدہ پاکستان میں ہونے والے انتخابات میں حصہ لیا اور بھاری اکثریت حاصل کی آزادی کا منشور بن گئے اور ملک کا اکثریتی صوبہ ایک خونریز جنگ کے بعد باقی ماندہ ملک سے الگ ہو گیا۔ متنازعہ مسائل اور موضوعات پر بحث و مباحثے کے حوالے سے سیاستدان تو اپنی مجبوریوں کا عذر پیش کر سکتے ہیں اور کسی حد تک یہ بات قابلِ فہم بھی ہے کہ سیاستدانوں کو تو سیاسی فوائد ہی کے حوالے سے سوچنا ہوتا ہے مگر اہلِ دانش، اساتذہ، صحافیوں اور سیاسی مبصروں کو مسائل کو زیادہ وسیع تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کا کینوس زیادہ وسیع ہونا چاہیئے۔ چنانچہ کنفیڈریشن کے حوالے سے بھی دو طرح کے ردعمل ظاہر کیئے جاسکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس موضوع کو یکسر ممنوع اور حرام (taboo) قرار دے دیا جائے جیسا کہ بعض حلقوں کی رائے ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس موضوع پر علمی تبادلۂ خیال ہو اور ناقدین اس میں جو سقم تلاش کریں انہیں بیان کریں اور اپنی متبادل تجاویز اور آراء عوام کے سامنے پیش کریں۔ کنفیڈریشن کے حامیوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے پروگرام پر ہونے والی تنقید کا علمی سطح پر جواب دیں اور اگر ان کی کسی نظری لغزش کی نشاندہی کی جائے تو وہ اپنے موقف میں اصلاح کریں۔ سندھی، بلوچ، پشتون فرنٹ

کے رہنماؤں ممتاز علی بھٹو، عبدالحفیظ پیرزادہ اور عطاء اللہ مینگل جو کنفیڈریشن کے منصوبے کے اہم ترین وکلاء ہیں، گو کہ سیاسی بیانات کے لب و لہجے کے حوالے سے ملک کے دوسرے سیاسی رہنماؤں سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ مگر اپنے منصوبے کو متعارف کرانے اور اس کے لیے راہ ہموار کرنے کی خاطر ابھی تک انہوں نے کوئی ایسا طریقۂ کار اختیار نہیں کیا ہے جسے آسانی کے ساتھ ناپسندیدہ قرار دیا جاسکے۔ اس کے برعکس انہوں نے مذاکروں، مباحثوں اور مضامین کے ذریعے اپنے پروگرام کی تشہیر کر کے اپنے بارے میں سنجیدہ سرگرمیوں کے دائرے میں کام کرنے کا تاثر دیا ہے۔ ان کے طرزِ عمل کا ردعمل بھی اگر اس سے بہتر نہیں تو کم از کم اس جیسا ہی ہونا چاہیئے۔ کم از کم سیاسی دانشوروں، اساتذہ سیاسیات، دستوری امور کے ماہرین اور دوسرے صاحبانِ قلم کو یک گونہ سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے کی جزئیات کا جائزہ لینا چاہیئے۔ خود ہم نے اپنے لئے یہی دوسرا راستہ منتخب کیا ہے۔

فیڈریشن اور کنفیڈریشن ــــ تاریخی ارتقاء

سیاسی نظاموں کی عموماً تین قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ وحدانی (unitary) وفاقی (federal) اور نیم وفاقی (confederal)۔ ان تینوں نظاموں میں اول الذکر کے بارے میں سیاسی مفکروں میں کوئی خاص ابہام نہیں پایا جاتا اور ہر ایسی مملکت جس میں از روئے دستور جملہ اختیارات ایک مرکزی حکومت کے سپرد کر دیئے جاتے ہیں اور نچلی سطح کی حکومتوں کو خواہ وہ صوبائی حکومتیں ہوں یا مقامی حکومتیں، اختیارات تفویض کرنے یا نہ کرنے یا تفویض کردہ اختیارات کی نوعیت کے تعین کا حق اسی مرکزی حکومت کے پاس ہوتا ہے، بآسانی وحدانی حکومت یا وحدانی مملکت قرار دے دی جاتی ہے۔ چنانچہ برطانیہ کے ایک وحدانی مملکت ہونے کے بارے میں دو رائیں نہیں پائی جاتیں۔ البتہ وفاقی یا نیم وفاقی نظاموں کی تعریف، ان کے نوعی فرق اور دائرہ کار کے بارے میں سیاسی مفکر عموماً بحث و تمحیص میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان دونوں نظاموں میں بعض اقدار مشترک ہیں جبکہ کچھ اقدار مختلف ہیں۔ جب دورانِ مطالعہ مشترک اقدار پر نظر جاتی ہے تو ان دونوں نظاموں میں یگانگت اور مماثلت کا پہلو نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ اس کے برعکس جب ان کی مختلف اقدار پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یہ ایک دوسرے سے کوسوں دور محسوس ہونے لگتے ہیں۔ یہاں قبل اس کے کہ ہم فیڈریشن اور کنفیڈریشن کی تعریف بیان کریں یہ ضروری محسوس

ہوتا ہے کہ اس تنازعے کے چند اسباب بیان کر دیں۔

دیگر سیاسی علوم کی طرح علم سیاسیات میں بھی اصطلاحات کی تعریف ایک نسبتاً مشکل اور پیچیدہ عمل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیاسی حقائق یا مظاہر جن کی تشریح یہ اصطلاحات کرتی ہیں، خود کسی ایک شکل میں یا ایک مقام پر قائم نہیں رہتے۔ حرکت انسانی معاشرے کی بنیادی خصوصیت ہے اور اسی حرکت پذیری کے نتیجے میں معاشروں کا ارتقا ممکن ہوتا ہے۔ ہمہ روز واقع ہونے والی ان تبدیلیوں کے نتیجے میں متعلقہ اصطلاحات کے مفاہیم میں بھی تبدیلی و وسعت آجاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک اصطلاح کچھ وقت گذرنے پر یا کثرتِ استعمال کی وجہ سے پہلے کے مقابلے میں زیادہ وسیع المعنی ہو جاتی ہے۔ یہاں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مثال اس نکتے کو واضح کرنے کے لئے بہت کارآمد ہو سکتی ہے۔ امریکہ کا دستور ۱۷۸۷ء میں بنا تھا۔ اس دستور کو وفاقی دستور قرار دیا جاتا ہے مگر ۱۷۸۷ء میں اسی دستور کے تحت جو وفاقی نظام وجود میں آیا تھا، اس میں اور آج کے امریکی وفاقی نظام میں بہت نمایاں فرق موجود ہے حالانکہ آج بھی وہی دستور موجود ہے جو دو سو سال پہلے مدون ہوا تھا۔ امریکہ کا موجودہ وفاقی سیاسی نظام بھی اسی کے زیر اثر مرتب ہوا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دستور میں کوئی تحریف نہ ہونے کے باوجود آج کا امریکی وفاقی نظام اپنی دو سو سال پرانی شکل و صورت سے مختلف کیوں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ گذشتہ دو سو سالوں میں امریکہ اقتصادی، سائنسی اور فنی اعتبار سے بہت سی منزلیں طے کر چکا ہے۔ دو سو سال قبل امریکی معیشت تاجرانہ سرمایہ داری کے مرحلے میں تھی۔ آج امریکہ مختلف مدارج طے کرتا ہوا عالمی سرمایہ داری نظام کے مرکز ثقل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ اسی طرح دو سو سال قبل امریکہ میں ذرائع رسل و رسائل انتہائی پسماندہ تھے اور زیادہ تر آمد و رفت کے لئے گھوڑوں کا استعمال ہوتا تھا۔ مگر آج امریکہ دنیا کے برق رفتار ذرائع آمد و رفت کا مالک ہے۔ پھر سائنس اور ٹیکنالوجی کی کامرانیوں نے فاصلوں کو قربتوں میں تبدیل کر دیا ہے۔ ان تمام تبدیلیوں کے زیر اثر امریکہ کے سیاسی نظام میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ مثلاً دو سو سال قبل وہاں مرکز اتنا مضبوط نہیں تھا جتنا اب ہے۔ بلکہ بحرانوں کے زمانے میں تو مرکز کی طاقت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ دو عالمی جنگوں کے زمانے میں امریکہ میں غیر معمولی مرکزیت پسندی پائی جاتی تھی۔ ۱۹۳۰ء کے عشرے میں بھی جبکہ امریکہ اقتصادی بحران کا شکار تھا وہاں ریاستوں کے حقوق ماند پڑ گئے تھے اور مرکز کے دائرۂ اختیار میں وسعت

پیدا ہو گئی تھی۔ اسی زمانے میں مشہور انگریز سیاسی مفکر ہیرالڈ لاسکی نے امریکہ کا تفصیلی دورہ کیا تھا اور بعد ازاں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے وہاں وفاقی نظام کی موت کا اعلان کر دیا تھا[1]۔ یہ سب حقائق اپنی جگہ مگر ایک عام امریکی اب بھی اپنے ملک کو ایک وفاقی مملکت قرار دیتا ہے اور اپنے دعوے کے ثبوت میں امریکی دستور کو پیش کرتا ہے جس کو اب بھی امریکہ میں مملکت کی بنیادی دستاویز گردانا جاتا ہے۔ اس دستاویز کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کو مرتب کرنے والے افراد نے جن میں بڑے بڑے مدبر، شامل تھے، بڑے جامع انداز میں ایسے اصول وضع کر دیئے ہیں جن میں توجیہہ و تشریح کی بڑی گنجائش موجود ہے۔ چنانچہ دو سو سال سے امریکی حکومتیں، عدالتیں اور دیگر ادارے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق دستور کے آرٹیکلز کی تشریح کر رہے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی سیاسی نظام کو ایک مقام پر قرار نہیں۔ البتہ اس نظام کے لئے جو نام یا تعریف یا دستوری اصطلاح ابتدا میں مقرر کر دی جاتی ہے وہ عموماً اسی کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ البتہ دشواری اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی شخص اس ملک کے نظام کا دوسرے ملک کے نظام کے ساتھ تقابلی مطالعہ کرتا ہے۔ فرض کریں کہ ایک شخص امریکی دستور اور ہندوستان کے دستور کا موازنہ کرنا چاہے تو بادی النظر میں دونوں دساتیر وفاقیت کے دعویدار ہیں مگر دونوں کے وفاقی نظاموں میں بہت فرق ہے۔ اگر کوئی شخص امریکی دستور کو مثالی وفاقی دستور تصور کرتا ہے تو ہندوستان کا دستور اسکے وحدانی نظام کے قریب نظر آئے گا اور وہ اس کو وفاقی دستور تسلیم کرنے پر مشکل سے آمادہ ہوگا۔ یہی نہیں بلکہ اگر موازنہ دو یکسر مختلف نظاموں کے درمیان کیا جا رہا ہو تو وہاں بھی اس نوع کی پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً برطانیہ ایک وحدانی مملکت ہے جبکہ پاکستان اپنے آپ کو وفاقی مملکت قرار دیتا ہے مگر ان دونوں ملکوں میں مرکزی حکومتوں کے اختیارات کا موازنہ کیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنے میں ذرا دیر نہیں لگے گی کہ برطانیہ میں مقامی حکومتوں کے اختیارات بھی ہمارے صوبوں کے اختیارات سے زیادہ مؤثر ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس عقدہ کو کس طرح حل کیا جائے۔

یہاں ہم ایک اور بدیہی حقیقت کی طرف اشارہ کریں گے اور وہ یہ کہ نظریہ (theory) حقیقت

---

1. H.J. Laski, "The Obsolescence of Federalism" The New Republic, xcviii (1939), p. 367, quoted in R.L. Watts, New Federations – Experiments in the Commonwealth, (oxford: Oxford University Press, 1966), p. 5.

کے ظہور میں آنے سے پہلے وجود میں نہیں آتا۔ بلکہ پہلے ایک حقیقت ظہور پذیر ہوتی ہے اور اس کے بعد انسان اس کو نظریاتی (theoretical) لبادہ فراہم کرتا ہے۔ سیاسی نظاموں کا بھی یہی ہے کہ وہ انسانی ضروریات کے تحت وجود میں آتے ہیں اور انسان ان کو کسی بھی متعلقہ حوالے سے معنون کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک نظام امریکہ میں ۱۷۸۷ء میں مدون ہوا۔ اسے اس کے مدون کرنے والوں نے فیڈرل نظام قرار دیا۔ دوسرا نظام جرمنی میں ۱۸۶۷ء میں تشکیل پایا۔ اس کا نام نارتھ جرمن کنفیڈریشن' رکھا گیا۔ یہ تو دو ملکوں کے نظاموں کی مثالیں ہیں۔ ایسی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ جہاں ایک ہی اصطلاح کو مختلف مفاہیم میں استعمال کیا گیا۔ مثلاً کنفیڈریشن کی اصطلاح ہی کو لے لیں۔ یہ اصطلاح نہ صرف 'نارتھ جرمن کنفیڈریشن' اور امریکہ کی ۱۷۸۱ء کی کنفیڈریشن کے لئے استعمال ہوئی بلکہ آج ناٹو (NATO) یورپی اقتصادی منڈی (EEC) عرب لیگ اور آرگنائزیشن آف افریکن یونٹی (OAU) بھی کنفیڈریشن قرار دی جاتی ہیں۔

سیاسی اصطلاحات کے متعین مفہوم کی عدم موجودگی میں ہمارے لئے کنفیڈریشن اور فیڈریشن کے فرق کو سمجھنا خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔ تاہم اس مشکل کو حل کرنے کا مناسب طریقہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ یہ دونوں اصطلاحات جدید سیاسی معاشروں میں پہلے پہل کس مفہوم میں استعمال ہوئیں اور ان کا انطباق جن ملکوں پر ہوا ان کے سیاسی نظاموں کی نمایاں خصوصیات کیا تھیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ ابتداً سیاسی نظام دو بنیادی خانوں میں تقسیم کر دیئے گئے تھے۔ ایک وحدانی نظام اور دوسرا کنفیڈریشن۔ ان دونوں نظاموں میں بنیادی فرق حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ کی ملکیت کا تھا۔ وحدانی ریاستوں میں جو زیادہ تر ملوکیتوں اور بادشاہتوں پر مشتمل ہوتی تھیں، حاکمیت مرکزی حکومت کے پاس ہوتی تھی۔ ایسی ریاستیں بعض دفاعی ضروریات کے پیشِ نظر باہمی معاہدے کر لیا کرتی تھیں جنہیں کنفیڈریشن کہا جاتا تھا۔ کنفیڈریشن کیونکہ چند متعینہ اور ناگزیر مقاصد کے لئے بنائی جاتی تھی لہٰذا اس میں مرکز کو حاکمیت کا اہل تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ پھر حاکمیت کا روایتی کلاسیکی تصور بھی یہ کہتا تھا کہ حاکمیت نہ صرف یہ کہ مطلق، مکمل اور لامحدود ہے بلکہ ناقابلِ تقسیم بھی ہے۔ مذکورہ بالا مفہوم میں کنفیڈریشن کی اصطلاح پہلے پہل ۱۶۲۲ء میں استعمال ہوئی۔ یہ اصطلاح لاطینی زبان سے انگریزی میں آئی تھی اور لاطینی میں اس کے لئے کنفیڈریشیو (Confederatio) کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔

سترہویں صدی میں یورپ میں تجارتی سرگرمیوں کو خاصا فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ یورپ کی مطلق

العنان نیوڈل ریاستیں ان بڑھتی اور پھیلتی ہوئی تجارتی سرگرمیوں کی راہ میں مزاحم تھیں۔ چنانچہ ایک جانب تجارتی سرمایہ داری، فیوڈل ازم کی جگہ لے رہی تھی تو دوسری طرف ایسی مرکزی حکومتوں کی ضرورت محسوس کی جانے لگی تھی جو ریاستوں کے درمیان تجارتی سرگرمیوں میں ہم آہنگی تجارتی راستوں کے تحفظ اور تجارتی لین دین اور مالی امور میں باقاعدگی پیدا کرسکتیں۔ چنانچہ اگر ماضی میں ریاستوں کے درمیان معاہدے محض ایک دوسرے کو دفاع میں مدد فراہم کرنے کی غرض سے کئے جاتے تھے تو نئے حالات میں ان معاہدوں میں بعض اقتصادی امور بھی شامل ہونے لگے۔ فیڈریشن کی اصطلاح نے اسی پس منظر میں جنم لیا۔ انگریزی زبان میں یہ اصطلاح پہلی مرتبہ ۱۶۲۱ء میں استعمال ہوئی۔ اس کا منبع بھی لاطینی تھی جس میں اس کیلئے فیڈرا سیو (Federatio) کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔

کہنے کو تو فیڈریشن کی اصطلاح ایک جداگانہ اصطلاح کے طور پر وجود میں آگئی تھی اور کنفیڈریشن کے اس وقت کے مروجہ تصور سے نسبتاً مختلف مفہوم میں استعمال بھی ہوتی تھی مگر ایک عرصے تک ان دونوں اصطلاحات کا مفہوم نمایاں طور پر جدا نہیں ہوا تھا اور اکثر انہیں ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر بھی استعمال کر لیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ مشہور زمانہ "فیڈرلسٹ پیپرز"[2] میں اس کے مصنفین الیگزینڈر ہیملٹن، جیمس میڈیسن اور جان جے نے ان اصطلاحات کو بڑی آزادی کے ساتھ ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مذکورہ کتاب کوئی معمولی کتاب نہیں ہے بلکہ سیاسی ادب میں کلاسیک کی حیثیت رکھتی ہے۔ خود امریکہ میں یہ دستور اور اعلان نامۂ آزادی کے بعد غالباً سب سے اہم دستاویز ہے۔

البتہ امریکی دستور کی تدوین کے بعد فیڈریشن اور کنفیڈریشن کے فرق کو پہلی مرتبہ واضح طور پر محسوس کیا گیا۔ اس دستور کے نتیجے میں امریکہ جدید سیاسی تاریخ میں پہلی فیڈرل مملکت کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا۔ یہاں ہم امریکہ کے حوالے سے کنفیڈریشن اور فیڈریشن کے فرق کا مختصراً جائزہ لیں گے۔

۱۷۷۶ء میں امریکہ نے برطانیہ کے تسلط سے آزادی حاصل کی۔ آزادی حاصل کرنے والی ریاستوں کی تعداد تیرہ تھی۔ آزادی سے ذرا قبل ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جس کا مقصد ایک دستور کی تدوین تھا۔ اس کمیٹی نے "آرٹیکلز آف کنفیڈریشن" تیار کئے جنہیں کانگریس نے ۱۷۷۷ء میں منظور کیا۔ کانگریس کی منظوری کے

---

2. Hamilton, Madison and Jay, The Federalist Papers, (New York: The New American Library, Inc., 1961).

بعد ان آرٹیکلز کو سب ریاستوں کو روانہ کیا گیا تاکہ وہ بھی فرداً فرداً اس کی منظوری دے سکیں۔ مگر ریاستوں کی جانب سے اس کی منظوری کا عمل چار سال میں یعنی ۱۷۸۱ء میں مکمل ہوا۔

"آرٹیکلز آف کنفیڈریشن" ایک ڈھیلے ڈھالے اتحاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ اتحاد میں شامل تیرہ ریاستیں چند مشترکہ مسائل کے پیشِ نظر ایک دوسرے سے اشتراک پر آمادہ ہوئی تھیں۔ ان مسائل میں سرفہرست خارجہ امور تھے۔ کنفیڈریشن کے ڈھانچے میں کسی مرکزی انتظامیہ کی گنجائش نہیں تھی اور پارلیمنٹ یعنی کانگریس ہی حکومت کے انتظامی شعبے کی بھی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ کنفیڈریشن میں مرکزی عدلیہ کا بھی کوئی تصور نہیں تھا اور ہر ریاست اپنا الگ عدالتی ڈھانچہ رکھتی تھی۔ کانگریس کو گو کہ کنفیڈریشن کا مرکزی ادارہ قرار دیا گیا تھا مگر وہ بھی ایک اپاہج ادارے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ تمام اہم امور پر دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہوتی تھی۔ خود "آرٹیکلز" میں کسی ترمیم کے لئے متفقہ منظوری ضروری تھی۔ اتفاقِ رائے کی یہ پابندی اس وقت کے حالات میں ناقابلِ عمل تھی۔ ریاستوں نے ایک طویل جدوجہد کے بعد برطانیہ سے آزادی حاصل کر کے ٹیکسوں کے نظام اور تجارت پر اپنا کنٹرول بحال کیا تھا۔ وہ اس کامیابی سے کسی قیمت پر دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں تھیں، یہاں تک کہ خود اس کانگریس کے حق میں بھی نہیں جو خود ان کی اپنی تشکیل کردہ تھی اور جس کو امریکی پارلیمنٹ کی حیثیت حاصل تھی۔ کانگریس کے حق میں اپنے بعض اختیارات سے دستبردار نہ ہونے کی وجہ سے ریاستوں نے اپنے خود مختار تشخص کا انتظام تو کر لیا مگر خود کانگریس کو غیر مؤثر بنا دینے کے نتیجے میں وہ مقصد بھی ناممکن الحصول بن گیا جس کے تحت اتحاد و اشتراک کا ڈول ڈالا گیا تھا۔

کانگریس پر جو تحدید تھی وہ بنیادی طور پر دو طرح کی تھی۔ پہلی کمزوری کانگریس کی یہ تھی کہ وہ تجارت کو کنٹرول کرنے کا اختیار نہیں رکھتی تھی۔ اس کے نتیجے میں ریاستوں نے درآمد و برآمد کے محصول کی بابت آپنے علیحدہ علیحدہ نرخ مقرر کر دیئے اور اپنی ریاستوں کے قوانین بھی اپنی اپنی مرضی سے تشکیل دے ڈالے۔ کانگریس کی دوسری کمزوری یہ تھی کہ وہ ٹیکسوں کو جمع کرنے کے اختیار سے بھی محروم تھی۔ اس نے بس ریاستوں کے لئے ٹیکسوں کا کوٹا مقرر کر دیا تھا اور ان کی رضاکارانہ ادائیگی کا طریقہ طے کر دیا تھا۔ جتنا عرصہ ان "آرٹیکلز" پر عملدرآمد ہوا، اس دوران کسی بھی سال ٹیکسوں کی وصولی کانگریس کی طے کردہ مقدار سے ایک چوتھائی سے زیادہ نہیں رہی اور ان ٹیکسوں کے حصول کے لئے کانگریس

کی ساری اپیلیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔

"آرٹیکلز آف کنفیڈریشن" کی یہی خامیاں ایک مختلف ڈھانچے کی ضرورت پر منتج ہوئیں۔ چنانچہ ۲۵ مئی ۱۷۸۷ء کو ان "آرٹیکلز" میں ترامیم کے مقصد سے فلاڈیلفیا میں مختلف ریاستوں کے پچپن نمائندوں کا ایک کنونشن منعقد ہوا جو سترہ ہفتے جاری رہا۔ اس دوران ریاستوں کی ایک دوسرے کے خلاف شکایات، اُن کے تضادات اور مندوبین کے اختلافات پر کھل کر مباحثہ ہوا۔ بالآخر ۱۷ ستمبر ۱۷۸۷ء کو پچپن میں سے بیالیس مندوبین اس حتمی دستاویز پر دستخط کرنے پر آمادہ ہو گئے جو ریاستہائے متحدہ امریکہ کا دستور ہے۔ اس دستور پر اکثریتی مندوبین کے اتفاق کے باوجود اس کی مختلف ریاستوں کی طرف سے بھی منظوری ضروری تھی کیونکہ یہ دستور "آرٹیکلز آف کنفیڈریشن" میں ترمیم کی حیثیت رکھتا تھا اور "آرٹیکلز" میں بیان کردہ طریقۂ ترمیم کی رُو سے اس کا متعلقہ ریاستوں سے منظور کروایا جانا ضروری تھا۔ البتہ مذکورہ کنونشن میں مندوبین نے ترمیم کے طریقۂ کار میں ایک تبدیلی پر اتفاق کیا اور وہ یہ کہ سب ریاستوں کی جانب سے اس کی منظوری کی پرانی شرط کو ختم کر دیا گیا اور اس کے بدلے یہ طے کیا گیا کہ جونہی دو تہائی ریاستیں اس کی منظوری دے دیں، اس کو ملک کے دستور کے طور پر اختیار کر لیا جائے۔

مرکز اور ریاستوں کے تعلقات کے حوالے سے یہ دستور، جس کو ایک فیڈرل نظام کا حامل قرار دیا گیا، کیا خصوصیات رکھتا ہے اور "آرٹیکلز آف کنفیڈریشن" سے کن معنوں میں مختلف ہے۔ اس سوال کے جواب سے ہمیں یہ معلوم ہو سکے گا کہ جدید تاریخ میں قائم ہونے والا پہلا وفاقی ڈھانچہ اپنے پیشرو کنفیڈرل ڈھانچے سے کن معنوں میں مختلف تھا۔

کنفیڈرل ڈھانچے میں مرکز محض ریاستوں کے تفویض کردہ بعض متعین فرائض سرانجام دیتا تھا اور ریاستوں کے باشندوں سے اس کا کوئی براہ راست تعلق نہیں تھا جبکہ فیڈرل دستور کی رُو سے مرکز محض ریاستوں ہی سے نہیں بلکہ اُن کے باشندوں سے بھی براہ راست تعلق رکھتا ہے۔ "آرٹیکلز آف کنفیڈریشن" میں مرکز محض پارلیمنٹ یعنی کانگریس پر مشتمل تھا اور کانگریس کے بنائے ہوئے قوانین پر عملدرآمد کی ذمہ داری اسی کی چند کمیٹیوں کے سپرد تھی یعنی مرکز میں کوئی انتظامیہ (executive) موجود نہیں تھی۔ اس کے برعکس فیڈرل ڈھانچے میں ایک باقاعدہ انتظامیہ موجود ہے جو قوانین پر عملدرآمد کی ذمہ داری پوری

کرتی ہے۔کنفیڈریشن میں تجارت پر مرکز کا کوئی کنٹرول نہیں تھا جبکہ دستور کی تدوین کے بعد متعارف ہونے والے نظام میں مرکز بیرونی تجارت ہی نہیں بلکہ ریاستوں کے مابین تجارت کا بھی نگران ہے۔ "آرٹیکلز آف کنفیڈریشن" مرکز کو ٹیکس لگانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔دستور نے مرکز کو ایسے بہت سے اختیارات فراہم کئے۔ایک اہم فرق دونوں نظاموں میں یہ تھا کہ کنفیڈرل سکیم میں مرکزی سطح پر کوئی عدالت نہیں تھی۔جبکہ فیڈرل نظام نے مرکز کی سطح پر ایک انتہائی اہم اور مؤثر عدلیہ فراہم کی جس کو سپریم کورٹ کا نام دیا گیا۔امریکہ کے حوالے سے کنفیڈریشن اور فیڈریشن میں ایک اور قابلِ ذکر معیارِ تخصیص خود دستور ہے۔یعنی کنفیڈریشن میں کوئی باقاعدہ دستور موجود نہیں تھا اور ریاستوں کے مابین طے پانے والے انتظام کی نوعیت محض معاہدے کی تھی جس کو "آرٹیکلز آف کنفیڈریشن" کا نام دے دیا گیا تھا۔البتہ جب فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا تو اس کی اساس ایک دستور پر رکھی گئی۔بعض مصنفین تو کنفیڈریشن کی جگہ لینے والے نظام کے لئے فیڈریشن کی اصطلاح بھی استعمال نہیں کرتے بلکہ "دستوری نظام" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔چنانچہ اینڈریوسی میک۔لافن (Andrew C. McLaughlin) نے تو اپنی تصنیف کا نام ہی "کنفیڈریشن اور دستور" رکھا ہے[3]۔اس بات کو یہ حقیقت مزید تقویت پہنچاتی ہے کہ امریکہ کے دستور میں کہیں بھی فیڈرل یا فیڈریشن کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔

امریکہ میں کنفیڈریشن سے فیڈریشن کی طرف سفر کے اس تذکرے کا مقصد یہ تھا کہ ان دونوں اصطلاحات کے لغوی معنوں میں پائی جانے والی قربت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ابہام میں الجھنے کے بجائے یہ دیکھا جائے کہ ان دونوں عنوانات کے تحت جو نظام معرضِ وجود میں آئے ان میں کیا ترکیبی اور نوعی فرق تھا۔اس مقصد کے لئے امریکہ کا انتخاب ہم نے اس لئے کیا کہ قرونِ وسطیٰ کے غروب ہونے کے بعد جب عہدِ جدید کا آغاز ہوا تو اس نئے عہد میں وہی پہلا ملک تھا جہاں فیڈرل نظام کا تجربہ کیا گیا۔

امریکی تجربے کی روشنی میں اگر کنفیڈریشن اور فیڈریشن کی کوئی ممکنہ تعریف بیان کی جا سکتی ہے تو وہ یہ ہو سکتی ہے کہ کنفیڈریشن میں تمام تر حاکمیت ریاستوں کے پاس ہوتی ہے۔جو بعض انتظامی

---

3. Andrew C. McLaughlin, The Confederation and the Constitution: 1783-1789, (New York: Collier Books, 1971).

نوعیت کے مسائل کے پیشِ نظر ایک مرکز کی تشکیل کرتی ہیں۔ اس مرکز کی اپنی کوئی خاص حیثیت نہیں ہوتی اور یہ جملہ امور میں ریاستوں کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ اس کے فعال یا غیر فعال ہونے کا مدار و انحصار ریاستوں کی ضروریات پر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس فیڈریشن میں حاکمیت مرکز اور وحدتوں کے درمیان تقسیم ہوتی ہے اور دونوں اپنے اپنے حصّے کے اختیارات کے لئے ایک دوسرے کے بجائے دستور کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔ نیز مرکز اور وحدتوں کے رشتے کی نوعیت معاونت کی ہوتی ہے نا کہ ماتحت کی۔ کنفیڈریشن اور فیڈریشن میں دوسرا معیارِ تخصیص یہ ہے کہ اول الذکر میں مرکز، ریاستوں سے سروکار تو رکھتا ہے مگر ان کے عوام سے براہِ راست طور پر اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا جبکہ بعد الذکر میں مرکز نہ صرف ریاستوں سے تعلق رکھتا ہے بلکہ ان کے باشندوں سے بھی اس کا براہِ راست تعلق ہوتا ہے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں فیڈریشن کے قیام کے بعد شمالی امریکہ اور یورپ کے کئی ملکوں میں اس تصور کو مقبولیت حاصل ہوئی اور گذشتہ دو سو سال میں کینیڈا، سوئٹزرلینڈ، آسٹریا، یوگوسلاویہ، بلجیئم اور مغربی جرمنی میں فیڈرل نظام کے تجربے کئے گئے۔ اس کے علاوہ آسٹریلیا، ہندوستان اور ملائیشیا میں بھی وفاقی نظام کی مثالیں میسر آجاتی ہیں۔ ان سب تجربات میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے اور ہر ملک میں اس نظام نے نسبتاً مختلف شکل اختیار کی ہے چنانچہ ان سب ملکوں میں وفاقی نظاموں کا تقابلی مطالعہ خاصا دشوار اور پیچیدہ عمل ہے۔ ان میں سے بعض ممالک میں وفاقی نظام اپنی حقیقی روح کے ساتھ موجود ہے۔ البتہ کچھ ممالک میں وفاقی ڈھانچہ تو ضرور موجود ہے مگر وہ اس نظام کی روح سے عاری ہے۔ وفاقی نظاموں کی ان گوناگوں شکلوں کی موجودگی میں ایک مرتبہ پھر یہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ حقیقی وفاقی نظام کس کو قرار دیا جائے۔ اس کا ایک آسان جواب یہ ہے کہ جس نظام میں وفاقی روح زیادہ موجود ہے وہی حقیقی وفاقی نظام ہے۔ سوال یہ ہے کہ وفاقیت کی روح کیا ہے؟ جیسا کہ ہم نے وفاقی نظام کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ایک وفاقی نظام میں حاکمیت مرکز اور وحدتوں کے درمیان تقسیم ہوتی ہے اور نہ تو مرکز اور نہ ہی وحدتیں دوسرے کے دائرہ کار میں مداخلت کی مجاز ہوتی ہیں۔ نیز ان کے درمیان ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا تعلق تو ہوتا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی دوسرے کو زیر کرنے کے حق سے محروم ہوتا ہے۔ یہی وفاقیت کی روح بھی ہے۔ اس کا جب مختلف ممالک پر اطلاق کیا جاتا ہے تو دراصل یہ دیکھنا مقصود ہوتا ہے کہ ان ملکوں میں آیا مرکز اور وحدتوں

کے درمیان مذکورہ نوع کا رشتہ موجود ہے یا نہیں۔ لیکن کیونکہ سیاسی نظام ریاضی کے کلیوں کی طرح اور دو جمع دو چار کے اصول پر نہیں پرکھے جاسکتے لہذا ان میں افراط و تفریط کی گنجائش کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض وفاقی مملکتوں میں مرکز، وحدتوں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ بہتر پوزیشن میں ہوتا ہے۔ بعض دوسرے وفاقی ملکوں میں وحدتوں کا پلہ نسبتاً بھاری ہے۔ دوسرے لفظوں میں بعض ملکوں میں مرکزیت پسند وفاقی نظام ہے جبکہ بعض دوسرے ملکوں میں مرکزیت گریز وفاقی نظام رائج ہے۔ چند ممالک کے نظام مرکزیت پسندی اور مرکزیت گریزی کے بین بین قائم ہیں۔ مرکزیت پسندی اور مرکزیت گریزی کے حوالے سے ان نظاموں کا رجحان کسی طرف بھی کیوں نہ ہو، ان میں وفاقیت کی روح کا کسی نہ کسی درجے میں موجود ہونا ازبس ضروری ہے۔ اگر وفاقیت کی روح ہی ناپید ہو تو پھر ان نظاموں کو وفاقی نظاموں کے ذیل میں رکھ کر پرکھنا ممکن نہیں ہوگا۔ یہاں ہم ایک جدید سیاسی دانشور جی۔ ایف۔ سیور (G.F. Sawer) کا حوالہ دیں گے جنہوں نے اپنی تصنیف "جدید وفاقیت"[4] میں موجودہ دور کے وفاقی نظاموں کو تین عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ اُن کے مطابق وفاقی نظاموں کی پہلی نوع ہم وزن یا مربوط وفاقیت (Co-ordinate Federalism) کی حامل ہے۔ مربوط وفاقیت کی وضاحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسا وفاقی نظام ہے جس میں ایک جانب وحدتیں باہمی طور پر ہم وزن اور یکساں حیثیت کی مالک ہوتی ہیں اور دوسری جانب ایک وحدت مرکز کے مقابل بھی برابر کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وحدتیں آپس میں بھی برابری کی بنیاد پر رابطہ استوار کرتی ہیں اور ہر وحدت مرکز کے ساتھ بھی برابری کی بنیاد پر تعلق قائم کرتی ہے۔ سیور کا کہنا ہے کہ گو اس تصور کا اطلاق وحدتوں کے باہمی تعلق پر نسبتاً آسانی سے ہو جاتا ہے مگر مرکز اور وحدتوں کے باہمی تعلق پر اس کا اطلاق اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ایک وفاق میں مرکز فوجی قوت اور اعزاز و اختیار کا حامل ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کی پوزیشن اور وحدتوں کی پوزیشن میں ایک نمایاں فرق بھی موجود ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ایک وحدت صرف اپنے عوام تک مؤثر ہوتی ہے اور اس کا کوئی اثر دوسری وحدت کے عوام پر نہیں ہوتا، جبکہ مرکز تمام وحدتوں کے عوام کے لئے مؤثر ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مرکزی قانون اور وحدت کے قانون میں تضاد کی صورت میں عموماً یہ اول الذکر ہی ہوتا ہے جو مؤثر

4. G.F. Sawer, Modern Federalism, (London: C.A. Watts, & Co. Ltd., 1969).

تصور کیا جاتا ہے۔ بیٹور کی سکیم میں وفاقی نظاموں کی دوسری قسم معاون وفاقیت (Co-operative Federalism) کی حامل ہے۔ ہم وزن یا مربوط وفاقیت کی طرح معاون وفاقیت کو بھی دو سطحوں پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک تو وحدتوں کے مابین اور دوسرے ایک وحدت اور مرکز کے درمیان۔ اگر وحدتوں کے آپس کے تعلقات یا ایک وحدت کے مرکز کے ساتھ تعلقات محض باہمی رابطے کے نہیں ہیں بلکہ وہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ایک دوسرے کے ممد و معاون ہیں اور ایک دوسرے کی ضروریات کی تکمیل اور مسائل کو حل کرنے میں اشتراک عمل کرتے ہیں تو اس نوع کی وفاقیت کو معاون وفاقیت کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔ بیٹور کی رو سے وفاقیت کی تیسری قسم نامیاتی وفاقیت (Organic Federalism) ہے۔ اس نوع کی وفاقیت میں مرکز کے پاس غیر معمولی اختیارات ہوتے ہیں اور ایک وحدت نہ صرف اپنے اندرونی معاملات میں بلکہ دوسری وحدتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کے ضمن میں بھی مرکز کی رہنمائی کی مرہونِ منت رہتی ہے۔ نامیاتی وفاقیت میں مرکزیت پسندی کا رجحان اس قدر نمایاں ہوتا ہے کہ عملاً وحدتیں محض مرکز کی انتظامی ایجنسیوں کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ چنانچہ بعض سیاسی دانشور نامیاتی وفاقیت کو وفاقیت تسلیم کرنے ہی میں تامل محسوس کرتے ہیں اور اسے وحدانی نظام کے مماثل قرار دیتے ہیں۔

خلاصۂ کلام کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وفاقی نظام وحدتوں کے باہمی تعلق اور ایک وحدت اور مرکز کے تعلق کے حوالے سے تین شکلیں اختیار کر سکتا ہے۔ پہلی شکل ربط و ارتباط کی، دوسری اشتراک و تعاون کی اور تیسری وحدتوں کے، مرکز کے مرہونِ منت ہونے کی۔ مگر ان تینوں صورتوں میں وفاقیت کی روح کا کسی نہ کسی حد تک موجود ہونا ناگزیر ہے۔ اب کیونکہ وفاقیت کی روح سے مراد حاکمیت کی مرکز اور وحدتوں میں تقسیم ہے لہٰذا مذکورہ بالا تینوں نظاموں میں یہ تقسیم مختلف انداز میں ہوگی۔ ہم وزن یا مربوط وفاقیت میں زیادہ تر حاکمیت وحدتوں کے اپنے پاس ہوگی اور وہ مرکز کو ضرورتاً کچھ حاکمیت منتقل کر کے اس کے ساتھ مستقل رابطہ استوار کر لیں گی۔ معاون وفاقیت میں وحدتیں اور مرکز تقریباً برابر برابر حاکمیت کے حامل ہوں گے اور آپس میں اشتراک و تعاون کا رشتہ قائم کریں گے۔ نامیاتی وفاقیت میں حاکمیت کا وافر حصہ مرکز کے پاس رہے گا اور وہ وحدتوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیتا رہے گا۔ اب یہ بات واضح ہے کہ ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت میں بھی نہ تو مرکز اور نہ ہی وحدتیں مکمل طور پر حاکمیت

کی حامل ہیں اور نہ مکمل طور پر حاکمیت سے محروم۔ یہی حقیقت ان تینوں نظاموں کو وفاقیت کے دائرے میں رکھنے کا جواز بھی فراہم کرتی ہے۔ سندھ بلوچ پختون فرنٹ کے رہنما عبدالحفیظ پیرزادہ میلوری کی اس تقسیم کار کا حوالہ دینے کے بعد کنفیڈریشن کو ہم وزن یا مربوط وفاقیت قرار دیتے ہیں حالانکہ کنفیڈریشن اور فیڈریشن کا بنیادی فرق ہی یہ ہے کہ کنفیڈریشن میں تمام تر حاکمیت وحدتوں کے پاس ہوتی ہے اور مرکز محض ایک رابطے کی ایجنسی کے فرائض پورے کرتا ہے۔ اور فیڈریشن میں مرکز حاکمیت کے کسی نہ کسی حصے کا حامل ضرور ہوتا ہے۔ جس طرح نامیاتی وفاقیت کو وحدانی نظام قرار دینا تیکنیکی طور پر غلط ہے اسی طرح ہم وزن اور مربوط وفاقیت کو بھی کنفیڈریشن قرار دینا تیکنیکی اعتبار سے غلط ہوگا۔

کنفیڈریشن کی اصطلاح پر اصرار کے اسباب و مضمرات

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے اور شاید دلچسپ بھی کہ سندھی بلوچ پشتون فرنٹ نے جو آئینی خاکہ شائع کیا ہے اس میں مرکز کو حاکمیت سے مکمل طور پر محروم نہیں کیا گیا ہے مرکز کو کمزور اور بعض صورتوں میں بالکل بے بال و پر رکھنے کے باوجود فرنٹ کی آئینی سکیم اس کے لئے کچھ نہ کچھ حاکمیت ضرور مختص کرتی ہے۔ حفیظ پیرزادہ نے اپنے انٹرویو میں وفاقی نظاموں کی تینوں شکلوں کو بیان کرنے کے بعد ان میں سے اپنے انتخاب کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ:

> "اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کس فیڈریشن کی بات کرتے ہیں۔ ہم ہم وزن یا مربوط فیڈریشن Co-ordinate Federation چاہتے ہیں جس میں صوبے مقتدر ہوں جنہوں نے اس ملک کو بنایا ہے۔ وہ ایک معاہدے کے نتیجے میں اپنے اقتدار اعلیٰ (یا حاکمیت) کے ایک حصے کو مرکزی ایجنسی کے سپرد کر دیں۔"[۵]

گویا پیرزادہ حاکمیت کی تقسیم کے بھی حامی ہیں اور مرکز کو اس کے کچھ حصے کا حقدار بھی ماننے کو تیار ہیں لیکن وہ اپنے پروگرام کو نام کنفیڈریشن کا دیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہم وزن اور مربوط وفاقیت اور کنفیڈریشن کے فرق کو ملحوظ کیوں نہیں رکھتے۔ یہی بات

۵۔ ملاحظہ ہو موجودہ کتاب میں عبدالحفیظ پیرزادہ کا انٹرویو

جب ہم نے خود پیرزادہ سے پوچھی تو انہوں نے اس کا جواب یہ دیا کہ وہ ماضی میں الفاظ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے پیشِ نظر دوٹوک انداز میں بات کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ماضی میں حاکمیت اور خود مختاری کے الفاظ اتنے تواتر کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں کہ ان کا مفہوم دب کر رہ گیا ہے اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حاکمیت اور خود مختاری کی بات کرنے والا در اصل کس درجے کی حاکمیت کی بات کر رہا ہے۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ جس طرح ان کی سابقہ جماعت پیپلز پارٹی نے سماجی انصاف کی وسیع المعنی اصطلاح کے بجائے سوشلزم کی اصطلاح استعمال کی تھی تا کہ سماجی انصاف کے ایک متعین مفہوم کو اجاگر کیا جا سکے اسی طرح اب وہ حاکمیت کے مفہوم کو متعین کرنے کے لئے کنفیڈریشن کی اصطلاح پر زور دے رہے ہیں لیکن گذشتہ صفحات میں جن تیکنیکی نکات کو اٹھایا گیا ہے ان کے پس منظر میں یہ وضاحت تشفی بخش معلوم نہیں ہوتی۔ خود فرنٹ کے رہنما اس پہلو پر گفتگو کرتے وقت تھوڑے سے مباحثے کے بعد یہ موقف اختیار کر لیتے ہیں کہ آپ کنفیڈریشن کی اصطلاح پر نہ جائیں بلکہ یہ دیکھیں کہ ہم پروگرام کیا تجویز کر رہے ہیں مثلاً ممتاز بھٹو نے قرار دادِ پاکستان میں خود مختاری اور حاکمیت کے الفاظ کی موجودگی سے کنفیڈریشن کے مطالبے کا جواز فراہم کرنا چاہا تو ہم نے اس امر کی نشاندہی کی کہ خود حاکمیت اور خود مختاری کی کوئی ایک شکل موجود نہیں ہے اور پاکستان میں ایک دوسرے سے مختلف سیاسی نظریات رکھنے والے متعدد حلقے قرار دادِ پاکستان میں درج حاکمیت اور خود مختاری کے تصورات کا حوالہ اپنے اپنے موقف کی تائید میں دیتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کے نزدیک وحدتوں کو حاکمیت اور خود مختاری ایک وفاق کے اندر بھی مل سکتی ہے اور اس کے لئے وفاقی نظام سے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر ممتاز بھٹو نے فوراً یہ جواب دیا کہ ان کے لئے ایک ایسا وفاقی نظام بھی قابل قبول ہو گا جس میں صوبے حاکمیت و خود مختاری کے حامل ہوں گے اور جس میں مرکز کے پاس وہی چار مضامین ہوں گے جن کا ذکر قرار دادِ لاہور میں تھا۔ اگر یہ بات مان لی جاتی ہے تو بقول اُن کے، وہ بخوشی کنفیڈریشن کے اپنے مطالبے پر بات چیت پر آمادہ ہوں گے۔

ہمارے خیال میں فرنٹ کے رہنماؤں نے کنفیڈریشن کی اصطلاح کو استعمال کرتے وقت اس کے تیکنیکی پہلوؤں کے بجائے اپنی سیاسی ضروریات کو زیادہ پیشِ نظر رکھا ہے۔ انہوں نے جو آئینی سکیم پیش کی ہے اس کو وہ وفاقی سکیم کے نام سے بھی پیش کر سکتے تھے اور اگر شیخ مجیب الرحمٰن اور عوامی لیگ کے

پھر نکات کو وفاقی نظام کے ایک مجوزہ خاکے کے طور پر پیش کیا جا سکتا تھا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ فرنٹ بھی اپنے پروگرام کو ایک وفاقی نظام کے خاکے کے طور پر پیش نہ کر سکتا۔ لیکن اس صورت میں شاید فرنٹ کے رہنماؤں کے مطلوبہ سیاسی مقاصد کی تکمیل ممکن نہ ہوتی۔ ہماری دانست میں کنفیڈریشن کی اصطلاح کے انتخاب کے مندرجہ ذیل اسباب ہو سکتے ہیں۔

۱۔ ہو سکتا ہے کہ فرنٹ کے رہنما واقعتاً فیڈریشن اور کنفیڈریشن کے درمیان موجود نازک سے فرق کو مناسب طور پر محسوس نہ کر پائے ہوں۔ آج دنیا میں وفاقی نظاموں کی اتنی مختلف قسمیں موجود ہیں کہ ان میں سے کوئی ایک قسم فرنٹ کے رہنماؤں کے نزدیک کمزور مرکز کی بہترین مثال بنتی ہو اور وہ اُسی کو کنفیڈریشن تصور کرتے ہوں۔ عین ممکن ہے کہ اُن کو اس انداز میں سوچنے میں سوئٹزرلینڈ کی مثال نے بھی تقویت پہنچائی ہو جہاں عملاً وفاقی نظام موجود ہے مگر یہ کہلاتا کنفیڈریشن ہے۔

۲۔ پاکستان میں وفاقیت کے اصولوں کی علمبردار سیاسی قوتیں ایک عرصے سے جدوجہد میں مصروف ہیں۔ صوبائی اور قومیتوں کی خود مختاری کے لئے کام کرنے والی سیاسی جماعتیں اور شخصیات غیر معروف نہیں رہی ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ اُن کی مقبولیت کتنی ہے اور وہ کس حد تک مؤثر انداز میں اپنا نقطۂ نظر عوام کے سامنے پیش کر کے پذیرائی حاصل کر سکی ہیں، اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صوبائی اور قومی حقوق کی بازیابی کا مطالبہ ہی اُن کی سیاسی پہچان اور شناخت کا ذریعہ ہے! البتہ یہ سیاسی قوتیں یا ان میں سے بیشتر وفاق ہی کے دائرے میں مذکورہ حقوق کی طالب ہیں۔ خان عبدالولی خان، میر غوث بخش بزنجو اور رسول بخش پلیجو جیسی شخصیات اور نیشنل عوامی پارٹی، نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی، پاکستان نیشنل پارٹی، سندھ عوامی تحریک، اور عوامی نیشنل پارٹی جیسی جماعتیں مختلف اوقات میں اور مختلف درجوں میں ان حقوق کی نقیب رہی ہیں۔ اس سیاسی روایت کی موجودگی میں اگر فرنٹ کے رہنما بھی صوبائی اور قومیتی حقوق کے حوالے سے وفاقی نظام ہی کا نعرہ دیتے تو گویا اپنے آپ کو پہلے سے موجود ایک روایت کا حصہ بناتے اور یوں ہو سکتا ہے کہ انہیں اپنا علیحدہ سیاسی تشخص قائم کرنے میں دشواری ہوتی۔ یہی نہیں بلکہ کنفیڈریشن کا نعرہ دے کر انہوں نے حقیقی وفاقیت اور اب تک صوبائی و قومیتی حقوق کی علمبردار سیاسی قیادت کو پیچھے چھوڑ جانے اور چھوٹے صوبوں اور قومیتوں کا مؤثر نمائندہ ہونے کا اعزاز حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

۳۔ پاکستان میں گذشتہ نو برسوں میں چھوٹے صوبوں کے احساسِ محرومی میں بہت زیادہ اضافہ ہو چکا ہے۔ اس احساس کے پیچھے گوناگوں اسباب کارفرما ہیں جن میں سیاسی اسباب شامل ہیں اور اقتصادی اسباب بھی۔ یہی نہیں بلکہ اس احساس کی تلافی کی کوئی مثبت کوشش بھی اس پورے عرصے میں نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ آبادی کا ایک معتدبہ حصہ جس میں تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوان، سیاسی عتاب کا نشانہ بننے والے کارکن اور معاشرے کے تنگ دست افراد کی اکثریت ہے، پہلے سے موجود سیاسی نعروں سے بڑی حد تک اکتا چکے ہیں اور وفاق کے عنوان سے پیش ہونے والے پروگراموں کے بارے میں اپنا پچھلا حسنِ ظن کھو چکے ہیں۔ اگر ان کو یہ باور کرایا جائے کہ یہ سب نعرے صدا بصحرا ثابت ہوئے ہیں اور جو پروگرام اب تک ان کے سامنے رکھے گئے ہیں وہ نتیجہ خیز ثابت ہونے کی اہلیت ہی نہیں رکھتے تو مذکورہ احساسِ محرومی کے پس منظر میں ان کے لئے اس بات کا یقین کر لینا چنداں مشکل نہیں ہوگا۔ ہمارے خیال میں سندھی بلوچ پختون فرنٹ نے کنفیڈریشن کا نعرہ دے کر چھوٹے صوبوں کے سیاسی طور پر متحرک و مشتعل کارکنوں، طالبعلموں اور نوجوانوں کو اپیل کرنا چاہا ہے۔

۴۔ چھوٹے صوبوں سے تعلق رکھنے والے بعض سیاستدان اور سیاسی کارکن ملک کی مجموعی سیاسی صورت حال، جمہوری اداروں کی پامالی اور غیر سیاسی اداروں کی سرخروئی سے اس درجہ مایوس ہوئے ہیں کہ انہوں نے ایک متحدہ پاکستان کے دائرے میں سوچنے ہی کو اب لاحاصل تصور کر لیا ہے۔ ان میں سے کچھ تو ترکِ وطن کر کے بیرونی ممالک میں سکونت پذیر ہو چکے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو ملک ہی میں مقیم ہیں مگر کسی بامعنی سیاسی سرگرمی میں حصہ لینے پر آمادہ نہیں ہیں البتہ جب کبھی انہیں اظہارِ خیال کا موقع ملتا ہے تو وہ اپنے خیالات کو چھپاتے بھی نہیں۔ ان میں سے کچھ حضرات پاکستان کے لئے اب کوئی نرم گوشہ بھی نہیں رکھتے اور خدانخواستہ اس کے خاتمے کی پیشنگوئیاں بھی کرتے رہتے ہیں۔ کنفیڈریشن کے نعرے کو اختیار کرتے وقت فرنٹ کے رہنماؤں کے پیش نظر اس پوری مایوس سیاسی قیادت کی حمایت کا حصول بھی ضرور رہا ہوگا جو اپنے اپنے صوبے میں کچھ نہ کچھ پیروکار ضرور رکھتی ہے۔ عطاءاللہ مینگل تو فرنٹ ہی میں شامل ہیں جو اس سے قبل بلوچستان کی آزادی کی تحریک چلا رہے تھے۔ خان عبدالغفار خاں اور جی ایم سید نے بھی فرنٹ کے رہنماؤں کے لئے مشفقانہ رویے کا اظہار کیا ہے حالانکہ ان بزرگ رہنماؤں کو کسی نہ کسی درجے میں یہ شک بھی ہے کہ کہیں کنفیڈریشن کے علمبردار کسی مرحلے

پر اپنی پرانی سیاست کی طرف مراجعت نہ کر جائیں۔

۵۔ کنفیڈریشن کو اپنے پروگرام کے سرنامے کے طور پر منتخب کرنے کا ایک مقصد مخالفوں کو چونکانا بھی ہو سکتا ہے۔ اس پروگرام میں اصل ہدف ملک کے سب سے بڑے صوبے کو قرار دیا گیا ہے۔ لہذا اس صوبے کے عوام، سیاستدانوں، پڑھے لکھے طبقے اور پریس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ایک کارآمد طریقہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اپنے پروگرام کی شکل (posture) ایسی رکھی جائے جس کو دیکھتے ہی اس کے مخالفین اپنا ردعمل ظاہر کرنے میں ذرا دیر نہ لگائیں۔ اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرنٹ کے رہنماؤں کا تیر نشانے پر بیٹھا ہے اور اس کے پروگرام یا کم از کم نعرے کی تشہیر ملک بھر میں ہو چکی ہے اور یہ مسلسل زیر بحث ہے۔

۶۔ کنفیڈریشن کی اصطلاح کو استعمال کرنے کے باوجود فرنٹ کے پروگرام میں ایک وفاقی نظام کے چند عناصر کی موجودگی اور اس کے ساتھ ساتھ فرنٹ کے بعض رہنماؤں کا یہ کہنا کہ اگر وحدتوں کی حاکمیت کے اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ اپنے پروگرام پر بات چیت پر بھی آمادہ ہو سکتے ہیں، اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ ایک وفاقی نظام ابھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا ہے اور وہ اس کی طرف جانے کے لئے دروازہ کھلا رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے سودے بازی (bargaining) کی کچھ نہ کچھ گنجائش بھی رکھ چھوڑی ہے۔

کنفیڈریشن کی اصطلاح کے حوالے سے اس تفصیلی گفتگو کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ خود یہ اصطلاح اچھے خاصے تنازعے کا سبب بن سکتی ہے اور فرنٹ کے رہنما اگر اس نزاع سے بچنا چاہتے تو بآسانی بچ سکتے تھے۔ اگر وہ ہم رتبہ وفاق (Co-ordinate Federation) کی اصطلاح پر انحصار کرتے تو یہ جہاں ایک طرف ان کے موقف کی زیادہ صحیح نمائندگی کرتی وہیں انہیں اس تنقید سے بھی محفوظ رکھتی جو ان کے پروگرام کی تفصیلات پر کم اور اس کے عنوان کے حوالے سے زیادہ ہوئی ہے۔ فرنٹ کے رہنماؤں نے اپنے پروگرام کے گرد ایک ایسی گرہ کس دی ہے جس کو کھولنے کھولنے ہی میں انہیں بڑا وقت لگ سکتا ہے۔

یہ کنفیڈریشن کی اصطلاح کے انتخاب ہی کا نتیجہ ہے کہ فرنٹ پر یہ تنقید ہوئی ہے کہ اس نے ملک کو توڑنے کا منصوبہ پیش کیا ہے۔ کیونکہ عرف عام میں ایک کنفیڈریشن پہلے سے آزاد اور خود مختار

ریاستوں کے درمیان قائم ہوتی ہے لہٰذا اگر ایک وفاقی یا وحدانی مملکت میں کنفیڈریشن کا قیام مقصود ہو تو پہلے اس کے مختلف صوبوں یا علاقوں کو خود مختاری دینی ہوگی۔ خود مختاری کے حصول کے بعد یہ ان وحدتوں کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ کنفیڈریشن قائم کرنے کا فیصلہ کریں یا آزاد ہو جائیں۔ عام ذہنوں میں اٹھنے والی یہ الجھن بے سبب بھی نہیں ہے۔ پاکستان میں ماضی میں جب بھی کبھی کنفیڈریشن کا نعرہ بلند کیا گیا تو اس کا مقصد پاکستان اور بعض دوسرے ملکوں کے درمیان کنفیڈریشن کا قیام تھا مثلاً نواب اکبر بگٹی نے ۱۹۷۲ء میں کنفیڈریشن کی بات کی تھی تو ان کے ذہن میں پاکستان، افغانستان اور ہندوستان کے درمیان کنفیڈریشن کے قیام کا تصور تھا۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے میں مصر، لیبیا اور شام پر مشتمل کنفیڈریشن کے قیام کی کوشش کی گئی تھی مگر یہ مہم بوجوہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکی تھی۔ اس پس منظر میں فرنٹ کے کنفیڈریشن کے نعرے کی یہ توجیہہ کہ یہ ملک کو توڑنے اور مختلف وحدتوں کو پہلے آزاد کرنے اور پھر انہیں ان کی اپنی صوابدید پر ایک کمزور مرکز کے تحت مربوط کرنے کی حکمت عملی پر استوار ہوا ہے ناقابلِ فہم نہیں ہے۔

ممتاز بھٹو نے "کنفیڈریشن" کے نام سے شائع ہونے والے اپنے انگریزی کتابچے میں اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اصولی طور پر کنفیڈریشن کے دو بنیادی تقاضے ہوتے ہیں۔ پہلا تقاضا یہ ہے کہ ایسی مختلف ریاستوں کا جداگانہ وجود موجود ہو جو آپس میں مل کر ایک ملک قائم کرنا اور ایک مرکزی اتھارٹی کی تشکیل کرنا چاہتی ہوں۔ دوسرا تقاضا ان کے درمیان تقسیم اختیارات پر اتفاق رائے کی موجودگی ہے۔ ان کے خیال میں پہلے تقاضے کی تکمیل ۱۹۴۷ء میں اس وقت ہی ہو گئی تھی جب بقول ان کے ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور کے مطابق پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا۔ گویا وحدتوں کی از سر نو آزادی کی اب ضرورت باقی نہیں رہی ہے اور اگر آج کنفیڈریشن کو قائم کیا جاتا ہے تو اس کے پہلے تقاضے کی تکمیل ۱۹۴۷ء ہی سے مؤثر متصور ہوگی۔ البتہ دوسرے تقاضے کی تکمیل ابھی باقی ہے یعنی تقسیم اختیارات کا مرحلہ ابھی طے کرنا باقی ہے اور اگر یہ مرحلہ طے کر لیا جاتا ہے تو کنفیڈریشن بغیر کسی توڑ پھوڑ یا تخریب کے قائم ہو جائے گی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ان کی جملہ کاوشوں کا مقصد اسی مرحلے کو طے کرانا ہے۔ اس موقف میں موجود منطقی استدلال کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر اس کو وہی لوگ قابل اعتنا سمجھیں گے جو دستوری اور قانونی موشگافیوں

کا ذوق رکھتے ہیں۔ ایک عام ذہن اس میں مضمر پیچیدگی کو سمجھنے کا شاید اہل نہیں ہے۔ چنانچہ اگر فرنٹ کے رہنماؤں کو کنفیڈریشن کے حوالے سے تنقید کا نشانہ بننا پڑ رہا ہے تو اس کا ایک سبب خود ان کا ایک نسبتاً پیچیدہ اصطلاح کو ایسی صورت میں اختیار اور استعمال کرنا ہے جب کہ وہ اس کو نظر انداز بھی کر سکتے تھے۔

فرنٹ کا اساسی موقف۔

کنفیڈریشن کے مطالبے کے ضمن میں فرنٹ کے رہنماؤں کا اساسی موقف یہ ہے کہ پاکستان میں وقتاً فوقتاً فوج کے اقتدار پر قابض ہونے کے نتیجے میں ملک کا وفاقی ڈھانچہ مسخ ہو کر رہ گیا ہے۔ سنہ ۱۹۷۳ء کا دستور جو ایک وفاقی دستور تھا بعض جبلّی (inherent) کمزوریوں کا حامل تھا جن کے نتیجے میں یہ صوبوں میں مرکز کی مداخلت کا سدّباب کرنے سے قاصر رہا۔ یہی نہیں بلکہ ملک کے مجموعی سیاسی دروبست اور ریاستی نظام میں یہ دستور بے دست وپا ثابت ہوا اور خود اپنے تحفظ کا سامان بہم نہ کر سکا۔ ملک کا سیاسی نظام، امور مملکت میں ایک غیر سیاسی ادارے کے تفوق اور ایک صوبے کی بالادستی کا مظہر ہے۔ اس حقیقت کو جو چیز مزید گھمبیر بنا دیتی ہے وہ یہ ہے کہ مذکورہ ادارہ اپنی ساخت اور ترکیب میں بھی بیشتر ایک ہی صوبے کی نمائندگی کرتا ہے۔ گویا اس صوبے کو جمہوریت کے دور میں اور غیر جمہوری ادوار میں بھی سیاسی بالادستی حاصل رہتی ہے۔ البتہ جمہوری ادوار میں اس کو چھوٹے صوبوں کی بھی تھوڑی بہت دلجوئی کرنی پڑتی ہے اور اقتدار و اختیار میں ان کو بھی تھوڑا بہت حصّہ دینا پڑتا ہے۔ غیر جمہوری ادوار میں وہ اس تکلف سے بھی آزاد ہو جاتا ہے۔ فرنٹ کے رہنماؤں کا مزید کہنا ہے کہ محض سنہ ۱۹۷۳ء کے دستور کی بحالی اور جمہوریت کے احیاء سے پاکستان کا سیاسی مسئلہ حل نہیں ہوگا کیونکہ چھوٹے صوبے تب بھی اپنی حاکمیت اور خود مختاری سے محروم رہیں گے۔ ان کے نزدیک ملک کے سیاسی نظام میں ایک جوہری تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ایک ایسی تبدیلی جس کے ذریعے نہ صرف یہ کہ غیر سیاسی قوتوں اور اداروں کی سیاست میں مداخلت کا مستقل سدّباب کیا جا سکے بلکہ ایک صوبے کی باقی ماندہ صوبوں پر برتری اور تفوق کو بھی ختم کیا جا سکے۔ یہ انتظام ان رہنماؤں کی دانست میں ایک ایسے کنفیڈرل نظام ہی کے ذریعے ممکن ہے جس میں شامل وحدتیں حاکمیت کی اصل مالک ہوں نیز

تمام وحدتوں کی حیثیت اور ملک کے تمام مرکزی اداروں اور شعبوں میں ان کی نمائندگی مساوی ہو۔

تحریک پاکستان سے اخذ کردہ دلائل اور ان کا تجزیہ

اپنے اس موقف کی تائید میں فرنٹ کے رہنما بنیادی طور پر دو طرح کے دلائل پیش کرتے ہیں۔ دلائل کا پہلا میدان تو خود قیام پاکستان سے قبل کی سیاسی دائینی تاریخ ہے جس سے ان رہنماؤں نے ایسے نتائج اخذ کئے ہیں جو ان کے خیال میں ان کے موقف کو جائز ثابت کرنے اور اس کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے کے نقطۂ نظر سے مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ دلائل کا دوسرا مجموعہ وہ ہے جو قیام پاکستان کے بعد کی سیاسی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ان دونوں اقسام کے دلائل کا جائزہ لیں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ خود فرنٹ کے رہنماؤں کے ان دلائل پر اور نکات کے اصرار کے مدارج میں فرق پایا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک رہنما تاریخ کی جو تعبیر پیش کرتے ہیں لازمی نہیں ہے کہ دوسرے رہنما بھی اس کو اسی انداز میں پیش کرتے ہوں۔ صرف ایک مثال اس صورتحال کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔ ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور عبدالحفیظ پیرزادہ اور ممتاز بھٹو کے نزدیک کنفیڈریشن کے منصوبے کی اساس ہے۔ بگم عطاء اللہ مینگل اس قرارداد کے بارے میں بھی کوئی خاص حسن ظن نہیں رکھتے۔ ان کے خیال میں اس قرارداد کو حوالہ بنائے بغیر بھی وہ اپنے منصوبے کی وکالت کے مجاز ہیں۔

تحریک پاکستان کے حوالے سے ممتاز بھٹو کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قائداعظم وفاقی نظام کے خلاف تھے اور کنفیڈریشن ہی ان کا اصل مطمع نظر تھا۔ 'کنفیڈریشن' کے نام سے چھپنے والے اپنے کتابچے میں وہ لکھتے ہیں:

> "بلاشبہ تقسیم ہند، ہندو مسلم بنیاد پر عمل میں آئی تھی۔ اس بنیاد پر قیام پاکستان کا مطالبہ معقول (valid) اور مضبوط تھا۔ تاہم ۱۹۴۰ء ہی میں یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ جب پاکستان کا قیام عمل میں آئے گا تو اس کا ڈھانچہ جمہوری اور کنفیڈرل ہوگا۔" [6]

---

6. Mumtaz Ali Bhutto, Confederation, (Place of publication and date not mentioned), p. 10.

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ :

"پاکستان کا قیام ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں کے کنفیڈریشن کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ اور اس کا اسی شکل میں آگے بڑھنا پیش نظر تھا" ۷ے

قائداعظم کی طرف کنفیڈریشن کے تصور کو منسوب کرتے ہوئے وہ کیبنٹ مشن پلان کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ اس پلان کو مسلم لیگ نے ابتداً قبول کر لیا تھا اور اس نے ۱۲ مئی ۱۹۴۶ء کو کم از کم مطالبات پر مشتمل ایک دس نکاتی یادداشت جاری کی تھی جس میں صوبوں کے گروپوں کے لئے مزید اختیارات کی ضرورت کی نشاندہی کی گئی تھی، مگر کانگریس وفاقی نظام پر مصر رہی چنانچہ کیبنٹ مشن پلان ناکام ہو گیا اور پھر مسلم لیگ نے اس کے بعد قرارداد لاہور کی بنیاد پر پاکستان کی جدوجہد شروع کر دی۔ ۸ے

ممتاز بھٹو مزید کہتے ہیں کہ قیام پاکستان کے بعد یہ المیہ پیش آیا کہ مسلم لیگ قرارداد لاہور کی بنیاد پر کنفیڈرل ڈھانچے کے اپنے وعدے سے مکر گئی جس کے نتیجے میں ملک آمریتوں کے شکنجے میں کستا چلا گیا۔ ۹ے قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کے اس انحراف میں کیا قائداعظم بھی شریک جرم تھے اس کے جواب میں ممتاز بھٹو کہتے ہیں کہ :

"قائداعظم کو نئے ملک کی تعمیر میں مسائل کے انبار سے دوچار ہونا پڑا۔ جس میں سب سے اہم ان مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ تھا جو مصائب اور خون کی آزمائش سے گذر کر پاکستان آئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی کمزور اور تیزی کے ساتھ گرتی ہوئی صحت نے بھی انہیں دستور سازی کے اہم کام کی مہلت نہیں دی۔ انہوں نے جس ملک کو تخلیق کیا تھا اس میں وہ محض تیرہ ماہ کی مختصر مدت زندہ رہے۔" ۱۰ے

اگر موت، قائداعظم کو مہلت دیتی تو وہ بقول ممتاز بھٹو پاکستان کو یقیناً ایک کنفیڈرل دستور فراہم کرتے۔ اپنے کتابچے میں ممتاز بھٹو نے قائداعظم کے حوالے سے جو موقف بیان کیا ہے اسی کا اعادہ انہوں نے نسبتاً مختلف الفاظ میں ہمارے ساتھ اپنے تفصیلی انٹرویو میں بھی کیا ہے۔

---

7. Ibid, p. 11.

8. Ibid, pp. 12 - 14.

9. Ibid, p. 15

10. Ibid.

ممتاز بھٹو قرار داد لاہور اور اس کے بعد کے ارتقاء کی جو توجیہہ پیش کرتے ہیں کم و بیش وہی طرز فکر عبدالحفیظ پیرزادہ کا بھی ہے۔ البتہ وہ قرار دادِ لاہور میں حاکمیت اور خود مختاری کی اصطلاحات پر نسبتاً مختلف انداز میں زور دیتے ہیں۔ وہ یہ تو ضرور کہتے ہیں کہ قائداعظم کے پیش نظر مسلم اکثریتی علاقوں کے ایسے وفاق تھے جن کے اندر شامل ریاستیں خود مختار اور حاکمیت کی حامل ہوں گی مگر وہ ممتاز بھٹو کی طرح یہ نہیں کہتے کہ قائداعظم کے پیش نظر حاکمیت اور خود مختاری سے مراد لازماً کنفیڈریشن ہی تھا۔ قیام پاکستان کے بعد قائداعظم کی حیات کے آخری تیرہ ماہ میں ملک میں صوبوں کو ۱۹۴۰ء کی قرارداد کے مطابق حاکمیت کیوں حاصل نہیں ہوئی۔ اس کے جواب میں پیرزادہ بھی کم و بیش وہی جواب دیتے ہیں جو ممتاز بھٹو نے دیا تھا۔ بقول پیرزادہ:

> "میں سمجھتا ہوں کہ جناح صاحب کی صحت جواب دے چکی تھی۔ وہ دستور ساز اسمبلی کی کارروائیوں میں بھی کچھ دلچسپی نہیں لے سکے۔ پھر یہ اتنا مختصر عرصہ تھا کہ ہندوستان بھی اس عرصے میں اپنا آئین نہیں بنا سکا تھا اور آئین کے اوپر بحث بھی نہیں شروع ہوئی تھی۔ اس وقت مہاجرین کا مسئلہ درپیش تھا۔ امن و امان کا مسئلہ تھا، کشمیر کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ جوناگڑھ کا مسئلہ چل رہا تھا، حیدرآباد کا مسئلہ تھا۔ یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ انہوں نے (قائداعظم نے) انحراف کیا یا نہیں کیا۔ دراصل مسئلے تو جناح صاحب کے انتقال کے بعد شروع ہوئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان کی صحت جواب نہ دے جاتی تو وہ براہ راست دلچسپی لیتے اور حالات شاید کچھ مختلف ہو جاتے۔"[۱۱]

ممتاز بھٹو اور پیرزادہ کے ان بیانات سے یہ حقیقت مترشح ہوتی محسوس ہوتی ہے کہ وہ اپنے موجودہ سیاسی طرز فکر کو درست ثابت کرنے کے لئے تاریخ سے مدد حاصل کرنے کو عین ضروری تصور کرتے ہیں۔ مگر تاریخ کے بارے میں ان کا رویہ معروضی ذرا کم ہی ہے۔ وہ قیام پاکستان سے قبل کے آئینی و سیاسی ارتقاء کے کسی ایک مرحلے پر نظریں جماتے ہیں، وہاں سے کچھ پسندیدہ نکات اکٹھے کرتے ہیں اور اُن کی بنیاد پر اپنے موجودہ موقف کی صحت پر اصرار شروع کر دیتے ہیں۔ البتہ جب تحریک

۱۱۔ ملاحظہ ہو موجودہ کتاب میں عبدالحفیظ پیرزادہ کا انٹرویو

پاکستان ہی کے بعض ایسے گوشوں پر ان کا موقف معلوم کیا جائے جو براہِ راست طور پر ان کے موقف کو تقویت پہنچانے میں مددگار ثابت نہیں ہوتے یا اُس کو ضعف پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہوں تو پھر انہیں ایسی تاویلیں پیش کرنی پڑتی ہیں جو قانونی نوعیت کی کم اور سیاسی نوعیت کی زیادہ ہوتی ہیں۔ جب آپ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ قائدِاعظم پاکستان میں کنفیڈریشن قائم کرنا چاہتے تھے تو پھر کوئی بھی شخص یہ پوچھے گا کہ آخر انہوں نے ایسا کیا کیوں نہیں۔ اس کے جواب میں ہر دو رہنماؤں کے پاس سوائے بانیٔ پاکستان کی عدم صحت کے اور کوئی عذر نہیں رہ جاتا۔

قیامِ پاکستان سے قبل کی ساری جدوجہد دراصل ایک طویل عرصے پر محیط ہے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام سے سنہ ۱۹۴۷ء میں پاکستان کی تشکیل تک کے اکتالیس سالہ دور میں لیگ اور اس کا لائحہ عمل مختلف مرحلوں سے گذرے۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں لیگ کے قیام کے وقت اس کے جو تین مقاصد متعین کئے گئے تھے وہ مندرجہ ذیل تھے :[12]

(الف) مسلمانوں میں انگریزوں کی وفاداری کے احساس کو پختہ کرنا۔

(ب) ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی حقوق اور مفادات کا تحفظ کرنا۔

(ج) فرقہ وارانہ جذبات کو کم کرنا۔

مسلم لیگ نے آغازِ کار میں انہیں اہداف کو پیشِ نظر رکھا۔ بعد ازاں لیگ کی سیاست جداگانہ نمائندگی اور صوبائی خود مختاری کے گرد استوار ہوئی۔ سنہ ۱۹۱۹ء کی دستوری اصلاحات سے پہلے صورتحال یہ بن چکی تھی کہ ہندوستان کے لئے وفاقی طرزِ حکومت پر تقریباً سب ہی متفق تھے البتہ اس کی نوعیت کے بارے میں فیصلہ ہونا باقی تھا۔ لیگ کے نقطۂ نظر سے صوبائی خود مختاری میں اضافہ مسلمانوں کے مفاد میں تھا کیونکہ ان صوبوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں تھے صوبائی خود مختاری انہیں زیادہ آزادی کا احساس فراہم کرتی۔ سنہ ۱۹۱۹ء کی دستوری اصلاحات کے بعد بھی یہ مسئلہ روز افزوں رہا۔ اس زمانے میں لیگ کے طرزِ فکر کا اندازہ ۲۵ مئی سنہ ۱۹۲۴ء کے لاہور کے اجلاس میں منظور ہونے والی قرارداد کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ جس کو شیخ عبدالقادر نے پیش کیا تھا۔ اس میں کہا گیا :

---

12. Syed Sharifuddin Pirzada (ed.), Foundations of Pakistan, Vol. I, (Karachi: National Publishing House Limited, n.d.) p.5

"ہندوستان کے موجودہ صوبوں کو وفاقی بنیاد پر اس طرح ایک مشترکہ (com
mon) حکومت کے تحت متحد کیا جائے کہ ہر صوبے کو پوری مکمل صوبائی خود مختاری حاصل
ہو۔ مرکزی حکومت کو صرف ایسے امور کی بجا آوری تک محدود رکھا جائے جو عمومی اور
مشترکہ نوعیت کے حامل ہوں۔"[۱۳]

۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ پر غور و خوض کی خاطر کلکتہ میں جو آل پارٹیز کنونشن منعقد ہوا اس میں قائداعظم نے منجملہ دیگر تجاویز کے صوبائی خود مختاری کی تجویز بھی پیش کی اور مطالبہ کیا کہ اختیاراتِ مابقی (residuary powers) مرکز کے بجائے صوبوں کے تصرف میں رکھے جائیں۔ اگلے ہی برس قائداعظم کے مشہور زمانہ چودہ نکات منظر عام پر آئے جن میں انہوں نے وفاقی نظام اور صوبائی تحفظات کو بطور خاص شامل کیا۔[۱۴] چنانچہ ان نکات میں نکتہ اول ہی اس سے متعلق ہے:

"مستقبل کے دستور کا طرز، وفاقی ہونا چاہیئے جس میں اختیاراتِ مابقی صوبوں
کے پاس ہوں۔ مرکزی حکومت کو صرف ایسے مشترکہ مفاد کے امور کا کنٹرول دیا جائے
جن کی ضمانت از روے دستور متعین کی گئی ہو۔"

دوسرے نکتے کے مطابق:

"تمام صوبوں کو یکساں درجے کی خود مختاری فراہم کی جائے۔"

چودہویں نکتے میں کہا گیا:

"دستور میں مرکزی مقننہ کوئی تبدیلی نہیں کر سکے گی سوائے ایسی صورتوں کے
کہ ہندوستانی وفاق کو متشکل کرنے والی ریاستوں کی اسے تائید حاصل ہو۔"

۱۹۳۰ء کے عشرے میں چند اہم اور فیصلہ کن مراحل آئے جنہوں نے ہندوستان کے دائرے میں وفاقی نظام کے حوالے سے قائداعظم اور مسلم لیگ کے طرز فکر میں تبدیلی پیدا کی۔ اس عشرے

---

13. Ibid, p 578

14. Syed Sharifuddin Pirzada (ed.), The Collected Works of Quaid-e Azam Mohammad Ali Jinnah, Vol. III, (Karachi: East and West Publishing Company, 1986), p 352-53.

کے اوائل میں قائداعظم لندن کی گول میز کانفرنس میں وفاقی طرزِ حکومت کی وکالت اور صوبائی خودمختاری کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے فیڈرل سٹرکچر سب کمیٹی کے اجلاس بابت یکم دسمبر ۱۹۳۰ء تا ۱۲ جنوری ۱۹۳۱ء میں اپنے خیالات بالوضاحت پیش کئے۔ انہوں نے برطانوی حکومت پر زور دیا کہ وفاقی نظام کو صرف اس کے ظاہری ڈھانچے کی حد تک اختیار نہ کیا جائے بلکہ اس کی روح کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ اس موقع پر انہوں نے مرکزی حکومت کے محکموں میں دفاع، امور خارجہ اور فوج کو شامل قرار دیا۔ نیز مرکز میں ایک دوایوانی مقننہ کی تجویز دی جس میں ایوان بالا کا انتخاب صوبائی اسمبلیوں کے ذریعے اور ایوان زیریں کا انتخاب براہ راست طور پر ہونا تھا۔[۱۵] یہ تجویز وفاقی نظام کی معروف صورت پر مشتمل تھی۔

قائداعظم کے محولا بالا خیالات کے علی الرغم ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نے ایک ایسا ڈھانچہ فراہم کیا جو وفاقی نظام کی روح سے عاری تھا۔ ایکٹ کے مرکز سے متعلق حصوں پر عمل درآمد روک کر محض صوبائی خودمختاری سے متعلق دفعات پر عملدرآمد کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں صوبوں میں انتخابات منعقد کئے گئے۔ ان انتخابات کے نتائج مستقبل کی پیش رفت پر زبردست انداز میں اثرانداز ہوئے۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ کی کارکردگی انتہائی ناقص رہی۔ گیارہ صوبوں میں مسلمانوں کے لئے مختص مجموعی طور سے ۴۸۲ نشستوں میں سے مسلم لیگ صرف ۱۰۹ پر کامیابی حاصل کر سکی۔ نیز مسلمان اکثریت کے چار صوبوں (بنگال، صوبہ سرحد، پنجاب اور سندھ) میں سے کسی میں بھی اس کو اکثریت حاصل نہیں ہو سکی۔[۱۶] ان نتائج نے مسلم لیگی رہنماؤں کو سخت دھچکہ پہنچایا۔ لیگ کے ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی کے دعوے کو بھی ان نتائج سے ضعف پہنچا۔ دوسری طرف کانگریس کو گیارہ میں سے چھ صوبوں میں اکثریت حاصل ہوئی۔ دو دوسرے صوبوں میں بھی کانگریس سب سے بڑی جماعت بن کر ابھری۔ البتہ مسلمان اکثریت کے صوبوں میں سوائے صوبہ سرحد کے، کانگریس کی پوزیشن بھی متاثر کن نہیں تھی۔ انتخابی نتائج پر تبصرہ کرتے ہوئے نہرو نے اعتراف کیا تھا کہ کانگریس

---

15. Ibid, 505 – 568

16, Uma Kaura, Muslims and Indian Nationalism, 1928-40, (Lahore: Book Traders, n.d.), pp. 108-09

مسلم سیٹوں پر کامیابی حاصل نہیں کر سکی کیونکہ ایک عرصہ سے اس نے مسلمان عوام میں کام کی طرف عدم توجہی روا رکھی ہے۔[17]

سنہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کو اگر کہیں کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل ہوئی تو وہ یوپی اور بمبئی کے صوبے تھے۔ بمبئی میں اسے ۲۹ مسلم نشستوں میں سے بیس اور یوپی میں ۶۴ مسلم نشستوں میں سے ۲۷ پر کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ انتخابات کے بعد یوپی میں مخلوط حکومت کے قیام کی کوششیں کی گئیں۔ ان کوششوں میں چوہدری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خاں پیش پیش تھے۔ خلیق الزماں یوپی کی مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کے چیئرمین تھے۔ اور ان کی خواہش تھی کہ صوبائی کابینہ میں ان کے گروپ کو دو نشستیں دی جائیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان کی اس شرط کو تسلیم کر لینے کے حق میں تھے کیونکہ اس طرح یوپی کے لیگی ارکان اسمبلی کا تعاون حاصل کیا جا سکتا تھا۔ مولانا آزاد کے خیال میں مخلوط حکومت کے قیام کی کوششیں اس لئے ناکام ثابت ہوئیں کیونکہ نہرو لیگ کو ایک سے زیادہ نشستیں دینے پر آمادہ نہیں تھے۔ ہندوستانی تاریخ کے بعض مؤرخین اور مبصرین نے جن میں مولانا آزاد ایچ وی هاڈسن اور پینڈرل مون شامل ہیں یہ رائے رکھتے ہیں کہ اگر کانگریس مخلوط حکومت کے قیام کی اس مہم سے ہاتھ نہ کھینچ لیتی تو مطالبۂ پاکستان کی نوبت نہ آتی۔ مخلوط حکومت کے ضمن میں ہونے والے مذاکرات کی ناکامی کا اصل سبب شاید وہ نہیں تھا جو ان حضرات نے بیان کیا ہے کیونکہ ایک کے بجائے دو نشستیں دے دینا خود نہرو کے لئے بھی اتنا بڑا مسئلہ نہ ہوتا مگر اصل تنازعہ جو ان مذاکرات کی ناکامی کا موجب بنا وہ کانگریس کی یہ شرط تھی کہ مسلم لیگ کے وہ ارکان جو کانگریس کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہوں گے انہیں کانگریس میں شمولیت اختیار کرنی ہوگی، مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ (برائے یوپی) کو ختم کرنا ہوگا اور ضمنی انتخابات میں لیگ اپنا علیحدہ نمائندہ کھڑا نہیں کر سکے گی۔ راجندر پرساد کے نام نہرو کے خط مؤرخہ ۲۱ جولائی سنہ ۱۹۳۷ء سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیق الزماں دو کے علاوہ بقیہ شرائط کو ماننے پر تیار بھی ہو گئے تھے، جو دو شرائط ان کے لئے قابل قبول نہیں تھیں وہ مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کا خاتمہ اور ضمنی انتخابات میں علیحدہ نمائندوں کو کھڑا کرنے سے اجتناب کی

17. Ibid, p. 109.

18. Ibid, p. 112

شرائط تھیں۔ کانگریس کی ان شرائط سے مسلم لیگ اور قائداعظم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کانگریس مسلم لیگ کے خاتمے کے درپے ہے اور اس کے جداگانہ تشخص اور مسلمانوں کی نمائندگی کے اس کے دعوے کی نفی کرنا چاہتی ہے[19]۔ قائداعظم نے خلیق الزمان کو بھی کانگریس کے ساتھ مصالحت کی کوششوں سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔

کم و بیش یہ مرحلہ تھا جب قائداعظم نے وفاق یا فیڈریشن سے متعلق اپنے خیالات کو تبدیل کر دیا۔ اب ان کا خیال تھا کہ وفاقی نظام نہ صرف غیر جمہوری ہے بلکہ مسلمانوں کے مفادات کے لئے مضر بھی ہے۔ آئندہ برسوں میں قائداعظم کی کوششوں کا محور لیگ کو عوامی جماعت بنانا تھا۔ انہوں نے نہ صرف لیگ کو عوامی جماعت بنانے کے سلسلے میں رابطہ عوام کی اور دوسری کوششیں کیں بلکہ لیگ کے لئے پورے ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی کے اعزاز کے حصول کی بھی سعی کی۔ چنانچہ انہوں نے پنجاب اور بنگال میں وہاں کی مسلم قیادت کے ساتھ باہم تفہیم کی کاوشیں بھی کیں اور اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔ مثلاً سنہ ۱۹۴۰ء تک قائداعظم کو پنجاب کے وزیراعلیٰ سکندر حیات خان اور بنگال کے وزیراعلیٰ فضل الحق کی حمایت حاصل ہو چکی تھی۔ انہیں برسوں میں ہندی اردو مسئلے اور کانگریسی وزارتوں کے تحت ہونے والے اقدامات پر مسلم لیگ کے اعتراضات نے جو کہ پیر پور رپورٹ کی شکل میں سامنے آئے لیگ اور کانگریس کی سیاست کے درمیان خلیج کو وسیع کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس وقت تک دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں حکومت ہند نے جرمنی اور اس کی حلیف طاقتوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا اور اس اہم فیصلے کے کرنے میں مرکزی اسمبلی سے مشورہ کرنا یا اسے اعتماد میں لینا ضروری نہیں سمجھا۔ نیز ہندوستانی ریاستوں کو وفاق میں لانے کے لئے جاری مذاکرات کو معطل کر دیا گیا۔ ان اقدامات نے کانگریس کی قیادت کو اس درجہ مایوس کیا کہ اس نے اکتوبر میں اپنی صوبائی وزارتوں کے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس پر مسلم لیگ کی جانب سے یوم نجات منایا گیا۔

یہ تھا پس منظر جس میں ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور منظور ہوئی جس میں مسلمانوں کے

---

19. Ibid, pp. 114-15

لئے علیحدہ مملکتوں کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ ہماری دانست میں اس قرارداد کے مضمون و مافیہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ تو ہندوستان کی تقسیم اور علیحدہ مسلم مملکتوں کے قیام سے متعلق ہے۔ (بعد ازاں قائدِ اعظم اور مسلم لیگ نے دو ریاستوں کے بجائے ایک مسلم ریاست کو اپنا مقصد قرار دیا تھا اور اپریل ۱۹۴۶ء میں دہلی میں مسلم لیگ لیجسلیٹرز کنونشن نے اپنی قرارداد کے ذریعہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد میں ترمیم بھی کر دی تھی) اس حصے میں ہندو مسلم مسئلے کے حل کے لئے ہندوستان کی تقسیم کو ناگزیر قرار دیا گیا ہے اور ہندوستان گیر بنیاد پر وفاقی نظام کی مذمت کی گئی ہے۔ ۱۹۴۰ء تک کے ارتقاء کے پس منظر میں مسلم لیگ کا یہ موقف ناقابلِ فہم نہیں ہے۔ قرارداد کی منظوری کے بعد بھی قائدِ اعظم نے بارہا ہندوستان کی سطح پر استوار وفاقی نظام پر عدم اعتماد کا اظہار کیا۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے تو بارہا "ڈھیلا ڈھالا وفاق یا کنفیڈریشن" کو بھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ایک ہندوستان کے دائرے میں وفاقیت کو قائدِ اعظم اس لئے رد کرتے تھے کہ ان کے خیال میں اس طرح مسلمان ہمیشہ کے لئے ایک ایسی مرکزی حکومت کے زیرِ اثر آ جاتے جو ہندو اکثریت کی نمائندہ ہوتی۔ ۱۹۴۳ء کے اپنے خطبے میں انہوں نے کہا:

"بعض آئینی پنڈت ہم سے پوچھتے ہیں کہ ایک ڈھیلا ڈھالا فیڈریشن یا کنفیڈریشن قائم کرنے میں کیا عار ہے؟ ...... ہم کسی بھی ایسی سکیم اور تجویز کے خلاف ہیں جس کی بنیاد ایک مرکزی حکومت خواہ وہ فیڈرل ہو یا کنفیڈرل، کے تصور پر رکھی گئی ہو۔ کیونکہ انجام کار یہ مسلمان قوم کو لازماً سماجی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے کمزور کرنے اور برِ صغیر میں ہندو اکثریتی راج کو مستحکم بنانے کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ لہٰذا اپنے ذہنوں سے کسی بھی ایسے ڈھیلے وفاق کے تصور کو نکال دیجئے جس میں ایک مرکزی اور چند صوبائی حکومتیں ہوں۔ وہ آپ کو کستی رہے گی، کستی رہے گی اور یہاں تک کستی چلی جائے گی کہ آپ وحدتوں کی حیثیت سے حاصل شدہ اختیارات کے نقطۂ نظر سے بالکل کچل کر رہ جائیں گے۔" [۲۰]

---

20. Jamil-ud-Din Ahmad (ed.) Speeches and Writings of Mr. Jinnah, (Lahore: Sh. Mohammad Ashraf, 1968), Vol. I, pp. 529-30.

تقسیم ہند اور مسلمانوں کی علیحدہ مملکتوں یا مملکت کے قیام کے حوالے سے قائداعظم کے نقطۂ نظر میں مختلف اوقات میں تبدیلیاں بھی آتی رہیں۔ اور ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک اس میں ردو قبول کا عمل جاری رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۶ء میں لیگ نے ابتداً کیبنٹ مشن پلان کو بھی تسلیم کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی جس نے بظاہر تقسیم ہند کے لیگی مطالبے کو رد کرتے ہوئے ایک ایسی کل ہند یونین کا خاکہ فراہم کیا تھا جو تین گروپوں پر مشتمل ہوتی۔ اس خاکے کی رو سے دفاع، خارجہ امور اور مواصلات کے شعبے مرکزی کنٹرول میں اور باقی ماندہ اختیارات گروپوں کے تصرف میں ہوتے۔ ۱۹۴۰ء کے بعد قائداعظم کے رویے میں جو تبدیلیاں وقتاً فوقتاً آتی رہیں ان کے محرکات کا جائزہ لیتے ہوئے عائشہ جلال نے اپنی تازہ تحقیقی کاوش[21] The Sole Spokesman میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جناح قیام پاکستان میں سنجیدہ نہیں تھے اور ۱۹۴۰ء کی قرارداد محض سیاسی سودے بازی کا ذریعہ تھی۔ البتہ بعد کے واقعات نے جن میں کانگریس کا رویہ بہت اہم ہے انہیں واقعتاً مطالبہ پاکستان کا نقیب بنا ڈالا۔

قراردادِ لاہور کا دوسرا پہلو اس میں تجویز کردہ مسلم مملکتوں کے اندرونی دروبست سے متعلق ہے۔ قراردادِ لاہور اپنے الفاظ و اصطلاحات اور مستقبل کے اس سیاسی و آئینی ڈھانچے کے حوالے سے جس کو اس میں مشتہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی بہت سے ابہام اور اشکالات رکھتی ہے۔ چنانچہ قرارداد کے منظور ہونے کے بعد اس پر استفسارات کا شروع ہو جانا اور مسلم لیگ کی قیادت کی جانب سے ان کے جوابات فراہم کرنے کی مشق کم ازکم اس بات کو ضرور ثابت کر دیتی ہے کہ یہ قرارداد بہت زیادہ آسان الفہم نہیں تھی۔ قرارداد میں جن دو مسلم ریاستوں کا ذکر کیا گیا تھا ان میں سے ایک ریاست ہندوستان کے شمال مغرب میں مطلوب تھی اور موجودہ پاکستان کو مطالبے کے اسی حصے کی عملی تجسیم اور حاصل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس ریاست کے اندر مرکز اور وحدتوں کے درمیان کس قسم کے تعلقات پیش نظر تھے اس کا اندازہ قرارداد کے الفاظ کو ذہن میں تازہ کئے بغیر ممکن نہیں۔ قرارداد کے متعلقہ حصے کے الفاظ یہ ہیں :

---

21. Aisha Jalal, The Sole Spokesman, (Cambridge: Cambridge University Press, 1985).

"اس ملک میں کوئی بھی آئینی منصوبہ قابلِ عمل ہوگا اور نہ مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول، جب تک اسے حسب ذیل بنیادی اصولوں کی اساس پر وضع نہیں کیا جائے گا۔ یعنی جغرافیائی طور پر متصل اکائیوں کی ایسے خطوں کی صورت میں حد بندی کی جائے، جن کی تشکیل ضروری علاقائی ردّ و بدل کے ساتھ اس طرح کی جائے کہ جن علاقوں میں مسلمان آبادی کے لحاظ سے اکثریت میں ہیں، جیسا کہ وہ ہند کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں ہیں، ان علاقوں کو اس طرح آپس میں ملایا جائے گا کہ وہ آزاد مملکتیں بن جائیں۔ ان مملکتوں میں شامل ہونے والی وحدتیں خود مختار (autonomous) اور مقتدر (sovereign) ہوں گی۔"[۲۲]

خط کشیدہ فقرے میں وحدتوں کی خود مختاری اور اقتدارِ اعلیٰ یا حاکمیت کے الفاظ کس تناظر میں استعمال ہوئے تھے؟ کیا یہ اصطلاحات ایک وفاقی نظام کے پس منظر میں استعمال ہوئی تھیں یا ان سے کوئی مختلف نظام مقصود تھا؟ قرارداد کے محررین نے شاید ان اصطلاحات کے مفہوم میں پائے جانے والی غیر معمولی وسعت اور اس کے نتیجے میں امکانی ابہام کے بارے میں زیادہ غور و فکر نہیں کیا تھا۔ اب ان دونوں اصطلاحات کو فیڈریشن کے پس منظر میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور کنفیڈریشن کے پس منظر میں بھی۔ قرارداد کے الفاظ سے قطع نظر قائداعظم کے ذہن میں ان اصطلاحات کا مفہوم فیڈریشن ہی کے حوالے سے تھا۔ ستمبر ۱۹۴۴ء میں گاندھی کے ساتھ قائداعظم کی خط و کتابت میں بھی ہمیں قائداعظم کے اس تصور کی شہادت مل جاتی ہے۔ مثلاً گاندھی نے پندرہ ستمبر کے اپنے خط میں قائداعظم سے منجملہ دیگر امور کے اس امر کی وضاحت چاہی کہ جن دو زونوں کی آزاد مملکتوں کا قرارداد میں ذکر ہے کیا ان کو متشکل کرنے والے اجزاء (constituents) کی تعداد غیر متعین ہوگی۔[۲۳] قائداعظم نے اس کا جواب نفی میں دیتے ہوئے یہ بھی وضاحت کی کہ یہ اجزاء پاکستان کی وحدتوں کی حیثیت

---

22. Latif Ahmed Sherwani (ed.), Pakistan Resolution to Pakistan, 1940 - 1947, (Karachi: National Publishing House Limited, 1969), p. 21.

23. Ibid, p. 77.

رکھیں گئے[۲۴] یہی نہیں بلکہ ۸ر نومبر ۱۹۴۵ء کو ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کو انٹرویو دیتے ہوئے قائداعظم نے مجوزہ پاکستان کے ڈھانچے کے بارے میں بالوضاحت اپنا تصور بیان کرتے ہوئے کہا:

"پاکستان کا نظریہ اس بات کی ضمانت فراہم کرتا ہے کہ قومی حکومت کی وفاقی وحدتیں اُسی خود مختاری کی حامل ہوں گی جو آپ، ریاستہائے متحدہ امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا کے دساتیر میں پاتے ہیں۔ البتہ بعض اہم اختیارات مرکزی حکومت کے پاس ہوں گے مثلاً مالیاتی نظام، قومی دفاع اور دیگر وفاقی ذمہ داریاں، ہر وفاقی ریاست یا صوبے کا اپنا الگ مقننہ، انتظامیہ اور عدلیہ کا نظام ہوگا اور حکومت کے یہ تینوں شعبے آئینی طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں گے۔"[۲۵]

قیامِ پاکستان کے پس منظر اور ۱۹۴۷ء سے قبل کے سیاسی ارتقاء کے اس مختصر مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ایک خاص وقت تک قائداعظم اور مسلم لیگ ہندوستان میں ایک ایسے قابلِ عمل وفاقی نظام کے خواہاں اور اس کے لئے کوشاں رہے جس میں ایک جانب مسلمان اکثریتی صوبوں کو قابلِ لحاظ خود مختاری حاصل ہوتی اور دوسری طرف مرکزی حکومت میں مسلمانوں کی آواز کے سنے جانے کا مناسب اہتمام کیا گیا ہوتا۔ ۱۹۳۵ء کے بعد قائداعظم اور لیگ نے اپنے اس طرزِ فکر سے بتدریج رجوع کر لیا اور وہ وفاقی نظام کے قابلِ عمل ہونے کے بارے میں اپنے پچھلے حسنِ ظن کو کھو بیٹھے۔ وہ کون سے اسباب تھے جو اس قلبِ ماہیت کا سبب بنے اس کا مختصر تذکرہ بھی ہم پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں۔ ۱۹۴۰ء کے بعد قائداعظم مسلمان اکثریت کے صوبوں کے لئے علیحدہ انتظام کے لئے آواز بلند کرتے رہے۔ اس پورے عرصے میں وہ وفاقیت کو غیر موزوں قرار دیتے نظر آتے ہیں۔ مگر واضح رہے کہ وفاقیت کی یہ مخالفت متحدہ ہندوستان کے تناظر میں تھی۔ جہاں تک مجوزہ مسلم مملکت کے نظام کا تعلق ہے اس کے بارے میں قائداعظم نے بارہا وضاحت کے ساتھ کہا کہ یہ وفاقیت کے اصولوں پر استوار ہوگا۔ انہوں نے کبھی بھی مجوزہ پاکستان کے حوالے سے کنفیڈریشن کی اصطلاح استعمال نہیں کی۔ ممتاز بھٹو اگر متحدہ

---

24. Ibid, p. 79.

25. Jamil-ud-Din Ahmad (ed.), op. cit. Vol. II pp. 232-33.

ہندوستان کے پس منظر میں قائداعظم کی وفاقیت کی مخالفت کو پاکستان میں وفاقیت کے استرداد کے لئے استعمال کرتے ہیں تو کوئی دوسرا شخص اسی نہج پر جمہوریت کی بھی مخالفت کر سکتا ہے کیونکہ متحدہ ہندوستان کے پس منظر میں قائداعظم نے جمہوریت کی بھی مخالفت کی تھی اور اسے اقلیتی قوم پر اکثریتی قوم کے دائمی تسلط کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا قائداعظم کے طرز فکر میں کوئی تضاد موجود تھا اور اگر تھا تو اس کی وجہ کیا تھی۔ زیادہ سہل الفاظ میں پوچھا جا سکتا ہے کہ آخر قائداعظم متحدہ ہندوستان کے اندر جس نظام کو ناپسند کرتے تھے، پاکستان کے لئے وہ نظام ان کے لئے قابلِ قبول کیوں تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مطالبۂ پاکستان اساسی طور پر دو قومی نظریے کے اوپر استوار ہوا تھا۔ قائداعظم کے پیشِ نظر اصل موضوع یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان قوموں کے درمیان اگر وفاقی نظام قائم ہوتا ہے تو اس میں اکثریت کی حکمرانی اقلیت کے لئے مضر ثابت ہو سکتی ہے۔ البتہ پاکستان میں انہیں ایسی کسی صورت حال کا اندیشہ نہیں تھا۔ پھر جس وقت پاکستان بنا اس وقت اکثریتی صوبہ مشرقی پاکستان تھا اور اس صوبے کو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک کبھی بھی پاکستان کے سیاسی و انتظامی نظام میں تسلط حاصل نہیں رہا۔ پاکستان میں اگر کسی صوبے کو تفوق حاصل رہا ہے تو وہ پنجاب ہے۔ مگر ۱۹۷۱ء سے قبل اس کو یہ تفوق عددی اکثریت کے بغیر حاصل تھا۔ پنجاب سے ملک کے بعض کلیدی اداروں میں تفوق کے اسباب نسبتاً مختلف تھے اور اس کا اس کی آبادی سے اتنا تعلق نہیں تھا۔ البتہ ۱۹۷۱ء کے بعد پنجاب، پاکستان کا اکثریتی صوبہ بن چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۹۷۱ء کے بعد کی صورت حال کا قائداعظم ۱۹۴۷ء میں یا اس سے قبل ادراک نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ خود وفاقیت کا جو تصور پاکستان کے حوالے سے قائداعظم کے ذہن میں تھا اور جس کا اظہار انہوں نے بارہا کیا بھی تھا وہ اپنی جگہ بڑا واضح اور صوبائی خودمختاری کی ضمانت فراہم کرنے والا تھا۔ کنفیڈریشن کے حامی حضرات اگر کنفیڈریشن کی اصطلاح کو قائداعظم سے منسوب کرنے اور قائداعظم کو وفاقی نظام کا مخالف قرار دینے کے بجائے ان کے اس تصورِ وفاقیت پر زور دیتے جو انہوں نے متحدہ ہندوستان کے دنوں میں مجوزہ پاکستان کے حوالے سے پیش کیا تھا اور جس کو اپنے لئے قابلِ تشفی تصور کرتے ہوئے مسلم اکثریتی صوبوں نے پاکستان کی اسکیم کو قبول کیا تھا، تو یہ پوزیشن

زیادہ منطقی اور تشکیلِ پاکستان کی تاریخ سے زیادہ مطابقت کی حامل ہوتی۔

سوال یہ ہے کہ قائداعظم کا تصورِ وفاقیت کیا تھا یا دوسرے لفظوں میں قائداعظم نے قیام پاکستان سے قبل مجوزہ مملکت کے لئے کس نوع کے وفاقی نظام کا تصور فراہم کیا تھا۔ نظری طور پر قائداعظم نے ہمیشہ ایک ایسے وفاقی نظام کی نشاندہی کی جہاں صوبائی خودمختاری کا خاطر خواہ انتظام ہوتا۔ قرار دادِ لاہور میں تو وحدتوں کی حیثیت متعین کرتے ہوئے خودمختاری اور حاکمیت تک کے الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔ بعد کے برسوں میں بھی جب کبھی ان سے اس موضوع پر استفسار کیا گیا تو ان کا جواب قرار دادِ لاہور کے مذکورہ فقرے کی تفسیر و تشریح کے دائرے ہی میں دیا گیا۔ ۸ نومبر ۱۹۴۵ء کے قائداعظم کے ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ کو دیئے گئے انٹرویو کا پہلے ہی ذکر آچکا ہے جس میں انہوں نے وفاقی وحدتوں کی خودمختاری کی حدود کی نشاندہی ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا کے دساتیر کے حوالے سے کی تھی اور مرکز کے لئے دفاع، مالیاتی نظام اور بعض دیگر وفاقی ذمہ داریوں کا وعدہ کیا تھا۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۴۵ء کو یعنی قیام پاکستان سے محض اٹھارہ ماہ قبل بمبئی میں ایک بیان دیتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"ہماری حکومتِ پاکستان غالباً ایک وفاقی حکومت ہوگی۔ جس میں صوبوں کو خودمختاری حاصل ہوگی۔ البتہ دفاع اور امور خارجہ وغیرہ کا کلیدی اختیار مرکز کو ہوگا۔ لیکن اس کا فیصلہ آئین ساز ادارہ، ہمارا آئین ساز ادارہ کرے گا۔"[۲۶]

یہاں ہم نے کیبنٹ مشن پلان کے سامنے مسلم لیگ کی جانب سے مئی ۱۹۴۶ء میں پیش کئے گئے دس نکاتی میمورنڈم کا حوالہ نہیں دیا ہے کیونکہ یہ نکتہ اٹھایا جاسکتا ہے کہ ان تجاویز کا مقصد متحدہ ہندوستان ہی کے دائرے کے اندر ایک ایسے آئینی انتظام کو وجود میں لانا تھا جس پر عملدر آمد کے نتیجے میں بظاہر تقسیم ہند کی نوبت نہ آتی اور پاکستان اس شکل میں وجود میں نہ آتا جس شکل میں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو اس کا ظہور ہوا۔ البتہ صوبائی خودمختاری کے حوالے سے قائداعظم کے طرزِ فکر کا فہم حاصل کرنے کے لئے اس میمورنڈم کی شقوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔

---

26. Ibid, p. 263

اس تمام گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قائداعظم کم از کم نظری اعتبار سے ایک ایسے وفاقی نظام کے مؤید رہے ہیں جو مرکزیت پسندی پر استوار نہیں ہوا تھا اور جس میں وفاقی وحدتوں کو بڑی حد تک خودمختاری حاصل تھی۔ البتہ قیام پاکستان کے بعد پاکستان میں کبھی بھی وہ وفاقی نظام قائم نہیں ہوا جس کی جھلک قائداعظم کے آزادی سے قبل کے بیانات میں نظر آتی ہے۔

پاکستان میں وفاقی نظام کی ناکامی کا مفروضہ

اب ہم سندھی، بلوچ، پشتون فرنٹ کے رہنماؤں کے دلائل کے اس دوسرے مجموعے کی طرف آتے ہیں جو قیام پاکستان کے بعد کے ادوار اور ان میں پیش آنے والے سیاسی واقعات و حادثات سے اخذ کیے گئے ہیں۔ فرنٹ کے رہنما کنفیڈریشن کے حق میں جو دوسرا بنیادی استدلال پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ فیڈرل نظام پاکستان میں ناکام ہو چکا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سابقہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی بھی فیڈرل نظام کی وجہ سے ہوئی (ممتاز بھٹو کا موقف یہ ہے کہ پاکستان کنفیڈریشن سے نہیں ٹوٹے گا بلکہ فیڈریشن اس کے انتشار کا سبب بنے گی جیسا کہ بقول ان کے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں ماضی میں ہو چکا ہے) ان رہنماؤں کا کہنا ہے کہ ۱۹۷۳ء کا دستور ایک وفاقی دستور تھا جس کو تمام صوبوں کے منتخب نمائندوں نے منظور کیا تھا مگر اس دستور کا فراہم کردہ وفاقی نظام بھی ناکام ثابت ہوا اور اگر آئندہ پھر اس دستور کو اسی شکل میں بحال کیا گیا تب بھی یہ ناکامی ہی کا منہ دیکھے گا۔ ہمارے خیال میں فرنٹ کے رہنماؤں کا یہ استدلال بڑی حد تک تسہیل (over simplification) کا مظہر ہے۔ قیام پاکستان سے لے کر اب تک ملک میں جتنے دساتیر بنے ان میں سے کسی میں بھی ایک حقیقی وفاقی نظام کا پرتو نظر نہیں آتا۔ اب اگر ایک نظام اپنی حقیقی روح کے ساتھ ملک میں کبھی نافذ ہی نہیں ہوا تو اس کی ناکامی یا کامیابی کا فیصلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے یہی سوال جب ہم نے ممتاز بھٹو سے کیا تو انہوں نے ایک مزید دلچسپ اور پُرمعنی نکتہ اٹھا دیا۔ انہوں نے کہا کہ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ وفاقی نظام پاکستان میں ناکام ہو گیا ہے۔ تو اس سے لازماً یہ مراد نہیں لینی چاہیئے کہ یہ ناکامی اس نظام کے قیام کے بعد ہوئی ہے۔ بلکہ اس کو یوں

بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ وفاقی نظام ملک میں قائم اس لیئے نہیں ہو سکا کہ پاکستان کے حالات میں اس کا قیام ہے ہی ناممکن۔ دوسرے لفظوں میں ایک وفاقی نظام کے لئے جن بنیادی سماجی و سیاسی مقتضیات کی ضرورت ہوتی ہے وہ پاکستان میں ناپید ہیں۔ اپنے کتابچے میں بھی ممتاز بھٹو نے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"اگرچہ پاکستان میں وفاقیت کی ناکامی کا ذمہ داران لوگوں کو ٹھہرایا جاتا ہے جو کل اقتدار و اختیار کے مالک تھے اور جنہوں نے اس نظام کو مسخ کرکے رکھ دیا تاہم اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ خود یہ نظام اپنے آپ کو اس بے حرمتی کے لئے پیش کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ دیکھنا بھی انتہائی ضروری ہے کہ وفاقیت کے بنیادی لوازمات (prerequisites) نہ تو پاکستان میں موجود ہیں اور نہ ہی کبھی موجود رہے ہیں۔ وفاقیت کی موزونیت اور اس کے قابل عمل ہونے کے بارے میں پائے جانے والے مفروضے کے پیچھے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔"[۲۷]

اس کے بعد ممتاز بھٹو دو سیاسی مفکرین اے.وی ڈائسی[۲۸] (A.V. Dicey) اور کے.سی. وہیئر[۲۹] (K.C. Wheare) کے حوالے سے وفاقی ڈھانچے کے بنیادی لوازمات درج کرتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ ڈائسی کے بیان کردہ تین اصولوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ تین اصول مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ وفاقی وحدتوں کے درمیان جغرافیائی اتصال (geographical contiguity)

۲۔ دولت اور آبادی میں برابری۔

---

27. Mumtaz Ali Bhutto, op. cit., p. 25

28. A.V. Dicey, An Introduction to the Study of the Law of the Constitution, (London: English Language Book Society and Macmillan, 1973).

29. K.C. Wheare, Federal Government, (London: Oxford University Press, 1963).

۴۔ تاریخی پس منظر کی یکسانیت ۔

ان تین اصولوں کے علاوہ وہ کے۔سی۔ وھیئر کے حوالے سے ایک اور اصول کا اضافہ کرتے ہیں جو وفاقی وحدتوں کے درمیان ایک مشترکہ مرکزی حکومت کے تحت رہنے کی خواہش کا اصول ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان سب متفرق وحدتوں کے مابین ایک مشترکہ تصورِ قومیت کی موجودگی وفاقیت کی کامیابی کے لئے ناگزیر ہے۔ ان مقتضیات کے ذکر کے بعد ممتاز بھٹو اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ آیا یہ پاکستان کے معاملے میں پورے ہوتے ہیں یا نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وفاقی وحدتوں کے درمیان اتصال کی کیفیت کے موجود نہ ہونے کے نتیجے ہی میں سابقہ مشرقی پاکستان نے وفاقی نظام کو رد کر دیا اور علیحدگی کا فیصلہ کیا۔ اب جو صوبے پاکستان میں موجود ہیں اُن میں آبادی، علاقے اور دولت کے حوالے سے اس قدر تفاوت پایا جاتا ہے کہ ان کے درمیان کسی شکل میں بھی توازن قائم نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک تاریخی پس منظر کا تعلق ہے تو بقول اُن کے پنجابی، سندھی، بلوچ اور پٹھان جداگانہ قومی تشخص رکھتے ہیں اور ان کی زبانیں، کلچر، روایات وغیرہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں۔ ان کا تاریخی ورثہ بھی مختلف ہے۔ یہ اس مختلف تاریخی و ثقافتی پس منظر ہی کا نتیجہ تھا کہ قراردادِ لاہور میں وحدتوں کے لئے خودمختاری اور حاکمیت کے اصول کو تسلیم کیا گیا تھا مگر قیامِ پاکستان کے بعد جب اس وعدے کو نظرانداز کر دیا گیا تو وحدتوں کی طرف سے احتجاج کا عمل شروع ہوا۔ بنگال اپنے احتجاج کو ایک منطقی انجام تک پہنچا چکا ہے۔ اب پختون، سندھی اور بلوچی آبادیاں اپنے حقوق کے لئے جدوجہد پر کمربستہ ہیں۔ ممتاز بھٹو کے خیال میں یہ جدوجہد وفاقی نظام کے خلاف ہے۔ نیز اگر ان وحدتوں کو یکجا رکھنے کا کوئی راستہ باقی بچا ہے تو وہ کنفیڈریشن کا قیام ہی ہے۔[30]

یہاں ہم اے۔ وی۔ ڈائسی اور کے۔سی۔ وھیئر کے وفاقیت کے بارے میں تصورات کا نسبتاً تفصیل سے ذکر کریں گے اور مذکورہ مصنفوں کی وفاقیت کی ان تشریحات کا بھی جائزہ

30. Mumtaz Ali Bhutto, op. cit., pp. 25 - 29

کرنے کی کوشش کریں گے جن کا ذکر ممتاز بھٹو نے بوجوہ نہیں کیا ہے۔ ان تفصیلات کے بیان کے بعد ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ آیا پاکستان کے حالات وفاقیت کے لئے موزوں ہیں یا نہیں۔ جہاں تک اے۔ وی ڈائسی کا تعلق ہے، یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اولاً ڈائسی وفاقیت کے موضوع پر کوئی مستند عالم (authority) کی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کا تعلق برطانیہ سے تھا اور ان کی علمی کاوشوں کا محور بھی بنیادی طور پر برطانیہ کا آئینی اور سیاسی نظام تھا۔ چنانچہ ان کی مشہور تصنیف "قانون دستور کا ایک تعارف" جو سیاسی و آئینی ادب میں حوالے کی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے دراصل برطانوی غیر تحریری آئین کے اصولوں کی تشریحات و توجیہات کے گہرے مطالعے پر مشتمل ہے۔ برطانیہ کیونکہ ایک وحدانی مملکت ہے لہٰذا ڈائسی اپنی کتاب میں جہاں وفاقیت کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہیں وہاں ان کا مقصد وفاقی نظاموں کے مختلف رجحانات کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ وہ وفاقیت کا تذکرہ برطانیہ کے نظام کے ساتھ تقابل کے ضمن میں کرتے ہیں۔ اس کا بہرحال یہ مطلب نہیں ہے کہ انہوں نے وفاقیت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ مستند نہیں ہے۔ ڈائسی کے بارے میں دوسری بات یہ پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ ان کی تصنیف بڑی حد تک اب از کار رفتہ (out of date) ہو چکی ہے۔ یہ کتاب ایک سو سال قبل (۱۸۸۵ء میں) لکھی گئی تھی۔ گذشتہ سو برسوں میں جہاں ایک طرف امریکہ، سوئٹزرلینڈ اور جرمنی جیسے پرانے وفاقی نظاموں میں بے شمار نئے رجحانات در آئے ہیں وہاں دوسری طرف بہت سی نئی وفاقی مملکتیں معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ ڈائسی کی کتاب ظاہر ہے کہ ان سب کا احاطہ نہیں کرتی۔

ان حقائق کے باوجود ڈائسی کی تشریحات غیر متعلق یا غیر اہم نہیں ہیں۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کو بغیر کسی قطع و برید کے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ ڈائسی وفاقی ریاست کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> A federal state is a political contrivance intended to reconcile national unity and power with the maintenance of "state rights".

ترجمہ: "ایک وفاقی ریاست دراصل ایک سیاسی تدبیر ہے جس کا مقصد قومی اتحاد و قوت کو ریاستی (وحدتوں کے) حقوق کے تحفظ کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہے۔"[۳۱]

وفاقیت کے لوازمات یا شرائط کے ضمن میں ڈائسی دو چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ پہلی شرط تو ایسی وحدتوں (ڈائسی نے اس کے لئے ملکوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔) کی موجودگی ہے جو وفاق قائم کریں۔ یہ وحدتیں جائے وقوع، تاریخ اور نسلیت وغیرہ کے حوالے سے ایک دوسرے کے ساتھ کسی نہ کسی درجے میں مشترک اقدار کی حامل ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ادوارِ گذشتہ میں ان کا کسی مشترک مقتدر کے زیر اثر رہنا بھی ان کے درمیان مستقبل میں اشتراک و تعاون کا ایک ذریعہ ثابت ہوتا ہے جیسا کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ضمن میں ہوا جہاں وفاق میں شامل وحدتیں ماضی میں ایک ہی مقتدر یعنی برطانوی نوآبادیاتی نظام کے زیر تسلط تھیں۔

ڈائسی کے نزدیک وفاقیت کے لئے دوسری لازمی شرط وحدتوں کے باشندوں میں وفاقی نظام کے تحت رہنے کا جذبہ ہے۔ اس جذبے کی عدم موجودگی میں وفاقیت کی کامیابی ناممکن ہے۔ سوال یہ ہے کہ وفاقی جذبہ ہے کیا۔ ڈائسی کہتے ہیں کہ صحیح وفاقی جذبہ یہ ہے کہ وحدتوں کے باشندے ایک دوسرے کے ساتھ اشتراکِ عمل پر آمادہ ہوں اور اس کے لئے ایک انجمن (union) بنانے کی خواہش رکھتے ہوں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ڈائسی انجمن (union) اور اتحاد (unity) میں فرق کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں انجمن میں شامل اجزاء بعض مشترکہ مقاصد کی خاطر یکجا ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اپنے جداگانہ تشخص کو بھی باقی رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس 'اتحاد' میں شامل عناصر کسی قابلِ ذکر علیحدہ تشخص کے حامل نہیں ہوتے اور اس مجموعے ہی کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں جو ان کے اشتراک یا ادغام سے وجود میں آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وفاق کی حیثیت ایک انجمن کی ہوتی ہے جبکہ اتحاد

---

31. A.V. Dicey, op cit, p. 143.

کی مناسب تجسیم ایک وحدانی نظام کے اندر ہوتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اوپر جس وفاقی جذبہ کا ذکر ہوا ہے اس کے سیاسی و اقتصادی محرکات کیا ہیں۔ اس سوال کا بہت مناسب جواب کے۔سی۔ وھیئر نے اپنی کتاب "جدید وفاقیت" میں دیا ہے۔

کے۔سی۔ وھیئر، اے۔ وی۔ ڈائسی کے برعکس وفاقیت کے موضوع پر سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی جس تصنیف کا ہم نے حوالہ دیا ہے وہ اپنے موضوع پر بہترین کتب میں شمار ہوتی ہے۔ وھیئر کے حوالے سے یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ اُن کی تصنیف نسبتاً قریب کے زمانے کی ہے، یہ کتاب ۱۹۴۶ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی۔ ہمارے پیش نظر اس کا چوتھا ایڈیشن (بابت ۱۹۶۳ء) ہے اور اس میں فاضل مصنف نے ۱۹۴۶ء کے بعد کے سیاسی و آئینی واقعات اور پیش رفت کا بھی احاطہ کر لیا ہے۔

وھیئر وفاقیت کے مقتضیات کے ضمن میں مجموعی طور پر تیرہ نکات بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے سات نکات مرکزی حکومت کے قیام کے جواز یا اسباب کی حیثیت رکھتے ہیں جبکہ چھ نکات وحدتوں کے اپنے جداگانہ تحفظ پر اصرار سے متعلق ہیں۔ مرکزیت پسندی اور مرکزیت گریزی کے پیچھے کارفرما ان عوامل کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو ایک دلچسپ صورتحال سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ مرکزیت پسندی کے پیچھے کارفرما سات اور مرکزیت گریزی کے پیچھے مضمر چھ عوامل میں پانچ عوامل مشترک ہیں مثلاً اقتصادی محرک مرکزیت پسندی کے پیچھے بھی کارفرما ہے اور مرکزیت گریزی کے پیچھے بھی۔ دوسرے لفظوں میں بعض اقتصادی محرکات قیام مرکز کا جواز فراہم کرتے ہیں جبکہ بعض دوسرے اقتصادی محرکات وحدتوں کی خودمختاری کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ چنانچہ وھیئر کے بیان کردہ محولا بالا تیرہ محرکات کو تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ ان محرکات پر مشتمل ہے جو صرف مرکز پسندی کے پیچھے کارفرما ہوتے ہیں (ایسے عوامل کی تعداد دو ہے) دوسرے حصے میں وہ محرک آتا ہے (ایسا محرک صرف ایک ہی ہے) جو مرکز گریزی یا وحدتوں کی خودمختاری کا جواز فراہم کرتا ہے۔ تیسرے نمبر پر وہ دس محرکات ہیں جن میں سے پانچ مرکزیت پسندی کے پیچھے کارفرما ہوتے ہیں اور پانچ عوامل مرکزیت گریزی کی گنجائش پیدا کرتے ہیں۔ اس قسم کے محرکات کے مابین توازن کو قائم کرنا انتہائی نازک اور مشکل کام ہے مگر اسی توازن پر وفاقی نظام کی

کامیابی یا ناکامی کا دارومدار ہے۔

مندرجہ بالا محرکات وفاقیت جن میں مرکز پسندی اور مرکز گریزی دونوں کا جواز فراہم کرنے والے محرکات شامل ہیں کم وبیش تمام وفاقی مملکتوں میں مؤثر نظر آتے ہیں۔ البتہ ان کے اطلاق کے مدارج میں فرق ہو سکتا ہے یعنی ہر وفاقی مملکت میں ان میں سے بعض عوامل زیادہ اور بعض کم مؤثر ہو سکتے ہیں مگر ان سب کا کسی نہ کسی حد تک موجود ہونا تقریباً ناگزیر ہے۔ ان عوامل کو ایک وفاقی مملکت میں کس طور پر بروئے کار لایا جاتا ہے، مرکز پسندی اور مرکز گریزی کے درمیان ایک قابل عمل توازن کس طرح قائم کیا جاتا ہے اسی پر اُس وفاقی نظام کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ اگر مرکزیت کے رجحان کو متوازن کرنے والے عوامل مثلاً وحدتوں کے متفرق مخصوص اقتصادی مفادات اور ان کی قومیت کو نظر انداز کر دیا جائے تو وحدتیں اس وفاق کو اپنے لئے موزوں تصور نہیں کرتیں۔ اسی طرح اگر مرکز کو بالکل بے دست وپا بنا دیا جائے تو اس صورت میں بھی وفاقی نظام آگے نہیں چل سکتا۔

پاکستان کے معروضی حالات وکوائف اور وفاقی نظام کی موزونیت کا مسئلہ

محرکاتِ وفاقیت کے بارے میں ان وضاحتوں کے بعد اب ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ محرکات ہیں کیا اور پاکستان کے معاملے میں ان میں سے کون کون سے تقاضے پورے ہوتے ہیں اور کونسے تقاضے اور محرکات ایسے ہیں جو ہمارے حالات سے مکمل طور پر مطابقت نہیں رکھتے۔ سب سے پہلے ہم ان دو عوامل کا ذکر کریں گے جو ایک وفاق میں صرف قیام مرکز یا مرکزیت پسندی کے فروغ کے حوالے سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

۱۔ دفاعی اعتبار سے عدم تحفظ کا احساس:

وحدتوں میں قیام وفاق سے قبل دفاعی اعتبار سے عدم تحفظ کا احساس ایک مشترکہ دفاعی انتظام کی خواہش پر منتج ہوتا ہے۔ اس کے لئے ایک قابلِ عمل لائحہ عمل ایک ایسے مرکز کے

قیام کو تصور کیا جاتا ہے جو وحدتوں کو مجموعی طور پر دفاعی استحکام فراہم کرتا ہے۔ اس کی مثال ریاستہائے متحدہ امریکہ، سوئٹزرلینڈ وغیرہ کے وفاقوں سے دی جا سکتی ہے جہاں ماضی کی تقریباً خودمختار ریاستوں نے منجملہ دیگر اسباب کے، دفاعی تحفظ کے پیشِ نظر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی راہ تلاش کی اور وفاق کے قیام کو اس کا مناسب ترین ذریعہ ٹھہرایا۔

وحدتوں کے آمادۂ وفاق ہونے کے ضمن میں دفاعی محرک پاکستان کے معاملے میں کوئی قابلِ ذکر حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان میں شامل وحدتیں قیامِ پاکستان سے قبل کسی بیرونی طاقت سے نہ تو کوئی انفرادی تنازعہ رکھتی تھیں اور نہ ہی غیر منقسم ہندوستان کسی بیرونی طاقت سے کشیدگی یا سرد جنگ کی حالت میں تھا۔ دوسرے الفاظ میں سندھ، بلوچستان، صوبہ سرحد اور پنجاب اگر پاکستان کا حصہ بننے پر آمادہ ہوئے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ کسی مشترک یا متفرق بیرونی طاقتوں کی جنگ بازی یا تسلط کا خوف ان پر طاری تھا چنانچہ ان وحدتوں کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی وجوہات کم از کم ان معنوں میں ریاستہائے متحدہ امریکہ، سوئٹزرلینڈ اور بعض دوسرے وفاقی ممالک سے مختلف تھیں کہ یہاں دفاعی عدم تحفظ کا عامل یکسر یا بڑی حد تک ناپید تھا۔ تشکیل پاکستان کی وجوہات کاملاً سیاسی تھیں۔

۲۔ بیرونی طاقتوں کی دستبرد سے محفوظ رہنے کی خواہش:

دفاعی نقطۂ نظر سے آمادۂ وفاق ہونے کے بعد بھی وحدتوں کو اس امر کی مستقل جستجو رہتی ہے کہ آئندہ بھی وہ بیرونی طاقتوں کی دستبرد سے محفوظ رہیں۔ یعنی دفاعی پہلو نہ صرف ان کو وفاق کے قیام پہ آمادہ کرتا ہے بلکہ وفاق کے تسلسل کا بھی جواز فراہم کرتا ہے۔

جہاں تک وفاقیت کے دوسرے تقاضے کا تعلق ہے یعنی وحدتوں میں یہ احساس کہ ایک وفاق کی صورت ہی میں وہ اپنی آزادی کا تحفظ کر سکتی ہیں تو پاکستان میں اس کی تعبیر بھی نسبتاً مختلف اور پیچیدہ ہے۔ گو کہ آزادی کے وقت پاکستان میں شامل وحدتیں کسی غیر معمولی غیر ملکی جارحیت کا خوف نہیں رکھتی تھیں تاہم آزادی کے چالیس برسوں میں پاکستان تین جنگوں کے تجربے سے گذرا ہے اور ہندوستان کے ساتھ ہمارے تعلقات اس پورے عرصے میں

کشیدہ رہے ہیں۔ تعلقات کی اس کشیدگی اور دونوں ملکوں کے مابین لڑی جانے والی تین خونریز جنگوں کے اسباب و علل کیا تھے یہ سر دست ہماری بحث کے دائرے میں نہیں آتے البتہ جو بات نقطۂ زیر بحث کے حوالے سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ ملک کی مختلف وحدتوں میں بیرونی جارحیت اور اپنے عدم تحفظ کے احساسات کے مدارج میں فرق ہے۔ بیرونی خطرات کے ادراک (perception) میں یہ فرق مختلف تاریخی و سیاسی عوامل کا نتیجہ ہے۔ ایک عام مشاہدہ یہ ہے کہ بیرونی خطرات بالخصوص ممکنہ بھارتی حملے کا احساس پنجاب میں زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کیا جاتا ہے۔ اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تشکیل پاکستان کے وقت بنگال کے علاوہ یہ پنجاب ہی کا صوبہ تھا جس میں خط تقسیم کھینچا گیا۔ تقسیم پنجاب کے لئے ریڈ کلف ایوارڈ نے جو انداز کار اختیار کیا وہ اپنی جگہ بڑا محل نظر تھا اور اس کی کوئی نظیر سیاسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ویسٹن ایچ۔ آوڈن نے اپنی نظم "تقسیم" میں لارڈ ریڈ کلف کا ذکر بڑے پر معنی انداز میں کیا تھا۔

محض سات ہفتوں میں یہ کام ہوا، سرحدیں کھینچیں گئیں
اچھی یا بری اک برعظم کی تقسیم ہوئی۔
اگلے ہی روز وہ انگلستان چل دیا، جہاں وہ بھول بھی گیا۔
وہ سارا قصہ، اک پیشہ ور وکیل کی مانند۔ کیا وہ کبھی وہاں پہ لوٹے گا
نہیں، کبھی نہیں۔ خود اس نے اپنے کلب میں کہا تھا۔ اس کو نہیں مرنا ہے۔[۳۲]

تقسیم کے اس عمل نے صرف جغرافیائی حد بندی نہیں کی بلکہ برادریوں کو، خاندانوں کو صدیوں کے خونی رشتوں کو بھی تقسیم کر دیا۔ پھر وسیع پیمانے پر ہونے والی نقل مکانی کا مرکز بھی پنجاب ہی بنا۔ پاکستان میں ہجرت کرنے والے مہاجرین کا اسی فیصد مشرقی پنجاب سے آگ اور خون کی وادیاں طے کر کے پاکستانی پنجاب میں آباد ہوا۔ یہ لاکھوں افراد تقسیم کے دور کی ذہنی فضا کو آسانی کے ساتھ محو نہیں کر سکتے۔

---

32. Mujtaba Razvi, The Frontiers of Pakistan, (Karachi: National Publishing House Ltd., 1971), p.

ایک اور حقیقت جو پنجاب کو عدم تحفظ کے احساس سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دوچار کرتی ہے وہ اس کی وسیع مشرقی سرحدیں ہیں جو تمام تر ہندوستان کے ساتھ ملتی ہیں۔ ماضی میں ہونے والی جنگوں میں یہ سرحدیں میدان کارزار بھی بنی ہیں اور پنجاب کے کئی شہروں نے نہ صرف لڑائی کی آوازیں سنی ہیں بلکہ فی الواقعی ان لڑائیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں تو سیالکوٹ اور لاہور جنگ کے دہانے پر تھے۔ اور لاہور کی بابت تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بی۔ آر۔ بی نہر کے ایک طرف جنگ تھی اور دوسری طرف شہر۔ ایک اور چیز جو پنجاب کو دفاع کے معاملے میں دوسرے صوبوں کے مقابلے میں زیادہ حساس بناتی ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ پاکستانی مسلح افواج کا غالب حصہ اسی صوبے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس حقیقت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اب تک ہونے والی جنگوں کے اثرات بھی زیادہ تر پنجاب کی آبادی ہی میں پہنچے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ پنجاب کے ہر خاندان کا ایک نہ ایک فرد مسلح افواج سے ضرور تعلق رکھتا ہے۔ اس طرح اب تک کی جنگوں میں جو جانی نقصان ہوا ہے وہ بھی زیادہ تر پنجاب کے خاندانوں کا ہوا ہے۔ پھر باقاعدہ جنگوں ہی میں نہیں بلکہ امن کے زمانے میں بھی سپاہیوں کی کئی کئی ماہ کے لئے مشقوں کی خاطر گھروں سے غیر حاضری پنجابی گھرانوں ہی کو متاثر کرتی ہے۔ اور یوں 'جنگ' پنجاب میں ایک خانگی اصطلاح (household term) کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور دفاع کا احساس اہل پنجاب کی نفسیات کا جزو بن چکا ہے۔

البتہ دوسرے صوبوں میں یہ صورتحال نہیں ہے۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان کی تو ہندوستان کے ساتھ کوئی سرحد ہی نہیں ملتی۔ سندھ کی سرحد ہندوستان کے ساتھ ملتی ہے مگر رن کچھ کا علاقہ بجائے خود ایک نسبتاً محفوظ سرحد کی حیثیت رکھتا ہے اور تاریخ میں بڑے بڑے حملہ آور اس کو عبور کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ تقسیم برصغیر کے عمل میں بھی ان تینوں صوبوں کو جغرافیائی تبدیلیوں سے دوچار نہیں ہونا پڑا اور پھر ان صوبوں کی پاکستان کی مسلح افواج میں عدم نمائندگی یا معمولی نمائندگی بھی اپنی جگہ ایک معلوم حقیقت ہے۔ ان عوامل ہی کا نتیجہ ہے کہ یہ صوبے بیرونی خطرے سے صرف پاکستان کا حصہ ہونے کی بنا پر ایک عمومی تعلق رکھنے کے باوجود اس مخصوص ذہنی فضا سے دوچار نہیں ہیں جو پنجاب کا خاصہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض دوسرے عوامل نے چھوٹے صوبوں میں مذکورہ امور کے

بارے میں اکثر لاتعلقی کے رجحان کو بھی تقویت پہنچائی ہے۔ مثلاً پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک بڑا حصہ مارشل لاء اور غیر جمہوری ادوار پر مشتمل ہے۔ ان ادوار میں چھوٹے صوبوں کے احساسِ محرومی میں بجا طور پر اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ چھوٹے صوبے اپنی خود مختاری کے چھن جانے کا ذمہ دار فوج میں غیر معمولی نمائندگی کے حوالے سے، پنجاب ہی کو ٹھہراتے ہیں۔ جوں جوں سیاست میں غیر جمہوری قوتوں کا عمل دخل بڑھتا جاتا ہے۔ ویسے ویسے پنجاب پر ڈالے جانے والے اس بار کا بوجھ بھی بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان صوبوں کی قیادتیں پنجاب اور فوج کے تعلق کو ایک مختلف پیرائے میں بیان کرنا شروع کرتی ہیں۔ اب ان کا طرز استدلال یہ ٹھہرتا ہے کہ پنجاب چھوٹے صوبوں پر "تسلط" قائم رکھنے کے لئے فوج پر انحصار کرتا ہے۔ یہ "تسلط" جوں جوں پختہ تر ہوتا جاتا ہے چھوٹے صوبوں میں بیرونی حملے کا خدشہ اتنا ہی بے معنی بنتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ حفیظ پیرزادہ بیرونی خطرے کو ایک ایسا پروپیگنڈا قرار دیتے ہیں جس کا مقصد چھوٹے صوبوں کو تہہ دام رکھنے کے لئے فوجی اقتدار کا جواز فراہم کرنا ہے۔ ان احساسات کو مزید تقویت ان انکشافات سے پہنچی ہے جو ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کے بارے میں گذشتہ برسوں میں ہوئے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ تو پاکستان کی شکست ہی پر منتج ہوئی تھی اور اس میں ہماری اس وقت کی قیادت کی غلط سیاسی و فوجی حکمت عملی شروع ہی سے ہدفِ تنقید رہی ہے۔ البتہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بارے میں ہمارے ہاں یہ تاثر بہت مضبوط تھا کہ یہ جنگ پاکستان نے نہ صرف یہ کہ خود نہیں چھیڑی تھی بلکہ ہماری افواج نے ملکی دفاع کی ذمہ داری نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ نبھائی تھی۔ تاہم گذشتہ چند برسوں میں خود اس جنگ کے زمانے کے بعض اعلیٰ ترین فوجی اور غیر فوجی عہدیدار جن میں بری افواج کے کمانڈر انچیف ریٹائرڈ جنرل محمد موسیٰ، فضائیہ کے سربراہ ریٹائرڈ ائیر مارشل نور خان اور سیکرٹری اطلاعات اور ایوب خان کے دستِ راست الطاف گوہر شامل ہیں بالواسطہ طور پر جنگ کے آغاز اور کشمیر میں گوریلا کارروائیوں کے آغاز کا ذمہ دار پاکستان ہی کو قرار دے چکے ہیں۔ یہ حضرات ۱۹۶۵ء کی جنگ کو اس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو سیکرٹری خارجہ عزیز احمد اور ریٹائرڈ میجر جنرل اختر ملک کی مشترکہ سازش قرار دیتے ہیں جس کا مقصد آخر کار ایوب خان سے نجات حاصل کرنا تھا۔ یہ الزام کس حد تک درست ہے اس

کا فیصلہ تو مستقبل کا مورخ ہی کرے گا جس کے سامنے جملہ حقائق یکجا ہوں گے۔ تاہم ان الزامات نے کم از کم جنگ کے ضمن میں ہندوستان کی ذمہ داری کو بہت کم کر دیا ہے۔ پاکستان کی حربی تاریخ کے بارے میں اس قسم کے انکشافات نے بھی بالخصوص چھوٹے صوبوں میں اس طرزِ فکر کو کمک پہنچائی ہے کہ بیرونی جارحیت کا موضوع اپنی جگہ کافی پہلودار موضوع ہے جس کو اس کی ظاہری شکل (face value) ہی تک محدود کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ الغرض پاکستان کی مختلف وحدتوں میں یہ دوسرا وفاقی عامل یعنی بیرونی تسلط کا خدشہ یکساں طور پر موجود نہیں ہے۔ پنجاب کی حد تک یہ عامل زیادہ شدید ہے۔

کاملاً مرکزیت پسندی کے پیچھے کارفرما ان محرکات کے بعد ہم اُس محرک کا جائزہ لیں گے جو تمام و کمال مرکزیت گریزی یا وحدتوں کی خود مختاری کے تحفظ کا سامان پیدا کرتا ہے۔ یہ محرک ایک وحدت میں پایا جانے والا جداگانہ قومیت (nationality) کا وجود ہے۔

۳۔ وفاقی وحدتوں میں جداگانہ قومیتوں کا وجود:

اس ضمن میں مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ بعض وفاقی نظاموں میں وحدتیں محض انتظامی و سیاسی بنیادوں پر ہی وجود میں نہیں آتیں بلکہ اس سے بڑھ کر قومیتی تشخص کی بھی حامل ہوتی ہیں۔ ایسی صورتوں میں وحدتیں اپنے قومیتی کردار کے دوام کی آرزومند ہوتی ہیں۔ اور اس کردار پر نافذ کی جانے والی کسی بھی حد کو خواہ وہ اُسی مرکز کی جانب سے کیوں نہ عائد کی گئی ہو جس کی تشکیل میں خود اس کی مرضی و منشا شامل رہی ہو، ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی اور اس کی حتی الامکان مزاحمت کرتی ہیں۔ یہ اس قدر مضبوط محرک ہے کہ اگر ایک وفاقی نظام میں کارفرما باقی ماندہ تمام محرکات کا رخ مرکزیت پسندی کی طرف ہو اور صرف کثیر القومی محرک موجود ہو تب بھی وفاقی نظام میں مرکزیت پسندی کے رجحان کے خاطر خواہ سدباب کی گنجائش نکل آتی ہے اور وفاق میں کسی نہ کسی سطح پر توازن قائم ہو جاتا ہے۔ یہاں ہم کینیڈا کی مثال دیں گے جس کے وفاق میں شامل وحدتوں کی مختلف لسانی اور مختلف القومی حیثیت ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی صورت حال بڑی حد تک انڈیا کے وفاق کی بھی ہے۔ سوویت یونین کا وفاق تو قومیتوں کے جداگانہ تشخص کو اساسی اصول ہی کی حیثیت

سے برتا ہے۔

مرکزیت پسندی کے نقطۂ نظر سے یہ عامل ناپسندیدہ سہی مگر ایک وفاق میں یہی عامل ہوتا ہے جو درحقیقت مرکزیت پسندی اور مرکز کی من مانی کے رجحان کے انسداد کا ذریعہ بنتا ہے۔

جہاں تک پاکستان کی وحدتوں کا تعلق ہے یہ بنیادی طور پر صوبوں پر مشتمل ہیں۔ ہمارے دساتیر بھی صوبوں ہی کے وجود کو تسلیم کرتے رہے ہیں۔ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ ہمارے صوبوں کی حد بندی نسلی، لسانی یا قومیتی بنیادوں پر نہیں بلکہ خالص انتظامی بنیادوں پر ہوئی ہے اور یہ انتظامی بنیادیں بھی ہماری اپنی سوچ بچار کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ انگریز کے زمانے اور انگریز کے اپنے مفادات کی استوار کردہ ہیں۔ ان حقائق کے علی الرغم پاکستانی معاشرہ نسلی و لسانی یا قومیتی تنوعات کا حامل ہے۔ ہر چند ہمارے صوبے قومیتی حوالے سے استوار نہیں ہوئے ہیں تاہم کم و بیش سب صوبوں کی پہچان کسی نہ کسی قومیت کے حوالے ہی سے ہوتی ہے۔ صوبہ سرحد کے سوا ہمارے صوبوں کے نام بھی قومیتوں کی مناسبت سے رکھے گئے ہیں۔ چنانچہ سندھ، پنجاب اور بلوچستان علی الترتیب سندھی، پنجابی اور بلوچی صوبے ہیں۔ صوبہ سرحد گو کہ پختون صوبہ ہے مگر اس کا نام انگریز کے زمانے سے "شمال مغربی صوبہ سرحد" چلا آرہا ہے اور یہ بات اپنی جگہ غور طلب ہے کہ انگریز کے رخصت ہونے کے بعد اس خطے کو اس کی طرف سے دیا گیا نام، جو استعماری جغرافیائی و سیاسی حکمت عملی کا مظہر تھا، باقی رکھنے کا کیا جواز ہے۔ صوبائی وحدتوں کے قومیتی تشخص کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہر صوبے میں صرف ایک ہی قومیت کے باشندے آباد ہیں بلکہ کم و بیش ہر صوبے میں ایک غالب قومیت کے ساتھ ساتھ دوسری قومیت کے باشندے بھی آباد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حلقے صوبوں کی از سر نو حد بندی کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ ان صوبوں کو زیادہ سے زیادہ قومیتی وحدتوں کے قالب میں ڈھالا جاسکے۔

یہاں ہم قومیتوں کے موضوع اور اس کے پیچ در پیچ مسائل پر بحث کرنے کے بجائے صرف اس ایک نکتے تک اپنی گفتگو کو محدود رکھنا چاہتے ہیں کہ پاکستان بنیادی طور پر ایک کثیر لسانی اور کثیر القومی ملک ہے۔ پاکستانی معاشرے میں کثرت کا یہ پہلو ملک کی کمزوری کا باعث نہیں بلکہ اس کی ترقی و استحکام کا موجب ہے۔ ایک یک رنگ معاشرے کے مقابلے

میں ایک متنوع معاشرہ ترقی کے زیادہ امکانات رکھتا ہے کیونکہ مختلف ثقافتوں کے درمیان تخلیقی روابط معاشرتی ارتقار کے نقطۂ نظر سے انتہائی ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں بھی اپنے یہاں پائے جانے والے تنوعات پر معذرت خواہانہ انداز اختیار کرنے کے بجائے ان پر فخر محسوس کرنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم کثرت میں وحدت کے آفاقی اصول کا اپنے یہاں کس طور پر اطلاق کر سکتے ہیں اور مختلف رنگوں اور خوشبوؤں کے حامل ان پھولوں سے کس طرح ایک ایسا گلدستہ بنا سکتے ہیں جس میں تمام رنگوں اور سب خوشبوؤں کا حسین امتزاج نظر آسکے۔

اصل موضوع سے ذرا انحراف کرتے ہوئے ہم خالصتاً وضاحتی نقطۂ نظر سے ان حلقوں کے اندیشہ ہائے دور و دراز کا ذکر بھی کرنا چاہتے ہیں جو پاکستان کی اس ثقافتی کثرت کے اعتراف میں صرف اس لئے فراخ دلی کا مظاہرہ نہیں کر پاتے کہ مبادا یہ ملک کی تقسیم در تقسیم کا موجب ثابت ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرزِ فکر کے پیچھے پاکستان سے محبت کا بے پایاں جذبہ موجود ہو مگر اس طرزِ فکر کے حامل حلقے جس حقیقت کے ادراک میں ناکام رہے ہیں یا جس کا خاطر خواہ فہم وہ بوجوہ ابھی تک حاصل نہیں کر سکے ہیں وہ یہ ہے کہ کسی ملک کا استحکام اس کے مختلف اجزار کے اتحاد و اتفاق ہی کے نتیجے میں ممکن ہے اور اتحاد و اتفاق کسی ایک جز کی نفی کے ذریعے نہیں بلکہ مختلف اجزار کے وجود کے اقرار کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اگر مختلف اجزاء کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کیا جائے گا تو ان کے درمیان اشتراک و تعاون کا سفر کیونکر شروع ہو گا۔ اشتراک و تعاون کا آغاز ہی نہیں ہو گا تو مشترک اقدار کی تلاش اور مشترک مقاصد کے تعین کا عمل شروع نہیں ہو سکے گا۔ اور اگر مشترک مقاصد و اقدار ہی وضع نہیں ہوں گی تو قومی اتحاد اور ملکی استحکام کا کارِ عظیم کیونکر انجام پا سکے گا۔ بعض ذہنوں میں یہ شکوک بھی موجود ہیں کہ اگر قومیتوں کے وجود کو تسلیم کر لیا گیا تو یہ لامحالہ آزادی کا مطالبہ کر بیٹھیں گی۔ اس کا سادا سا جواب یہ ہے کہ کسی قومیت کی نفی اس کو آزادی کی راہ دکھانے کا زیادہ مؤثر ذریعہ ہے۔ کیا مشرقی پاکستان نے ہم سے اپنی قومیت کی سند حاصل کئے بغیر آزادی حاصل نہیں کی۔ اس کے برعکس دنیا میں بیسیوں ممالک ایسے ہیں جہاں از روئے دستور مختلف قومیتوں کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے مگر کوئی بھی قومیت علیحدگی کے بارے میں سوچتی تک نہیں۔ ایک قومیت کی آزادی کا تعلق براہ راست طور

پر اس بات سے۔ ہے کہ کیا ملک کے سیاسی دروبست میں اس کے جملہ حقوق محفوظ ہیں یا نہیں۔ اگر اس کے حقوق غیر محفوظ ہیں اور وہ وفاق کے اندر اپنے آپ کو مرکز سے یا کسی دوسری قومیت کے استحصال کا شکار پاتی ہے، نیز اس کے پاس جدوجہد کے کوئی آئینی ذرائع بھی موجود نہیں ہیں تو لامحالہ وہ آزادی کی طرف بڑھ سکتی ہے لیکن اگر اس کے تشخص کو تحفظ حاصل ہے، وہ اپنے دائرے میں خود مختاری کی حامل ہے اور ملک میں کوئی ادارہ، یا کوئی دوسری قومیت اس کے حقوق کو پامال نہیں کر رہی تو ظاہر ہے کہ وہ علیحدگی کا خواب کیوں دیکھے گی جبکہ آج کی دنیا میں سائنسی ایجادات و اکتشافات کے نتیجے میں انسانی برادریوں میں روابط اور مختلف ملکوں میں تعاون و اشتراک کے انگنت دروازے کھل گئے ہیں۔ عصری مسائل اس قدر تند و تیز واقع ہوئے ہیں کہ دنیا کا کوئی بھی ملک تن تنہا ان کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا چنانچہ ہر ملک، بیرونی ممالک کے وسائل سے استفادہ کا خواہشمند ہے اور اس کے لئے اقوام متحدہ کے علاوہ بیسیوں بین الاقوامی، بین البر اعظمی، کثیر الملکی یا دو فریقی ادارے وجود میں آ چکے ہیں۔ ایسے میں جب کہ ملکوں کا ایک دوسرے پر انحصار اس قدر بڑھ چکا ہے کسی ایک ملک کے اندر موجود وحدتیں اگر بلا وجہ علیحدگی کی خواہاں ہوں گی تو ظاہر ہے یہ دیوانگی ہی قرار پائے گی۔ البتہ اگر ایک وحدت احساسِ محرومی و پامالی کا شکار ہو گی تو اس میں علیحدگی کے رجحان کے جڑ پکڑنے کو ناقابل فہم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

عواملِ وفاقیت کی تیسری نوع میں شامل دس محرکات جن میں نصف کا رخ کردار مرکز پسندی اور نصف کا مرکز گریزی کی طرف ہے حسب ذیل ہیں۔

۴۔ جغرافیائی اتصال:

وحدتوں کے درمیان جغرافیائی قربت اور نزدیکی ان کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنے کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ اس ہم آہنگی کا نتیجہ مواصلات کی صورت میں نکلتا ہے۔ نیز تجارت کے مواقع بڑھ جاتے ہیں اور نقل و حمل اور آمد و رفت نسبتاً آسان ہو جاتی ہے۔

جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ماضی میں مشرقی و مغربی پاکستان کی ایک دوسرے

سے جغرافیائی دوری ان دونوں خطوں کے درمیان سیاسی مغائرت اور اقتصادی عدم توازن کے فروغ کا اہم سبب بنی تھی۔ البتہ موجودہ پاکستان کی جغرافیائی صورتِ حال مختلف ہے۔ ملک کا نقشہ پہلی نظر ہی میں اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ ہماری وحدتیں ایک دوسرے کے ساتھ بہترین شکل میں متصل ہیں۔ یہی جغرافیائی اتصال بین الصوبائی تجارت، مواصلات اور نقلِ آبادی کا بھی اہم وسیلہ ہے۔ پاکستان کی جغرافیائی صورت حال کے دو پہلو بہت قابلِ ذکر ہیں۔ ایک تو یہ کہ ملک کی شمالی، جنوبی اور مغربی سرحدیں بڑی حد تک مستحکم فطری سرحدیں ہیں۔ ملک کے شمال میں ہمالیہ کا سلسلۂ کوہ ہے۔ مغرب میں کوہ ہندوکش اور کوہ سلیمان کی پہاڑیاں ہیں اور جنوب میں بحرۂ ہند ہے۔ اس طرح پاکستان کے کم از کم تین اطراف ایسی طبعی سرحدیں موجود ہیں جو ملک کو ایک جدا حیثیت دے دیتی ہیں۔ البتہ ہندوستان کے ساتھ پاکستان کی سرحدیں جو ملک کے مشرق میں واقع ہیں فطری طور پر متعین شدہ نہیں ہیں بلکہ تقسیم ہند کے وقت سیاسی بنیادوں پر متشکل ہوئی تھیں۔ پاکستانی جغرافیے کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ ملک کا بڑا علاقہ جس میں تقریباً سب ہی صوبے شامل ہیں، بڑی حد تک میدانی علاقہ ہے جس کو دریائے سندھ اور اس کے معاون دریا سیراب کرتے ہیں۔ علم جغرافیہ کے ماہرین کی رائے ہے کہ پہاڑ انسانوں کو تقسیم کرتے ہیں جبکہ دریا اُن کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ دریائے سندھ نے پاکستان کی قدیم تاریخ ہی سے ارتباط کا یہ اہم فریضہ سرانجام دیا ہے۔ پاکستانی جغرافیے کے مذکورہ دونوں پہلوؤں کو ایک ساتھ دیکھا جائے تو یہ تصویر ابھرتی ہے کہ ملک کے کم از کم تین اطراف ایسی مستحکم جغرافیائی سرحدیں موجود ہیں جو اس کے علیحدہ وجود کو نمایاں کرتی ہیں۔ دوسری طرف داخلی طور پر ملک کے بیشتر علاقے ایک دوسرے سے قریبی اتصال رکھتے ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ایک بیت اس تصویر پر صادق آتی ہے یعنی "ایک قلعہ جس کے لاتعداد دروازے اور بیسیوں کھڑکیاں ہیں"۔ مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر اینی میری شمل نے تو اسی بیت سے متاثر ہو کر پاکستان کے بارے میں اپنے ایک سفرنامے کا عنوان ہی "پاکستان: ہزار ہا دروازوں والا قلعہ"[۳۲] رکھا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں سے مراد درہ

۳۲۔ بحوالہ قدرت اللہ فاطمی، 'پاکستانی قومیت' (لاہور، آئینۂ ادب، ۱۹۷۲ء) ص ۲۹

خیبر، درۂ گومل اور درۂ بولان جیسے راستے ہیں جو پاکستان اور وسطی ایشیا و مشرق وسطی کے درمیان آمد و رفت کا ذریعہ بنے رہے ہیں۔

۵۔ وحدتوں کے مختلف و متفرق جغرافیائی کوائف:

جس طرح جغرافیہ کا عامل ایک وفاق کے متشکل ہونے میں معاون ثابت ہوتا ہے اور باہم متصل وحدتیں وفاق کے قیام کے لئے سود مند ثابت ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان وحدتوں کا اپنا اپنا جغرافیائی محلِ وقوع بعض ایسے تنوعات کو جنم دیتا اور ایسے مفادات کی تخم ریزی کر دیتا ہے جو وحدتوں کو ایک دوسرے میں ضم ہونے اور اپنے علیحدہ تشخص کو نظر انداز کر دینے سے باز رکھتے ہیں۔ بعض صورتوں میں وحدتوں کی جغرافیائی حدود فطری طبعی حالات ہی سے متعین ہوتی ہیں۔ مثلاً سوئٹزر لینڈ میں وسیع سلسلہ ہائے کوہ نے وحدتوں کے درمیان فطری حدود قائم کر دی ہیں۔ ویسٹ انڈیز کی وحدتوں کی حد بندی سمندری "سرحدوں" کے ذریعے ہوئی ہے۔ امریکہ میں اکثر وحدتوں کے درمیان حد بندی کا کام دریاؤں نے سر انجام دے رکھا ہے۔ ان فطری طبعی سرحدوں کے نتیجے میں وحدتیں ایک دوسرے سے جدا دائروں میں قائم ہیں اور یوں جغرافیائی عامل نے ان کے جداگانہ تشخص کو تقویت پہنچائی ہے۔

گو کہ پاکستان میں اندرونی طور پر مختلف خطے اور علاقے ایک دوسرے سے متصل ہیں لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ان علاقوں میں جداگانہ اور ایک دوسرے سے مختلف جغرافیائی خصوصیات ہی ناپید ہیں۔ ماضی میں ہمارے یہاں بعض سیاسی مقاصد کے پیش نظر ملک کے جغرافیائی حقائق کو اس پیرائے میں بیان کیا جاتا رہا ہے کہ مختلف خطوں کے درمیان ارتباط و اتصال کے پہلو کو تو نمایاں کیا گیا بلکہ اس پر اس سے زیادہ زورِ بیان صرف ہوا جتنا کہ اس کا حق تھا لیکن ملک میں پائے جانے والے متفرق جغرافیائی حقائق سے چشم پوشی کی گئی۔ بالخصوص ون یونٹ کے قیام کو جائز ثابت کرنے کے لئے ہمارے صاحبانِ اقتدار اور ان کے ہمنوا دانشوروں نے جغرافیائی حقائق کے اعتراف میں یکطرفہ پن کا مظاہرہ کیا۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ پاکستان میں شامل علاقے باہم متصل ہونے کے باوجود متفرق

جغرافیائی خصوصیات بھی رکھتے ہیں۔ جغرافیہ کے ماہرین پاکستان میں چھ طبعی خطوں کو شناخت کرتے ہیں[34] یہ چھ خطے مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ شمالی سلسلہ ہائے کوہ

۲۔ مغربی سلسلہ ہائے کوہ

۳۔ خطہ ہائے نمک اور سطح مرتفع پوٹھوہار

۴۔ دریائے سندھ کا بالائی میدانی خطہ

۵۔ دریائے سندھ کا زیریں میدانی خطہ

۶۔ سطح مرتفع بلوچستان۔

پاکستان کے مختلف قدرتی جغرافیائی خطوں کی اس تقسیم کا موازنہ اگر ملک کے موجودہ صوبوں کے ساتھ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بڑی حد تک ان میں مطابقت پائی جاتی ہے۔ شمالی سلسلہ ہائے کوہ جن میں کوہ ہمالیہ سب سے اہم ہے پاکستان کے انتہائی شمالی علاقوں، کشمیر اور گلگت پر پھیلا ہوا ہے۔ پہاڑوں کا یہ سلسلہ پاکستان کو وسطی ایشیا سے جدا کرتا ہے۔ ان پہاڑوں اور ان کی وادیوں پر مشتمل خاصا بڑا علاقہ کشمیر اور صوبہ سرحد میں شامل ہے۔ مغربی سلسلہ ہائے کوہ کا علاقہ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں منقسم ہے۔ خطہ ہائے نمک اور پوٹھوہار کے علاقے پنجاب میں آتے ہیں۔ دریائے سندھ کا بالائی میدانی علاقہ بیشتر پنجاب میں اور زیریں علاقہ صوبہ سندھ میں شامل ہے۔ سطح مرتفع بلوچستان کا پورا علاقہ صوبہ بلوچستان کو محیط ہے۔ مذکورہ بالا جغرافیائی خطوں کی اپنی جداگانہ طبعی، ماحولیاتی اور موسمی خصوصیات ہیں اور انہی کے زیر اثر ہمارے مختلف صوبے بڑی حد تک ایک دوسرے سے مختلف اجناس پیدا کرتے ہیں۔ طبعی خصوصیات کا یہی تنوع ان صوبوں کی ثقافتوں کو بھی مختلف انداز میں متشکل کرنے کا ایک اہم عامل ہے۔

---

34. Kazi S. Ahmad, A Geography of Pakistan, (Karachi: Oxford University Press, 1964), pp. 13-25.

۶۔ ماضی میں وحدتوں میں تعلقات کی موجودگی اور مشترک سیاسی اقدار:

قیام وفاق سے قبل اس میں شامل وحدتیں اگر ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہیں تھیں اور ان میں کسی نہ کسی شکل میں تعلقات موجود تھے تو یہ حقیقت بھی تشکیل و تعمیر وفاق میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر امریکی وفاق میں شامل وحدتیں قیام وفاق سے قبل ایک کنفیڈرل نظام میں یکجا تھیں۔ اور یوں ان میں ربط و تعلق کا رشتہ کسی نہ کسی درجے میں پہلے سے موجود تھا۔ اس کی دوسری مثال وہ وفاقی مملکتیں ہیں جن میں شامل وحدتیں ماضی میں کسی مشترک سلطنت یا نوآبادیاتی نظام کے زیر تسلط تھیں اور انہوں نے نوآبادیاتی نظام سے گلو خلاصی کی جدوجہد میں بھی ایک دوسرے سے اشتراک کیا تھا۔ آزادی کے حصول پر انہوں نے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر وفاق قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ کینیڈا اور آسٹریلیا کے وفاق اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان دونوں وفاقوں میں شامل وحدتیں ماضی میں سلطنت برطانیہ کے نوآبادیاتی نظام کا حصہ رہی تھیں۔

پاکستان میں شامل وحدتوں کے باہمی روابط کی تاریخ ازمنۂ قدیم سے شروع ہوتی ہے۔ ربط و تعلق کا یہ رشتہ کبھی مضبوط، کبھی کمزور اور کبھی منقطع بھی ہوتا رہا ہے۔ یہ روابط ان ادوار میں زیادہ استوار ہوئے جب موجودہ پاکستان کے خطے امن و امان کے گہوارے تھے۔ یہی روابط جب زیادہ مستحکم ہوئے تو سیاسی اشتراک کی صورتیں بھی نمایاں ہوتی چلی گئیں۔ البتہ جدید تاریخ میں ان خطوں کو سیاسی اتحاد میں یکجا کرنے کا فریضہ پہلے پہل ایک ایسی قوت کے ہاتھوں سر انجام پایا جس کے اپنے مقاصد استعماری تھے۔ ہمارا اشارہ برطانوی نوآبادیاتی نظام کی طرف ہے جس نے ان خطوں کو وقتاً فوقتاً فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ لیکن اس اقدام کے ردعمل میں ایک مثبت عمل جو شروع ہوا وہ یہ تھا کہ انگریز کے خلاف تحریک آزادی میں ان خطوں کی لیڈر شپ کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملا اور انہوں نے مشترکہ جدوجہد کی مختلف النوع راہیں اختیار کیں۔ اسی جدوجہد کی ایک جہت خود مسلم لیگ کی تحریک تھی جس میں پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کی بعض قابل ذکر شخصیات یکجا تھیں۔ مسلم لیگ کی تحریک سے اصولی

اختلاف رکھنے والی مختلف صوبائی قیادتیں بھی ایک دوسرے سے لاتعلق نہیں تھیں اور ان کے درمیان بھی ربط و اشتراک کے واضح شواہد موجود ہیں۔ یہ انہی روابط کا نتیجہ تھا کہ جب قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کی مرکزیت پسندانہ حکمت عملی کی مزاحمت کا مرحلہ درپیش تھا تو مختلف صوبوں کی سیاسی قیادتوں کے درمیان اتحاد و اشتراک کے فیصلے میں دیر نہیں لگی۔ بسنہ ۱۹۵۷ء میں نیشنل عوامی پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو اس میں خان عبدالغفار خان، جی۔ ایم۔ سید، حیدر بخش جتوئی، عبدالصمد اچکزئی، غوث بخش بزنجو جیسے سیاسی رہنما یکجا تھے جو اپنے اپنے صوبے میں اہم سیاسی حیثیت کے مالک تھے۔

۷۔ ماضی کی غیر مشترک اور جداگانہ سیاسی اقدار:

جس طرح ماضی کی مشترک اقدار (مثلاً ایک ہی مقتدر طاقت کے زیر اثر رہنے کا تجربہ) وحدتوں کو تشکیل وفاق کے وقت ایک دوسرے کے قریب لانے کا موجب بنتی ہیں اسی طرح ماضی کی غیر مشترک اور جداگانہ اقدار (مثلاً ایک ہی مقتدر کے زیر اثر ہونے کے باوجود داخلی سطح پر سیاسی نظام میں موجود انفرادیت کے پہلو) وفاق کی تشکیل کے باوجود وحدتوں کو اپنی خود مختارانہ اور سیاسی انفرادیت کے تسلسل کا خواہشمند بناتی ہیں۔

اگرچہ پاکستانی وحدتیں ماضی میں ایک دوسرے کے ساتھ مختلف دائروں میں تعاون و اشتراک اور ہم آہنگی کی روایت رکھتی ہیں تاہم ماضی ہی میں یہ جداگانہ سیاسی تشخص کی بھی حامل رہی ہیں۔ عہد وسطیٰ میں بھی سندھ، پنجاب، بلوچستان اور صوبہ سرحد میں علاقائی خود مختاری کے رجحانات پختہ رہے ہیں۔ انگریز کی آمد پر بھی ان علاقوں نے اپنے اپنے طور پر نئے استعمار کی حتی المقدور مزاحمت کی ہر چند اس میں انہیں کامیابی نہیں ہو سکی۔ خود انگریز نے بھی ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد مقامی احساسات خود مختاری کو بلاوجہ چھیڑنے سے احتراز کی پالیسی اختیار کی اور بعض شرائط کے ساتھ ان علاقوں کو کم از کم اتنی خود مختاری ضرور فراہم کر دی جو یہاں کی معتدبہ سیاسی قیادت کو بغاوت پر اکسانے سے باز رکھنے کے لئے ضروری تھی۔ اس کے باوجود سلطنت برطانیہ کو وقتاً فوقتاً علاقائی خود مختاری کی تند و تیز لہروں کا سامنا کرنا پڑا۔

۸۔ مشترک اقتصادی مفادات:

وحدتوں میں قیامِ وفاق سے قبل یہ احساس کہ وفاق میں شامل ہو کر وہ ایسے اقتصادی فوائد حاصل کر سکتی ہیں۔ جو انہیں علیحدہ رہ کر حاصل نہیں ہو سکتے انہیں وفاق میں شامل ہونے پر آمادہ کرتا ہے۔ چنانچہ قیامِ وفاق کے نتیجے میں وحدتوں کے اشتراک سے ایک مربوط معیشت کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے۔ اس معیشت کی کامیابی یہ ٹھہرتی ہے کہ اس میں فائدہ سب وحدتوں کا ہوتا ہے اور نقصان کسی وحدت کو نہیں پہنچتا۔

جہاں تک پاکستان میں وفاقیت کے اقتصادی محرک کا تعلق ہے یہ بات اپنی جگہ مسلمہ حیثیت رکھتی ہے کہ تحریک پاکستان کے دوران مجوزہ مملکت میں وفاقی نظام کے حوالے سے سیاسی و اقتصادی امکانات کے بارے میں کوئی قابل ذکر تحقیقی مطالعے نہیں کئے گئے تھے۔ پوری تحریک پاکستان اس قدر تیز رفتار اور پُر زور رہی اور آئے دن نت نئے امور کچھ اس طرح سر اٹھاتے رہے کہ مسلم لیگی قیادت مستقبل کے سیاسی و اقتصادی نظام کے حوالے سے یکسوئی کے ساتھ نہ مسلمانوں کو کچھ باور کرانے کی پوزیشن میں تھی اور نہ ہی شاید خود اس کو اس باب میں کوئی قابلِ ذکر شرحِ صدر حاصل تھا۔ تقسیم ہند اور مسلمانوں کے لئے علیحدہ ملک کے مطالبے کے پیچھے تو اقتصادی عوامل کا تذکرہ کئی مصنفوں نے کیا ہے اور متحدہ ہندوستان میں مسلمان سرمایہ دار اور ہندو سرمایہ دار کی مسابقت اور اوّل الذکر کی کمزور پوزیشن کو ایک آزاد مملکت کا پیش خیمہ قرار دیا ہے مگر خود اس مملکت میں مختلف وحدتوں کے لئے کیا اقتصادی امکانات پوشیدہ تھے یہ پہلو اس وقت زیادہ اجاگر نہیں تھا اور نہ ہی اس کے بارے میں زیادہ تحقیق ہوئی ہے۔ تاہم مسلم اکثریت کے صوبوں کی پاکستان میں شمولیت پر آمادگی سے یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان صوبوں کو پاکستان میں شمولیت کے نتیجے میں کم از کم کسی خسارے کا اندیشہ نہیں تھا کم و بیش ان سب صوبوں نے متحدہ ہندوستان کے دنوں میں اپنی اقتصادی خود مختاری کے لئے ہمیشہ ہی جدوجہد کی تھی۔ اور ان کو اس جدوجہد میں یکسر ناکامی کا بھی سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ چنانچہ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کو اسی صوبائی خود مختاری کے رجحان کے پس منظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ سندھ اور باقی صوبے بھی پاکستان میں شمولیت کے وقت یہ اندیشہ نہیں رکھتے ہوں گے کہ ان کی حاصل شدہ خود مختاری بھی داؤ پر لگ جائے گی۔ انہیں اس امر کا یقین رہا ہوگا کہ قیام پاکستان کے بعد وہ صوبائی خود مختاری کے تحفظ کا زیادہ بہتر ماحول پائیں گے۔

صوبوں کے علاوہ وفاق پاکستان میں جن ریاستوں نے شمولیت اختیار کی ان کے پیش نظر من جملہ دیگر چیزوں کے اپنے اقتصادی مفادات کے تحفظ کا احساس بھی شامل تھا۔ چنانچہ آر۔ ایل۔ واٹس اپنی تصنیف "نئے وفاق: دولت مشترکہ میں ہونے والے تجربات" (New Federations: Experiments in the Commonwealth) میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان اور مغربی پاکستان کے خطوں کے اندر تجارتی، صنعتی اور مالیاتی روابط جو پہلے ہی سے موجود تھے اتحاد کی قوت ثابت ہوئے اور یہی عوامل برِ صغیر کی ریاستوں کی ان دو آزاد مملکتوں میں بسرعت شمولیت کا ایک اہم سبب بنے۔"[35]

تشکیل پاکستان سے قبل، اس وفاق میں شمولیت کے نتیجے میں حاصل ہونے والی متوقع اقتصادی منفعت کے حوالے سے صوبوں میں اگر کوئی واضح ادراک موجود نہیں بھی تھا تب بھی قیام پاکستان کے بعد وفاقی نظام کے جواز کے طور پر اس اقتصادی محرک کی اہمیت کم نہیں ہوتی چنانچہ یہ دیکھنا بے فائدہ نہ ہوگا کہ وفاقی نظام سے ہمارے صوبوں کو کیا فوائد حاصل ہو سکتے تھے یا ہو سکتے ہیں۔

پاکستان میں وفاقی نظام کے حق میں جو سب سے بڑی اقتصادی دلیل دی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ طبعی ماحول میں پائے جانے والے فرق کے نتیجے میں ان صوبوں کی پیداوار ایک دوسرے سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ بلوچستان تو بنیادی طور پر معدنیات کا صوبہ ہے۔ باقی تین صوبوں میں جہاں زراعت کے لئے حالات زیادہ سازگار ہیں، پیدا ہونے والی اجناس بالعموم ایک دوسرے سے مختلف ہیں، صنعتی ڈھانچہ بھی زیادہ تر سندھ اور پنجاب کے چند اضلاع میں مرتکز ہے (یہ بات اپنی جگہ اصلاح طلب ہے) اندریں حالات کوئی صوبہ اپنی جملہ ضروریات

---

35. R.L. Watts, New Federations: Experiments in the Commonwealth, (Oxford: Oxford University Press, 1966), p. 50

اپنے ذرائع سے پوری کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اور دوسرے صوبوں پر انحصار اس کے لئے ناگزیر ہے۔

پاکستان کے مختلف خطوں میں ہونے والی زرعی، معدنی اور صنعتی پیداوار کا ایک اجمالی خاکہ ہی مذکورہ بالا انحصار باہمی کی ناگزیریت کو واضح کر دیتا ہے۔

پاکستان کی مختلف زرعی اجناس کی صورت حال یہ ہے کہ چاول جو ہمارے تمام صوبوں میں انسانی غذا کا اہم حصہ ہے بنیادی طور پر پنجاب کے شیخوپورہ اور گوجرانوالہ ضلعوں اور سندھ کے بعض ایسے علاقوں میں پیدا ہوتا ہے جہاں دریائی پانی وافر مقدار میں مل جاتا ہے۔ صوبہ سرحد چاول کی بہت قلیل پیداوار کا حامل ہے جبکہ بلوچستان میں اس کی پیداوار نہیں ہوتی۔ گندم پاکستان میں غذا کا سب سے بڑا جزو ہے۔ گندم کی فصلوں کا دو تہائی حصہ ان علاقوں میں پیدا ہوتا ہے۔ جہاں کاشتکاری کا دارومدار آبپاشی پر ہے۔ پوٹھوہار اور پشاور کے علاقوں میں پیدا ہونے والی گندم کا زیادہ تر انحصار بارشوں کے اوپر ہے۔ پنجاب اور سندھ میں گندم کی اچھی فصلیں ہوتی ہیں جبکہ بلوچستان کے طبعی حالات اس فصل کے لئے زیادہ موزوں نہیں ہیں۔ گنا بھی زیادہ تر آبپاشی کے سہولت یافتہ علاقوں میں پیدا ہوتا ہے اور ملتان اور پشاور گنے کی پیداوار کے لئے اہمیت رکھتے ہیں۔ کپاس کی پیداوار پنجاب اور سندھ تک محدود ہے۔ پھل گو کہ تمام صوبوں میں پیدا ہوتے ہیں مگر مختلف صوبے مختلف پھلوں کے لئے مشہور ہیں۔ چنانچہ آم پنجاب (ملتان) میں آڑو، آلوچہ، سیب، بادام، خوبانی اور ناشپاتی وغیرہ صوبہ سرحد (پشاور، مردان، ہزارہ) اور بلوچستان (کوئٹہ) میں اور نارنجی اور مالٹے پنجاب اور سندھ میں وافر مقدار میں پیدا ہوتے ہیں۔ مچھلی جو ہماری روزمرہ کی غذا میں شامل ہے زیادہ تر سندھ اور مکران کے سمندری ساحلی علاقوں سے حاصل ہوتی ہے۔ سندھ میں کلمری، ہالیجی اور منچھر کی جھیلیں بھی مچھلی کا اہم ذریعہ ہیں۔ جہاں تک معدنی ذخائر کا تعلق ہے ان کی صورت حال بھی یہی ہے اور یہ چند مخصوص علاقوں تک محدود ہیں۔ کوئلہ زیادہ تر ڈنڈوٹ، مکھڈوال، ہرنائی اور مچھ میں پایا جاتا ہے۔ تیل یا پٹرولیم کی پیداوار عموماً اٹک، جہلم، ڈیرہ غازی خاں اور بلوچستان کے چند علاقوں میں ہوتی ہے۔ قدرتی گیس سوئی (ضلع سبی، بلوچستان) میں پائی جاتی ہے۔ لوہا،

کالاباغ (ضلع میانوالی، پنجاب) چترال (سرحد) چاغی (بلوچستان) کے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ نمک کی کانیں کھیوڑہ (ضلع جہلم، پنجاب) اور کالا باغ میں پائی جاتی ہیں۔ ملک کے صنعتی علاقے سندھ (کراچی حیدر آباد)، پنجاب (لاہور، شیخوپورہ، فیصل آباد، ملتان، سیالکوٹ) اور صوبہ سرحد (پشاور، نوشہرہ) میں واقع ہیں۔

یہ خاکہ بڑی حد تک عمومی سا ہے مگر اس سے یہ بات ضرور سامنے آجاتی ہے کہ ہمارے صوبے اپنی ضروریات کی ساری چیزیں خود اپنے صوبے کے وسائل سے پوری نہیں کر سکتے اور انہیں لامحالہ دوسرے صوبوں سے ان کی تکمیل کرنی پڑتی ہے۔ ایک دوسرے پر انحصار کی یہی کیفیت ان کے درمیان ایک مثبت وفاقی رشتے کا اقتصادی جواز فراہم کرتی ہے۔ اسی نکتے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ ہر صوبہ دوسرے صوبے کو اپنی اشیائے پیداوار فراہم کرتا ہو سب صوبے دوسرے صوبوں کے لئے مناسب منڈی فراہم کرتے ہیں۔ یہ صورت بین الصوبائی تجارت کے فروغ کا ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔ متفرق پیداواری صلاحیت کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے مختلف صوبوں کے درمیان مسابقت سے زیادہ تعاون کا عمل جاری ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک ہی طرح کی پیداوار کے حامل صوبے اپنی پیداوار کے لئے منڈیوں کی تلاش کرتے وقت مقابلے کے عمل سے دوچار ہوتے ہیں جبکہ مختلف النوع پیداوار ان کو اس مقابلہ سے محفوظ رکھتی ہیں۔

متفرق پیداواری صلاحیت کے علاوہ وفاقی نظام کا ایک اور اقتصادی جواز وہ مواصلاتی روابط ہیں جو مختلف وحدتوں کے درمیان پائے جاتے ہیں اور جن کی مزید ترقی و توسیع کی گنجائش موجود ہے۔ دریائے سندھ تو ماضی قدیم ہی سے موجودہ پنجاب کے انتہائی شمال سے بحرۂ ہند تک کے علاقوں کے درمیان تجارت کا ایک بنیادی ذریعہ رہا ہے۔ دریائے سندھ کے علاوہ ہمارے یہاں سڑکوں کا بھی ایک اچھا خاصا جال پورے ملک میں پھیل چکا ہے اور یہ بین الصوبائی تجارت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔

۹۔ متفرق اقتصادی مفادات:

ایک وفاق میں شامل وحدتیں مشترک مفادات کے علاوہ اپنے علیحدہ اور دوسری وحدتوں سے مختلف اقتصادی مفادات کی بھی حامل ہوتی ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وفاق کی تشکیل کے بعد وہ مشترک اقتصادی اہداف کے حصول کے ساتھ ساتھ اپنے جداگانہ اقتصادی مفادات کی بھی تکمیل جاری رکھیں۔ مرکز کی جانب سے اگر ان مفادات پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی جاتی ہے تو وحدتیں اس عمل کی مزاحمت کرتی ہیں۔

ایک وفاقی مملکت میں وحدتوں کے مشترک اقتصادی مفادات جس قدر اہم کردار ادا کرتے ہیں، اتنے ہی اہم کردار کے حامل وحدتوں کے متفرق اقتصادی مفادات بھی ہوتے ہیں۔ کسی وفاقی نظام میں ایک وحدت سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنی حدود میں پائے جانے والے اقتصادی امکانات سے دستبردار ہو جائے۔ پاکستان کے معاملے میں بھی وحدتوں کے اپنے اقتصادی مفادات بآسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے اہم پہلو تو وحدتوں کی اپنے وسائل پر تصرف کی فطری خواہش ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک ملک کی کم و بیش سب وحدتوں نے ہر اس اقدام کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے جس کا مقصد انہیں ان کے اندرونی وسائل سے محروم کرنا یا ان وسائل سے حسب منشا استفادہ کرنے سے روکنا تھا۔ سابقہ مشرقی پاکستان کی توشکایات کا خلاصہ ہی یہ تھا کہ اس کے جملہ وسائل پیداوار مبینہ طور پر مغربی پاکستان کی خوشحالی کے لئے مختص کر دیئے گئے تھے۔ موجودہ پاکستان میں بھی چھوٹے صوبے یا وحدتیں عموماً اسی قسم کی شکایت رکھتی ہیں اور شاید ہی کوئی فہمیدہ شخص اس حقیقت سے انکار کر سکے کہ ہمارے بیشتر چھوٹے صوبوں کے وسائل تمام تر ان کے اپنے باشندوں کے زیر استعمال نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر قدرتی گیس کے ذخائر بلوچستان میں سوئی (ضلع سبی) کے مقام پر ۱۹۵۲ء میں دریافت ہوئے تھے مگر ان ذخائر سے استفادے کے معاملے میں بلوچستان ہی سب سے پیچھے ہے۔ سوئی گیس ابتدا ہی میں تقریباً ۳۵۰ میل کی پائپ لائن کے ذریعے ملتان پہنچائی گئی جہاں یہ کھاد کے کارخانے میں استعمال ہوئی۔ پنجاب ہی میں یہ گیس برسوں سے فیصل آباد،

چنیوٹ، شیخوپورہ، جہلم، راولپنڈی، واہ اور دوسرے شہروں میں نہ صرف کارخانوں میں استعمال ہو رہی ہے بلکہ گھروں میں بھی اس کا وافر استعمال ہو رہا ہے۔ کراچی جو ملک کا سب سے بڑا صنعتی مرکز ہے اپنے کارخانوں اور گھروں میں سوئی گیس استعمال کر رہا ہے۔ کراچی تک گیس پہنچانے کے لئے ساڑھے تین سو میل طویل پائپ لائن کئی سال قبل بچھائی جا چکی ہے۔ مگر بلوچستان میں سوئی گیس کا استعمال بہت کم ہوا ہے اور وہ بھی بہت عرصے بعد۔ بلوچستان کو بجا طور پر یہ شکایت ہے کہ اس کی دولت دوسرے صوبوں کی ترقی اور ان کی آبادیوں کی خوشحالی کے لئے استعمال کی جا رہی ہے۔ جو شکایت بلوچستان کو سوئی گیس کے بارے میں ہے وہی سندھ کو اپنی زرعی زمین کے بارے میں بھی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت سندھ کی کل زیر کاشت زمین کے چالیس فیصد سے زیادہ کے حقوق ملکیت غیر سندھیوں کے پاس ہیں۔ سندھ کی ایک اور شکایت ملک کے مالیات کے نظام کے بارے میں ہے جو غیر معمولی طور پر مرکزیت پسندی کے رجحان کی عکاسی کرتا ہے۔ سندھ ملک کے مجموعی مالیات کا ساٹھ فیصد حصہ فراہم کرتا ہے جبکہ وفاقی حکومت اس کو مالیاتی فنڈز آبادی کی بنیاد پر فراہم کرتی ہے۔ اس قسم کی اور کئی مثالیں درج کی جا سکتی ہیں جو ہماری چھوٹی وحدتوں کے اس احساسِ زیاں کا جواز فراہم کرتی ہیں جن کا اظہار سیاسی تحریکوں اور علاقائی ادب میں بافراط ہو رہا ہے۔

۱۰۔ سماجی و سیاسی اداروں کی یکسانیت :

مختلف وحدتوں کے اندر موجود سماجی اور بالخصوص سیاسی اداروں میں کسی نہ کسی درجے میں یکسانیت یا مماثلت کی موجودگی تشکیل و تسلسلِ مرکز کا موجب بنتی ہے۔ مثلاً اگر مرکز اور کسی وحدت میں یا ایک وحدت اور دوسری وحدت میں ایک ہی طرزِ حکومت قائم ہو تو یہ وفاقیت کے نقطۂ نظر سے زیادہ مثبت نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ لیکن بالفرض مرکز اور وحدت میں یا پھر دو مختلف وحدتوں میں مختلف طرز ہائے حکومت اور مختلف النوع سیاسی ادارے قائم ہوں تو وفاق کی کارکردگی میں رکاوٹ پیدا ہونے کا احتمال ہر وقت موجود رہتا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۲ء میں پاکستان میں پیپلز پارٹی اور نیپ اور جمعیت علمائے اسلام کے درمیان طے پانے والے معاہدے کے نتیجے

میں جب صوبہ سرحد اور بلوچستان میں نمائندہ حکومتیں قائم ہوئیں تو صوبوں اور مرکز میں دو مختلف طرز ہائے حکومت قائم تھے۔ مرکز میں صدارتی نظام حکومت قائم تھا اور بھٹو ملک کے صدر تھے۔ (۱۹۷۳ء میں دستور کی منظوری کے بعد مرکز میں پارلیمانی نظام قائم ہوا) جبکہ صوبائی سطح پر پارلیمانی طرزِ حکومت کو اختیار کیا گیا تھا۔ مذکورہ زمانے میں جو سیاسی بحران مرکز اور صوبہ سرحد اور بلوچستان کے حوالے سے وجود میں آیا اس کا ایک اہم سبب طرز ہائے حکومت کا یہ تضاد بھی تھا۔

سیاسی اداروں کی یکسانیت کے ضمن میں ایک کارآمد مثال سیاسی جماعتوں کی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر ایک وفاق میں ایسی سیاسی جماعتیں موجود ہوں جو سب وحدتوں میں یا بیشتر وحدتوں میں اپنا مؤثر وجود رکھتی ہوں تو یہ عنصر وفاق کی بقا اور تسلسل کے نقطۂ نظر سے بڑا مثبت کردار ادا کر سکتا ہے۔ ہندوستان میں یہ کردار کانگریس نے ادا کیا ہے۔ امریکہ میں بھی دونوں بڑی سیاسی جماعتیں تقریباً تمام ہی وحدتوں میں مضبوط بنیادوں کی حامل ہیں۔ البتہ پاکستان میں سیاسی عمل کے عدم تسلسل کے نتیجے میں ملک گیر سیاسی جماعتیں یا تو وجود میں نہیں آسکیں یا اگر وجود میں آئیں تو دیگر عوامل کی بنا پر انہیں وہ کردار ادا کرنے کی مناسب مہلت یا مواقع میسر نہیں آسکے جو مختلف وحدتوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کا ذریعہ بنتے۔

۱۱۔ متفرق سماجی و سیاسی ادارے:

بعض اوقات مختلف وحدتیں مختلف النوع سیاسی و سماجی روایات اور اداروں کی حامل ہوتی ہیں۔ ایسی وحدتوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی ان روایات اور اداروں سے تشکیلِ وفاق کے بعد بھی وابستہ رہیں۔ مثلاً کینیڈا میں کیوبک کی تحریکِ خود مختاری کا ایک اہم مدعا یہ بھی رہا ہے کہ اس صوبے کے مخصوص ضابطۂ فوجداری کو جاری رکھا جائے۔ اسی طرح امریکہ میں شمالی اور جنوبی ریاستوں میں انیسویں صدی میں جو ایک مستقل نزاع کی کیفیت رہی اس کا ایک اہم سبب جنوب کی ریاستوں کا اپنے یہاں نظامِ غلامی کو جاری رکھنے پر اصرار تھا۔ وفاقی نظاموں میں متفرق سیاسی اداروں کے ضمن میں ایسی سیاسی جماعتوں کی بھی مثال دی جا سکتی ہے جن کا حلقۂ اثر ملک گیر نہیں بلکہ کسی ایک یا چند وحدتوں تک محدود ہوتا ہے

ایسی سیاسی جماعتوں کے ہدف مختلف ہو سکتے ہیں۔ ان کا ایک ہدف تو یہ ہو سکتا ہے کہ اپنی وحدت کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دلوائیں اور اس کے جداگانہ تشخص کی حفاظت کا انتظام کریں۔ دوسرا ہدف وحدت کے حقوق کو ایک ایسے نعرے کے طور پر استعمال کرنا ہے جس کا مقصد مرکز پر دباؤ ڈالنا اور اس سے اپنے لئے مراعات حاصل کرنا ہے۔ مؤخر الذکر ہدف کے لئے کام کرنے والی جماعتیں مرکز میں شریکِ اقتدار ہونے کی خاطر وحدت کے حقوق اور خود مختاری پر زور دیتی ہیں۔ جب انہیں مرکزی اقتدار میں شرکت کا موقع میسّر آتا ہے تو وہ بآسانی خود مختاری کے موقف سے رجوع کر لیتی ہیں۔ البتہ محروم اقتدار ہونے پر ایک مرتبہ پھر زور و شور سے اپنے پچھلے نعروں پر لوٹ آتی ہیں۔ اس قسم کی موقع پرست جماعتوں کے علی الرغم وہ جماعتیں زیادہ بامعنی کردار کی حامل ہوتی ہیں جو وحدت کے حقوق کے ضمن میں اصولی موقف اور کردار کی حامل ہوں۔

پاکستان میں شامل وحدتیں سماجی ارتقاء کے مختلف مدارج میں ہیں۔ چنانچہ یہاں سماجی اداروں میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل یہ وحدتیں برطانوی نوآبادیاتی نظام کا حصہ تھیں اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ان وحدتوں کے حوالے سے برطانوی پالیسی یکساں نہیں تھی۔ جب انگریز نے ہندوستان میں نمائندہ اداروں کی مرحلہ وار حکمت عملی کا آغاز کیا تب بھی مختلف علاقوں میں اس کا اطلاق مختلف مواقع پر کیا گیا۔ چنانچہ پاکستان میں شامل ہونے والی وحدتیں آزادی کے وقت بھی خود مختاری کے مختلف مدارج میں تھیں۔ بلوچستان کو آزادی کے بعد بھی علیحدہ صوبے کا درجہ نہیں دیا گیا اور اس کے لئے اسے تقریباً تیئس سال انتظار کرنا پڑا۔ اس صورتحال کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستانی وحدتوں کے سیاسی ادارے خود مختاری کے حوالے سے مختلف سطحوں پر قائم ہوئے۔ نتیجتاً ان وحدتوں میں کام کرنے والی سیاسی جماعتوں کے اہداف بھی اسی پس منظر میں متعین ہوئے۔ چنانچہ بلوچستان کی حد تک سیاسی جماعتوں کا ایک بنیادی مؤقف تو خود اس خطے کو ایک صوبے کا درجہ دلوانا تھا۔ پھر ون یونٹ کے قیام کے بعد سندھ، صوبہ سرحد اور بلوچستان کی سیاسی قیادتوں کے ایک قابلِ ذکر حصّے کا ہدف ون یونٹ کی تنسیخ رہا۔ اس لحاظ سے ان علاقوں کی سیاسی جماعتوں اور دیگر سیاسی جماعتوں میں ایک بڑا فرق اسی حوالے سے مرتب ہوا۔

اس وقت بھی صورتحال یہ ہے کہ ملک کے تین چھوٹے صوبوں کی سیاسی جماعتیں ملکی

سیاسی نظام میں اپنے صوبوں کو میسر خود مختاری کے مدارج سے بالعموم غیر مطمئن ہیں اور ان کی جدوجہد کے مقاصد میں زیادہ خود مختاری کا موضوع سرفہرست ہے۔ بعض دیگر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی ایسی علاقائی سیاسی جماعتیں موجود ہیں جو خود مختاری کے مسئلے پر زیادہ ثابت قدمی کا مظاہرہ نہیں کر سکی ہیں اور ماضی میں مختلف مواقع پر موقع پرستانہ طرز عمل کا بھی انہوں نے مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن ان وحدتوں میں ایسی سیاسی جماعتوں کی موجودگی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جن کا کردار نسبتاً زیادہ مستقل مزاجی کا آئینہ دار رہا ہے۔

۱۲۔ ملکی سطح کی سیاسی قیادت :

کسی وفاق میں وحدتوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور آمادۂ اشتراک کرنے کے پیچھے جہاں جغرافیائی، تاریخی، سیاسی، سماجی اور اقتصادی عوامل اہم کردار ادا کرتے ہیں وہیں ایسی سیاسی قیادتوں کے کردار کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا جن کا دائرہ اثر کسی ایک وحدت تک محدود نہ ہو بلکہ ملک گیر حیثیت رکھتا ہو۔ وفاقیت کے دیگر عوامل کی موجودگی کے باوجود اس امر کی ضرورت باقی رہتی ہے کہ مدبرانہ صلاحیتوں سے متصف ایسی قیادت بھی بہم ہو جو ان عوامل کی اہمیت کا مناسب شعور رکھتی ہو اور صحیح وقت پر صحیح فیصلہ کرنے کی اہل ہو۔ کے سی۔ وھیئر کا تو یہ بھی خیال ہے کہ امریکہ کے معاملے میں فیصلہ کن کردار سیاسی قیادت ہی نے ادا کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ دیگر عوامل تو بہت پہلے سے موجود تھے مگر وہ زیادہ سے زیادہ صرف اسی حد تک نتیجہ خیز ہو سکے تھے کہ انہوں نے چند ریاستوں کو ایک کنفیڈرل ڈھانچے تک پہنچا دیا تھا۔ کنفیڈریشن سے وفاق تک ان ریاستوں کی رہنمائی سیاسی قیادت ہی نے کی۔ چنانچہ اگر واشنگٹن، ہیملٹن، جان جے، میڈیسن، بنجمن فرینکلن اور جیمس ولسن کی شخصیات موجود نہ ہوتیں تو یہ بیل منڈھے نہ چڑھتی۔ کینیڈا میں یہ کردار جان اے۔ میکڈانلڈ، الیگزینڈر گالٹ اور جارج ایٹین کارٹیئر نے ادا کیا۔

بیسویں صدی دنیا کے مختلف سیاسی معاشروں میں مقبول قیادتوں کے حوالے سے بڑی زرخیز صدی ثابت ہوئی ہے۔ بالخصوص ان ممالک میں جہاں تحریک ہائے آزادی جاری

ہوئیں ایسی قیادتیں بافراط نظر آجاتی ہیں جنہیں عوام میں غیر معمولی قدر و منزلت حاصل تھی۔ ان قائدین نے اپنے اپنے معاشروں میں اتحاد و اشتراک کے باب میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ہندوستان کی آزادی میں کانگریس کی جو لیڈر شپ پیش پیش تھی اس میں گاندھی، نہرو، پٹیل، سبھاش چندر بوس، ابوالکلام آزاد کے نام شامل ہیں۔ ملایا میں تنکو عبدالرحمان اور انڈونیشیا میں عبدالرحیم سوئیکارنو ایسے قائدین پیدا ہوئے۔ تحریک ہائے آزادی کی کامیابی کے بعد جن ممالک نے وفاقی طرز کے ڈھانچے اختیار کیے وہاں انہیں قیادتوں نے تشکیلِ وفاق کے مختلف مراحل بحسن و خوبی طے کرانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ ہندوستان میں وفاقی دستور کی بغیر کسی قابلِ ذکر بحران اور ہنگامہ آرائی کے منظوری کا سہرا بڑی حد تک نہرو کی قیادت کے سر باندھا جاتا ہے۔

سیاسی قیادتوں کے اس اہم عامل کا جائزہ اگر پاکستان کے پس منظر میں لیا جائے تو دو بنیادی باتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ تخلیقِ پاکستان میں فیصلہ کن کردار اسی عامل نے ادا کیا تھا۔ دوسری اہم بات یہ کہ قیامِ پاکستان کے بعد ملک عموماً قیادت کے بحران کا شکار رہا۔ قیامِ پاکستان کے ضمن میں قائدِ اعظم کے کردار سے شاید ہی کوئی شخص انکار کر سکے۔ بلکہ جوں جوں تشکیلِ پاکستان کے واقعے سے زمانی فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے، قائدِ اعظم کا مذکورہ بالا فیصلہ کن کردار مزید اجاگر ہوتا جا رہا ہے۔ حالیہ برسوں میں جو تحقیقات اس موضوع پر ہوئی ہیں ان میں بھی عموماً یہی نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ قائدِ اعظم ہی کی قیادت تھی جس نے ہندوستان کی تقسیم اور مسلم اکثریتی صوبوں پر مشتمل ایک آزاد اور جداگانہ مملکت کے حصول کو ممکن بنایا۔ ڈاکٹر عائشہ جلال کی تصنیف کا ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں جس میں ان کا موقف مذکورہ بیان کے عین مطابق ہے۔ کم و بیش ایسے ہی خیالات کا اظہار اسٹینلے وولپرٹ، اوما کورا، لیری کولنز، ڈومنیک لاپیرے، خالد بن سعید اور بہت سے دوسرے محققین نے کیا ہے۔ مشہورِ زمانہ فلم "گاندھی" میں بھی قائدِ اعظم کے اسی کردار کو مختلف پیرائے میں دکھایا گیا ہے۔

البتہ قیامِ پاکستان کے بعد اور بالخصوص قائدِ اعظم کی رحلت کے بعد ملک ایک سیاسی بیابان کی حیثیت اختیار کر گیا اور جمہوری سیاسی عمل کو شروع ہونے سے پہلے ہی روک دیا گیا۔ ملک کی باگ ڈور افسر شاہی کے ہاتھوں میں چلی گئی جس نے سیاست کو قابلِ

تعزیرہ جرم بنادیا۔ وہ ملک جو سیاسی راستے سے عالم وجود میں آیا تھا، سیاسی عمل سے محروم کردیا گیا۔ تب نہ تو ملک میں کوئی دیرپا سیاسی نظام وجود میں آسکا اور نہ ہی ملک گیر سیاسی قیادتیں ظہور میں آئیں۔ البتہ جب کبھی تھوڑی بہت سیاسی آزادی میسر آئی تو قیادت سازی کا عمل بھی چل نکلا مگر ریاست کی مجموعی ساخت اور کمزور حقیقی جمہوری قیادتوں کی راہ میں مزاحم ہی رہا تا آنکہ انہیں بے دست و پا کر کے رکھ دیا گیا۔

پاکستان میں ایک حقیقی وفاقی نظام کے نقطۂ نظر سے ایسی سیاسی قیادت اور سیاسی لیڈروں کی اہمیت غیر معمولی نوعیت کی حامل ہے جن کی کانسٹی ٹیونسی اخبارات کے دو دو تین تین انچوں کے بیانات تک محدود نہ ہو اور جو صرف اپنے لیٹر پیڈ پر زندہ نہ ہوں بلکہ جن کو ملک کے سب صوبوں میں عوام کی بھرپور تائید کا اعزاز حاصل ہو۔ ایسی قیادتیں صرف سیاسی عمل ہی کے دوران پیدا ہو سکتی ہیں۔ بدقسمتی سے سیاسی عمل سے مسلسل محرومی نے پاکستان میں جہاں صوبوں کے درمیان خلیج کو وسیع کیا ہے وہیں ملک گیر سطح کی قیادتوں کو بھی ابھرنے سے روک کے رکھا ہے۔

۱۴۔ وحدتوں کی ترجمان قیادتیں

سیاسی قیادت کا عنصر مرکزیت گریزی کے ضمن میں بھی قابلِ ذکر اہمیت کا حامل ہے۔ ایک وفاق کے اندر ایسی سیاسی قیادتیں بھی موجود ہو سکتی ہیں جو سیاسی ارتقاء کے مراحل میں مرکز کی ممکنہ قوت پذیری کے آگے ایک بند کا کام کرتی ہیں۔ بظاہر اس قسم کی قیادت ایک خاص وحدت کے مفادات ہی کی ترجمان ہوتی ہے مگر بالواسطہ طور پر اس کا خود ملکی سطح پر مثبت اثر مرتب ہوتا ہے اور وہ یہ کہ وفاقی نظام مرکزیت پسندی کی نذر ہونے سے بچا رہتا ہے۔ مگر وفاق کے استحکام کے لئے وحدت کی سطح کی لیڈرشپ بھی اسی وقت مؤثر ہو سکتی ہے جبکہ ملک میں سیاسی عمل موجود ہو۔ اگر ملک سیاسی عمل ہی سے محروم ہو تو وحدتوں کی قیادتیں بالعموم انتہاپسندی کی جانب بھی مائل ہو سکتی ہیں۔ بالخصوص ان وحدتوں میں جو نسبتاً چھوٹی ہوں۔

ہمارے یہاں ایک اچھے خاصے بڑے حلقے میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ صوبوں کے حقوق

کی بات کرنے والے ملک کے استحکام کو ضعف پہنچانے کا موجب بنتے ہیں مگر یہ سوچ خود جمہوریت کے تقاضوں سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ جمہوریت اصولاً وابستگی و نمائندگی کے مختلف دائروں کو تسلیم کرنے کا نام ہے۔ اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ مثلاً وابستگی کا ایک دائرہ اراکینِ اسمبلی کا حلقۂ انتخاب ہے۔ اسی طرح صوبے وابستگی کا ایک زیادہ بڑا دائرہ فراہم کرتے ہیں۔ وابستگی کا اس سے بڑا دائرہ خود وفاق ہوتا ہے۔ اب جس طرح ایک رکنِ اسمبلی کے اپنے حلقۂ انتخاب کے مفاد میں بات کرنے کو ملک دشمنی نہیں قرار دیا جاتا بلکہ اس کو اس کے فرائضِ منصبی میں شمار کیا جاتا ہے اسی طرح اگر بعض اراکینِ اسمبلی یا سیاسی رہنما اپنے صوبے کے مفادات کی ترجمانی کرتے ہیں تو اس کو بھی ملکی مفاد کے منافی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ یہ دیکھنا لازمی ہے کہ وحدتوں کے حقوق کی بات کرنے والے حضرات وفاق کے دائرے میں رہ کر اپنے مطالبات منوانا چاہتے ہیں یا وفاق کے دائرے کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ یہاں اس امر کا اعادہ غیر ضروری نہیں ہوگا کہ وحدتوں کی قیادتیں وفاق کے دائرے میں بالعموم اسی وقت گفتگو کرنے پر مجبور ہوتی ہیں جب کہ ملک میں سیاسی عمل موجود ہو۔

وفاقی نظام کے تیرہ عوامل کی روشنی میں پاکستان کے حالات کے اس تفصیلی مطالعے سے جو حقائق نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ پاکستان کے وفاق کے قیام میں وفاقی عنصر نے کوئی قابلِ ذکر حصہ نہیں لیا تھا۔

۲۔ پاکستان کی مختلف وحدتوں کا تصورِ عدمِ تحفظ (perception of insecurity) بوجوہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

۳۔ پاکستان کے معاملے میں قومیتوں کے وجود، وحدتوں کے جغرافیائی اتصال، وحدتوں کے مختلف جغرافیائی کوائف، ماضی میں وحدتوں میں اشتراک کے رشتے، ماضی کی غیر مشترک اقدار، اقتصادی مفادات کی یکسانیت و اختلافات، سماجی و سیاسی اداروں کی یکسانیت و اختلافات اور ملکی و صوبائی سطح کی قیادتوں کے عناصر نہ صرف موجود ہیں بلکہ ان میں سے بعض عناصر خاصی بھرپور شکل میں موجود ہیں۔

پاکستان میں حقیقی وفاقی نظام کے

قائم نہ ہونے کی اصل وجہ

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ ثابت کرنا مشکل نہیں ہے کہ پاکستان میں وفاقی نظام کے متشکل ہونے کے لئے بیشتر ضروری لوازم موجود ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا کہ اگر وفاقی نظام کے یہ لوازم پاکستان میں موجود رہے ہیں تو پھر یہ نظام اب تک قائم کیوں نہیں ہو سکا۔ ہماری دانست میں کسی بھی ملک کے وفاقی مسائل کو محض مرکز اور صوبوں کے سیاسی و آئینی روابط کے دائرے میں محدود کر کے نہ تو پرکھا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان کا کوئی حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔ مرکز اور صوبوں کے تعلقات مجموعی سیاسی نظام کا محض ایک جزو ہوتے ہیں۔ ان تعلقات اور ان میں درپیش مسائل کا حقیقت پسندانہ ادراک تب ہی ممکن ہے جب کہ مجموعی سیاسی نظام اور ریاستی دروبست کے بارے میں بنیادی امور کا احاطہ کر لیا جائے۔ ریاست کے اجزائے ترکیبی، اس میں مقتدر طبقات کے مفادات کی نوعیت اور دیگر متعلقہ امور ہی ریاست کے کردار کا تعین کرتے ہیں۔ مرکز اور صوبوں کے تعلقات پر ریاستی کردار کا براہِ راست اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ ان تعلقات کی تفہیم ریاست کے کردار کی تفہیم کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

تیسری دنیا کے بہت سے دوسرے ممالک کی طرح پاکستان کا ریاستی ڈھانچہ بھی بنیادی طور پر جدید نوآبادیاتی ریاست کا ڈھانچہ ہے۔[۳۶] یہ ایک ایسی ریاست ہے جو اپنے جوہر میں جمہور کے اقتدارِ اعلیٰ کے بجائے جدید نوآبادیاتی نظام کی حامل ہے۔ یہ ریاستی ڈھانچہ

۳۶۔ پاکستان میں ریاستی ڈھانچے کی نوعیت و کردار کے موضوع پر بہت کم علمی کام ہوا ہے۔ البتہ جو تھوڑا بہت مواد اس موضوع پر میسّر ہے۔ اس میں حمزہ علوی، حسن گردیزی، فیروز احمد، اعجاز احمد اور بعض دوسرے سکالروں کی تحقیقات قابلِ ذکر ہیں۔

آزادی سے قبل کے نوآبادیاتی نظام کا ورثہ ہے اور بدقسمتی سے ہم آزادی کے چالیس برس بعد بھی اس ورثہ سے گلوخلاصی حاصل نہیں کر سکے ہیں۔ ان چالیس برسوں میں اس ڈھانچے کے تضادات میں بجائے خود غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اور اہل پاکستان مسلسل بحرانوں میں مبتلا رہے ہیں مگر یہ بھی ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ہنوز حقیقی معنوں میں آزاد و خود مختار تشخص کے حصول میں ناکام رہے ہیں۔

پاکستان کا ریاستی ڈھانچہ مخصوص طبقات اور اداروں کے سیاسی و اقتصادی تفوق کی راہ ہموار کرتا اور انہیں کے اقتدار مسلسل کا محافظ ہے۔ اس ریاستی ڈھانچے کو متشکل کرنے والے عوامل کا کھوج لگانا زیادہ دشوار نہیں ہے۔ تحریک پاکستان کے غالب رجحانات کا ہم ابتدا ہی میں تفصیلی طور پر ذکر کر آئے ہیں۔ ان تفصیلات کی روشنی میں اس تاریخی حقیقت کے ادراک میں دشواری نہیں ہونی چاہیئے کہ گو مطالبۂ پاکستان کو برصغیر کے مسلم عوام کی غیر معمولی تائید حاصل تھی مگر مسلم لیگ کی قیادت میں ماسوائے قائداعظم اور چند ایک دوسرے قائدین کے، بیشتر حضرات وہ تھے جنہوں نے مسلم لیگ میں عین اس وقت شمولیت اختیار کی جب انہوں نے پاکستان کے تصور کو شرمندۂ تعبیر ہوتے دیکھ لیا۔ ان حضرات کی بڑی تعداد فیوڈل طبقے سے تعلق رکھتی تھی جو اپنی پیدائش اور نشوونما کے لئے انگریزی استعمار کا مرہونِ منت تھا۔ چنانچہ کون نہیں جانتا کہ وہ بڑے بڑے کلاہ دار جاگیردار جنہوں نے سنہ ۱۹۳۰ء کے عشرے اور سنہ ۱۹۴۰ء کے عشرے کے ابتدائی برسوں میں پنجاب میں قائداعظم اور مسلم لیگ کی مزاحمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا، سنہ ۱۹۴۶ء اور اس کے بعد کس طرح آناً فاناً مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہو گئے۔ سندھ، صوبہ سرحد اور ملک کے دیگر علاقوں کے بڑے چھوٹے زمینداروں کا کردار بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ قائداعظم کو خود بھی اپنے ان "برادرانِ یوسف" کے بارے میں کوئی حسنِ ظن نہیں تھا اور مسلم لیگ کے "کھوٹے سکوں" کے بارے میں ان کا بیان ریکارڈ پر محفوظ ہے۔ مگر تحریک پاکستان کے فیصلہ کن مرحلے میں خود قائداعظم ان "کھوٹے سکوں" کو برداشت کرنے پر مجبور رہے۔ بدقسمتی سے قیام پاکستان کے بعد قائداعظم زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہے اور ان کے بعد انہی عناصر کو اختیارات و اقتدار پر مکمل تصرف حاصل ہو گیا۔

فیوڈل طبقے کا سب سے بڑا حلیف افسر شاہی کا ادارہ ثابت ہوا۔ خود افسر شاہی کی تشکیل و تعمیر بھی استعماری دور میں خالص سامراجی مقاصد کے پیش نظر ہوئی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد افسر شاہی کی طاقت میں کہیں زیادہ اضافہ ہوا۔ یہاں تک کہ سرکاری افسر وزارتوں اور گورنر جنرل کے عہدے تک براجمان ہوئے۔

۱۹۵۰ء کے عشرے ہی میں جہاں ایک جانب دفاعی اور اقتصادی معاہدوں کے ذریعے ریاست کے عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ روابط مستحکم ہوئے وہیں اندرونی سطح پر فوج کو سیاست میں عمل دخل حاصل ہوا۔ اب یہ حقیقت بھی کوئی راز نہیں رہی ہے کہ پاکستان میں ۱۹۵۸ء کے مارشل لاء کو امریکہ کی تائید حاصل تھی۔

ان عوامل کے زیر اثر ملک میں جدید نو آبادیاتی طرز کی ایک ایسی ریاست وجود میں آئی جس میں سول اور فوجی بیوروکریسی کو داخلی امور میں ملک کی جمہوری قوتوں کے مقابلے میں کامل تفوق حاصل تھا۔ یوں پاکستان اپنے آغازِ سفر ہی سے ایک مخصوص ریاستی ڈھانچے کا حامل رہا ہے اور اسی ڈھانچے کے دائرے میں ملک کا سیاسی ارتقاء ہوا ہے۔

آزادی کے بعد سے اب تک ملک کی سیاسی تاریخ کے نصف سے زیادہ عرصے میں براہِ راست طور پر فوج کی حکومت رہی ہے جو یا تو مارشل لاء کی صورت میں تھی یا پھر فوجی افسران کے سویلین انداز میں متشکل ہونے کی صورت میں فوجی اقتدار کے علاوہ جمہوری طرز حکومت کے جو قلیل المیعاد تجربے ہمارے یہاں ہوئے وہ بھی سول اور ملٹری بیوروکریسی کے اثرات سے آزاد نہیں تھے۔ پاکستان کا یہ مخصوص ریاستی ورولیست بہت سے تضادات کا منبع ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ آج بھی ملک جن مختلف النوع مسائل سے دوچار ہے خواہ وہ جمہوریت کا مسئلہ ہو یا صوبائی و قومیتی خود مختاری کے مسائل، یہ سب تضادات بنیادی طور پر اسی ریاستی ڈھانچے سے مشتق ہیں۔ ان مسائل کو حل بھی اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب ملک میں ایک ایسے خالصتاً آزاد اور خود مختار ریاستی نظام کو قائم کیا جائے جس میں عوام کو مقتدر حیثیت حاصل ہو۔

سندھی، بلوچ، پختون فرنٹ کے پروگرام پر سب سے بڑا اعتراض یہی کیا جا سکتا ہے کہ یہ مذکورہ ریاستی ڈھانچے کی تبدیلی کو اپنا بنیادی ہدف قرار نہیں دیتا۔ بلکہ اس کا تمام تر زور ایک

صوبے کی عددی برتری کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اختلافات کو مختلف آئینی ذرائع سے حل کرنے پر صرف ہوا ہے۔ مگر ہمارے خیال میں مختلف صوبوں کی آبادی کا عدم تناسب بجائے خود کوئی بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ نہ ہی مختلف اداروں میں مختلف صوبوں کی بتناسب آبادی نمائندگی ریاست کے بنیادی نظام کو تبدیل کرنے کا ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔ یقیناً ملک کے تمام صوبوں کو فوج، سول سروس اور دیگر تمام شعبوں میں نمائندگی حاصل ہونی چاہیئے مگر صرف اس نمائندگی کے حصول سے ریاستی ڈھانچہ تبدیل نہیں ہو جائے گا۔

پاکستان کے ریاستی دروبست میں تبدیلی کے نقطۂ نظر سے بنیادی سماجی تبدیلی ناگزیر ہے۔ اس سماجی تبدیلی کا تقاضا ہے کہ اُن بالادست طبقات کے اقتدار و اختیار کو ہدف بنایا جائے جو ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ بد قسمتی سے فرنٹ کے پروگرام میں سماجی تبدیلی کے حوالے سے کوئی قابلِ ذکر لائحہ عمل فراہم نہیں کیا گیا۔ فرنٹ کے رہنما قومی مسئلے کی ایک مخصوص تعبیر پیش کرتے ہیں اور سماجی مسئلے کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دیتے۔ یہیں سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ ملک کے بنیادی مسئلے سے صرفِ نظر کر رہے ہیں بلکہ راہِ فرار اختیار کر رہے ہیں۔ اس احساس کو اس امر سے بھی تقویت حاصل ہوتی ہے کہ فرنٹ کے تینوں اہم رہنما یعنی ممتاز بھٹو، پیرزادہ اور عطاء اللہ مینگل اپنے صوبوں کے مراعات یافتہ طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے سردار مینگل تو مختلف ادوار میں سیاسی انتقام کا نشانہ بننے کے سبب نیز اپنی اصول پسندی (جس پر کبھی کبھی غیر ضروری سختی (rigidity) کا گمان بھی ہوتا ہے) کی وجہ سے سیاست میں اپنا ایک اعتبار (credibility) رکھتے ہیں۔ ان کے سیاسی کیریئر کے مجموعی رجحانات سے تو اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر ان رجحانات میں تضاد کی نشاندہی نسبتاً مشکل کام ہے۔ وہ میدانِ سیاست میں جس مزاج کے ساتھ داخل ہوئے تھے اب بھی وہی مزاج ان کی پہچان ہے۔ پھر بلوچستان میں ان کے قبیلے کے اندر اور باہر ان کے مداحوں کا بھی ایک اچھا خاصا حلقہ موجود ہے جو ان کو عزت و تکریم کی نظر سے دیکھتا ہے۔

سردار مینگل کے برعکس ممتاز بھٹو اور عبدالحفیظ پیرزادہ کے سیاسی کیریئر جن مراحل سے گزرے ہیں ان کے پیشِ نظر انہیں ابھی اپنے سیاسی اعتبار (credibility) کو منوانے کے

لئے خاصی محنت درکار ہے۔ ان کی سیاسی بیس بھی ابھی واضح نہیں ہے۔ وہ ایک عرصہ پیپلز پارٹی سے وابستہ رہے ہیں۔ اس حیثیت میں انہوں نے حکومت کے اعلیٰ مناصب پر بھی وقت گذارا ہے۔ وہ پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت کے بہت سے متنازعہ فیصلوں کی ذمہ داری سے بھی بری الذمہ قرار نہیں دیئے جاسکتے۔ اس حیثیت میں انہوں نے اپنے بہت سے مخالفین بھی پیدا کئے ہیں۔ پیپلز پارٹی سے نکلنے کے بعد ان کو اُس حمایت اور تائید سے بھی محروم ہونا پڑا ہے جو اس پارٹی سے وابستگی کے نتیجے میں انہیں پارٹی کے کارکنوں اور ہمدردوں میں میسر تھی۔ اس لحاظ سے انہوں نے اب نئی سیاسی بیس بنانے کا آغاز کیا ہے۔ اور یہ کام ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں ہے۔ یہ دونوں رہنما جس پروگرام کے ساتھ میدان میں اترے ہیں اس میں بنیادی اہمیت صوبوں کے درمیان عدم مطابقت اور ایک صوبے کی بقیہ تین صوبوں پر برتری کو دی گئی ہے۔ فرنٹ کا پروگرام بھی اسی برتری کے خاتمے کی تجاویز پر مشتمل ہے۔ مگر جیسا کہ کہا گیا کہ پاکستان کے جملہ سیاسی مسائل پنجاب کے عددی تفوق کا نتیجہ نہیں ہیں۔

فرنٹ کے رہنماؤں نے جن مسائل کی نشاندہی کی ہے ان کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ مگر ان مسائل کو جس دائرے میں حل کرنے کی تجویز یہ رہنما پیش کر رہے ہیں وہ بجائے خود محدود ہے۔

پاکستان میں حقیقی جمہوری اور وفاقی نظام کا قیام تب ہی ممکن ہے جب ملک کے مجموعی ریاستی ڈھانچے میں انقلابی تبدیلیاں کی جائیں۔ صرف صوبائی خود مختاری یا قومیتوں کی خود مختاری کا مطالبہ یا ملک گیر اداروں میں سب صوبوں کی مساوی نمائندگی کی تجویز اگر شرفِ قبولیت حاصل کرلے تب بھی اس کے فوائد محدود اور صوبوں کے مراعات یافتہ طبقوں میں مرتکز رہیں گے۔ مزید برآں اس سے ملک کے ریاستی خدوخال اور کردار میں کوئی جوہری تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔

ہمارے گزشتہ مجموعوں کے موضوعات

پاکستان کے مزدور طبقے کی تاریخ

ریاست اور طبقات

زرعی اصلاحات - ایک جائزہ

صوبہ سرحد کا سماجی ڈھانچہ

عالمی اجارہ داریاں اور پاکستان

پاکستان کا نظام صحت

جدید پنجابی ادب - ایک تاریخی جائزہ

عالمی مزدور تحریک

سندھ ہاری کمیٹی

پاکستان میں مزدور قوانین

پڙهندڙ نَسُل . پَ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾ عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻِڪَ ”لُڙهندڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، ڇُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندڙُ، ياڙي، ڪاٺُو، ياجوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سڀني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعني e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻَڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پڙهندڙ نَسل (پَنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهڙي دعويٰ ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہِ ڪُوڙو آهي.

جَهڙيءَ طَرَح وڻن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَنَ بہ مختَلِف آهن ۽ هوندا. اُهي ساڳِئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، بَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. ٻين لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصيِ ۽ تالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.

ڪوشش اها هوندي تہ پَنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِين. اهڙي حالت ۾ پَنَ پاڻ هِڪَٻِئي جي مدد ڪَرڻ جي اُصولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رهندا. پَنَن پاران ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.

ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ پلي ڪمائي، رُڳو پَنَن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَنَن کي ڪُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڏِ
کان وَڏِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکڪَن، ڇپائيندڙن ۽
ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳِئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ
کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽَ کي نہ مڃن.

شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ،
پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ
جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:

گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.

... ...

جئن جئن ڄاڙ وڏي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛
ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛

... ...

ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن؛
گيتَ بہِ جڻ گوريلا آهن........

... ...

هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،
جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!

مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،
جنهن رِڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ ـ

اِن حسابَ سان اٽڄاٽائي ڪي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ
”هاٽي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ
وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَڙَهن جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر کڄي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اٽڪاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَڙَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بڻائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پڙهندڙ نَسُل جا پَڙَ سيني کي **چو، ڇالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوٺَ ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽر گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا. بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها ڳوڙها تيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ڀاڪي پائي چيو تہ ”منهنجا ڀاءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)

پڙهندڙ نَسُل . پَ نَ The Reading Generation